عقل پرستی

اور

اِنکارِ معجزات

حافظ عنایت اللہ اثری گجراتی کے افکار تحریفات و تاویلات کا تقابل

مؤلف

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ

ناشر

مکتبہ السلام وسن پورہ لاہور

نام کتاب — عقل پرستی اور انکار معجزات

طبع — دوم جنوری 1998

کاتب — شریف اختر قادر آباد روڈ چھالیہ

ناشر — عتیق الرحمٰن و حافظ شفیق الرحمٰن کیلانی

ملنے کیلئے — مکتبہ السلام وسن پورہ لاہور

گھر جاکھی کتب خانہ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون : 042-7223644

جامع مسجد الرحمٰن بسم اللہ چوک شاہ فرید آباد ملتان روڈ لاہور فون 042-5410756

قیمت — =/150

سرپرستی — ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی

انتخاب جدید پریس 8 - ایبٹ روڈ لاہور PH: 6314365

مُقدّمہ

زیرِ نظر کتاب "عقل پرستی اور انکار معجزات" مدت سے ختم تھی۔

قارئین کیطرف سے شدید مطالبے پر اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے کیونکہ منکرینِ حدیث اور نیچرل ازم کے دعویداروں کے باطل عقائد کا بہت اچھی طرح تردید کرتی ہے۔ والد محترم رحمۃ اللہ علیہ اپنے آخری ایام میں اس کو طبع کرانے والے تھے۔ مگر کاتب تقدیر ان پر بازی لے گیا۔ اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے کہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ انکی مطبوعات کو انکے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

برادران کی طرف سے اس کتاب کو چھپوانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے اس میں اگر کوئی غلطی کوتاہی ہو تو مجھے معاف کردیں امُید ہے کہ پہلے سے بہتر ہو گی اور زیادہ پسند کی جائے گی۔

والسلام

نجیبُ الرّحمٰن کیلانی

مکتبۃ السّلام وسن پورہ

-لاہور-

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ
فہرست مضامین	3
پیش لفظ از عزیز زبیدی صاحب	14
تقدیم از مولانا محمد مدنی صاحب	16
حصۂ اول باب اول	18
حافظ عنایت اللہ اثری اور انکی تالیفات	19
عیون زمزم کا تعارف	//
موضوع کتاب	20
تسبیح، تحمید، سلام وصلوٰۃ کا اصل مفہوم	21
موضوع میں وسعت اور اس کا جواز	//
موضوع میں مزید وسعت	22
عصمت انبیاء کا مطلب	24
معجزہ یا اتہام	26
نیچر کے منکر	//
مصنف کا مسلک	27
دوسرا رُخ	//
آپ کی تصانیف پر علماء کے تبصرے	29
علم اور ہدایت	31
ہدایت اور اس کے مدارج	32
کتاب کے محاسن و مؤلف کی خودپسندی	3533
باب دوم	37
خرقِ عادت امور کے مختلف پہلو	//
معجزہ سے انکار کی وجہ	//
معجزہ اور جادو میں فرق	//
معجزہ کے لیے لغتِ قرآنی	40
معجزہ کا تعیّن	41
(۱) کفار کا اعتراض اور تکرار	42
(۲) آیت کی ابتداء	//
(۳) آیت کا خاتمہ	//
(۴) الفاظ کی وضاحت	43
خرقِ عادت امور عقل کی روشنی میں	44
خرقِ عادت امور کی اقسام	//
سرسید اور معجزات	45
منکرین معجزات کی دلیل اور اس کا جائزہ	46
قوانین فطرت میں مستثنیات	47
قدرت الٰہی کے دلائل	48
کیا اللہ اپنے قانون کے سامنے مجبور محض ہے؟	49
باب سوم	51
خرقِ عادت امور سے انکار کا پس منظر	//
ہستی باری تعالیٰ کے متعلق ارسطو کے نظریات	//
جہمیہ	52
معتزلین اور ان کے عقائد	53
۱۔ عقل کی برتری اور تفوق	54
۲۔ صفات باری تعالیٰ	//
۳۔ مسئلہ جبر وقدر	//
معتزلین کا عروج و زوال	55
دوسرا دور اور سرسید احمد خاں	56

مضامین	صفحہ
آپ کے مخصوص نظریات وعقائد	57
جدید علم کلام کی ضرورت اور خصوصیات	58
احادیث تفاسیر اور فقہ سب ناقابل حجت ہیں	//
تفسیر قرآن اور نیچر و فلسفہ	59
سرسید پر جمہور علمائے اُمت کا فتویٰ کفر	//
طلوعِ اسلام	60
پرویز صاحب پر جمہور علمائے اُمت کا فتویٰ کفر	//
حافظ عنایت اللہ صاحب اثری	61
ذہنی تبدیلی کا سبب	//
ندائے غیب اور مجدد زماں	62
حصۂ دوم	64
باب چہارم ۔ ولادت عیسیٰ اور قرآن کریم	65
تالیف عیون زمزم	//
عیون زمزم کی ترتیب وتدوین	66
سورۂ مریم کی متعلقہ آیات	67
آیت ۱۶ معہ اثری تفسیر	//
اہل بمعنی شوہر یا شوہر کا گھر	//
نکاحِ مریم	68
نکاح کا ثبوت	//
سسرال یا گوشہ نشینی؟	69
آیت ۱۷ مع اثری تفسیر	//
حضرت مریم کی شوہر سے ان بن	//
فارسلنا الیہا رُوحنا کی تاویلات	//
رُوح اور ملائکہ کی مختلف تعبیریں	70
شوہر صاحب کی تندرستی	71
رُوح سے مراد شوہر مریم	//
شوہر مریم کے فرشتہ ہونے کی وجہ	72
قاضی بیضاوی اور اثری	//
تصویر کا دوسرا رُخ	74
آیت ۱۸ مع اثری تفسیر	//
شوہر کی اجنبیت	75
مطالبۂ طلاق	//
رُوحنا کے دو مختلف مطالب	76
حضرت مریم کے نکاح کا اثری ثبوت	//
آیت ۱۹ مع اثری تفسیر	//
اثری لُغت	//
ربط قصہ	77
آیت ۲۰ مع اثری تفسیر	//
اثری لُغت	//
شوہر مریم کی خصوصیات	//
لفظ بشر کا بھید	78
آیت ۲۱ مع اثری تفسیر	79
آیۃ للناس کی تاویل	//
لنجعلہ آیۃ للناس	80
آیت سے مراد نکاح مریم ہے	//
لفظ آیت کی ایک نئی توجیہ۔ بڑا گھرانہ	81
آیت ۲۲ مع اثری تفسیر	82
مریم کی شوہر کے ساتھ روانگی	//

مضامین	صفحہ
حضرت مریم کا موت کی آرزو کا اصل سبب	83
شوہر مریم کی گمشدگی	//
آیت ۲۴، ۲۵، ۲۶ مع اثری ترجمہ	84
ندائے غیب	85
کھجور کے تنڈ سے تازہ کھجوروں کا گرنا	//
چشمہ کا اجراء	86
اثری صاحب کی منظر کشی	//
ربوہ کا منظر	87
قری عینا (آنکھوں کی ٹھنڈک) سے کا ثبوت	//
خدا کی قدرت کا تمسخر	//
فلن اکلم الیوم انسیا پر اعتراض	88
آیت ۲۷، ۲۸ مع اثری تفسیر	89
فاتت بہ قومہا تحملہ	90
ایک نئی افتاد	//
تکلم فی المہد کا اثری مفہوم	91
شیئا فریا کا نیا مطلب	//
امرا سوء اور بغیا کے معنی عہد شکن؟	92
شوہر مریم کی بے وفائی	93
آیت ۲۹ مع اثری تفسیر	94
فاشارت الیہ کا مشار الیہ کون؟	//
حضرت زکریا کی خاموشی	//
اصل مشکل	95
قرآن کی عبارت کی اصلاح	//

مضامین	صفحہ
تکلم فی المہد کے مختلف مطالب	//
آیت ۳۰ مع اثری تفسیر	96
یہودیوں کے اعتراضات کا جواب کس نے دیا؟	97
تلاعب بالقرآن	//
آیت ۳۱، ۳۲ مع اثری تفسیر	//
شوہر مریم کی وفات کب ہوئی؟	98
اثری صاحب اور انجیل کے اختلافات	99
باب ۵: سورۂ آل عمران کی متعلقہ آیات	101
آیت ۴۵، ۴۶، ۴۷ مع اثری تفسیر	//
ندائے غیب اور بشرا سویا	//
حضرت مریم کے سامنے فرشتہ کا انسانی شکل اختیار کرنا	102
کلمۃ اللہ کا اثری مفہوم	//
کنیت اور نسب کا فرق	103
ابن مریم نسب ہے یا کنیت؟	104
سلسلہ نسب ماں کی طرف سے کیوں؟	105
روایت اور اس کا معنی بیان کرنے میں اثری صاحب کی دیانت	106
ماں کی طرف نسبت کی اثری وجوہ	//
پہلی وجہ غیر اسرائیلی باپ	//
دوسری وجہ بلندئ شان	//
ابن یوسف کیوں نہیں؟	108
اثری دلیل کی کمزوریاں	//
قرآن کے مقابلہ میں اناجیل کو ترجیح	109

مضامین	صفحہ
وجیہ کا مفہوم	״
وجیہا کا اثری مفہوم	110
اثری دلیل کی کمزوریاں	111
تکلم فی المھد	112
یفعل اور یخلق کا مطلب ایک ہے	״
فعل اور خلق کا لغوی فرق	״
خلق عیسیٰؑ	113
آلِ عمران کی آیات نمبر ۵۹، ۶۱	״
مثلِ آدم	114
دُرِ منثور کی روایات مع ترجمہ	115
عیسوی دلائل (مناظرہ میں)	116
مماثلت اور وجہ مماثلت	117
اثری وجوہ مماثلت	״
پہلی وجہ 'عدم خدائی'	118
دوسری وجہ ترابی ہونا	״
تیسری وجہ ندرت	119
عیسائی مناظرہ اور رسول اللہؐ پر اتہامات	120
پہلا تا پانچواں اتہام	121
اثری صاحب کی ہٹ دھرمی	122
چھٹا اتہام۔ نبوی گرامی نامہ	123
سورۂ انبیاء اور سورۂ تحریم	124
احصانِ فرج اور نفخ روح	״
اثری صاحب کی چالاکی	125
احصانِ فرج کا معنی صرف شادی	126
امیر معاویہ پر بہتان طرازی	״
نفخِ روح اور اصل بحث سے گریز	״
حدیث نفخ روح سے فرار کی راہیں	127
باب ۶: ولادت عیسیٰؑ اور حدیث و آثار	129
احصان فرج کا معنی شادی ہی ہے اس کی دلیل	״
اصل اعتراض	״
قرآن کا طرزِ بیان	130
رسول اللہ کا بیان	״
احادیث سے عیسیٰؑ کی بے پدری کے ثبوت	131
حدیث ۱ متعلقہ بے پدری پیدائش	״
حدیث سے اعراض	132
حدیث پر تنقید	״
حدیث ۲	133
حضرت سلمان فارسیؓ پر اعتراض	134
حدیث ۳	״
حدیث ۴، ۵	135
صحابہ کرام اور ولادت عیسیٰؑ	137
حضرت عبداللہ بن عباس	״
حضرت عمرؓ	״
دیگر صحابہ کرامؓ	138
اثری صاحب کا اعترافِ حقیقت	140
عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش پر اجماعِ امت	״
عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش کے منکرین	״
اثری صاحب کی تضاد بیانی	141

مضامین	صفحہ
اجماع اور اس کی حقیقت	142
ایک متفق علیہ اور مرفوع حدیث اور اثری صاحب	143
تکلم فی المہد کی تحریف کی بدترین مثال	//
اصل بحث سے فرار	146
حضرت مریم کے فضائل قرآن و حدیث کی روشنی میں	149
۱۔ طہارت اور برگزیدگی	//
۲۔ جنت میں رسول اللہ سے نکاح	150
۳۔ عذرا اور بتول	152
۴۔ استعاذہ والدہ مریم	154
حضرت مریم کے فضائل اثری صاحب کی نظر میں	156
باب۳، حضرت مریم کے نکاح یا شوہر اور حضرت عیسٰیؑ کے باپ ہونے کے اثری دلائل۔	157
ا۔ بے کار دلائل	//
ب۔ "صاف ظاہر ہے" قسم کے دلائل	159
۱۔ لفظ مس بشر سے نکاح کا ثبوت	//
۲۔ " حمل " " "	160
۳۔ وجیہ سے حضرت عیسٰی کے باپ کا ثبوت	162
۴۔ منک عوذ بالرحمٰن سے طلاق اور نکاح دونوں کا ثبوت	//
۵۔ نبیوں کا اعلیٰ النسب ہونا	//
۶۔ خرق عادت امور سے منطقی طور پر حضرت عیسٰی کے باپ کا ثبوت	//
۷۔ مریم کے صدیقہ ہونے سے نکاح کا ثبوت	163
۸۔ علاتی اور اخیافی بھائی	//
۹۔ انداز بیان سے عیسٰی کے باپ کا ثبوت	164
۱۰۔ کمثل کے لفظ سے باپ کا ثبوت	165
۱۱۔ لفظ قری عینا سے باپ کا ثبوت	166
۱۲۔ لفظ طہارت سے باپ کا ثبوت	//
۱۳۔ کنیت سے باپ کا ثبوت	//
۱۴۔ لفظ ذریۃ سے نکاح کا ثبوت	//
۱۵۔ لقیط بچہ سے نکاح کا ثبوت	167
ج۔ ہیرا پھیری یا چکر بازی کی قسم کے دلائل	168
تتمہ۔ اثری صاحب سے چند سوالات	170
حصہ سوم	171
خرق عادت امور اور معجزات انبیاء	//
چند دلچسپ تاویلات	172
۱۔ فرشتے اور اُن کے پر	//
۲۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ	173
باب۴: (۱) حضرت آدمؑ	176
تخلیق آدمؑ	//
سرسید کا نظریہ	//
سرسید کے نظریہ کا جائزہ	//
اثری صاحب اور تخلیق آدم	179
تخلیق آدم کے متعلق حدیث	181
اپنے نظریہ کی خود تردید	182
(۲)۔ حضرت حوا کی پیدائش	183
پسلی سے پیدائش کا انکار	//

مضامین	صفحہ
اثری صاحب کے دلائل	184
اثری صاحب کے انکار کی توجیہہ	185
(۳) قصہ ہابیل وقابیل	186
حقیقی بہن بھائیوں کی شادی	//
قربانی اور آگ	188
قربانی یا صدقہ وخیرات؟	//
قتل کی وجہ	//
مقتول کی لاش	189
زمانہ قتل	190
اثری صاحب کے قصہ موضوعہ پر اعتراضات	192
سوءۃ بمعنی لاش؟	193
(۲) حضرت صالح علیہ السلام	195
ناقۃ اللہ کی دلچسپ تفسیر	196
ناقۃ اللہ کے معجزہ ہونے کی دلیل	197
صحیح بخاری کی احادیث	//
گوندھا ہوا آٹا ضائع کرنے کی تحریف معنوی	//
(۳) حضرت لوط علیہ السلام	199
الٹی ہوئی بستیوں پر پتھروں کی بارش کی نئی تاویل	//
لغوی تحقیق کا جائزہ	200
کچا گارا	201
مروجہ تفسیر پر اعتراضات	202
باب ۹: حضرت ابراہیم علیہ السلام	204
۱۔ احیائے موتی اور چار پرندے	//
احیائے موتی کی تاویل اور اس کا جائزہ	205
۲۔ آگ کا ٹھنڈا ہونا	206
معجزہ کی تاویل اور اس کا جائزہ	207
۳۔ ذبح عظیم	208
شرعی احکام کی اقسام	//
آیات متعلقہ ذبح عظیم	210
اثری صاحب کی لغوی اور معنوی تحریف	211
لفظ بلاء کی لغوی تحقیق	212
۴ اثری صاحب کا اللہ تعالیٰ، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سب پر اتہام	213
ذبح کوئی بھی نہیں	214
۵۔ حضرت یوسفؑ اور چند دلچسپ تاویلات	215
ستاروں کا حضرت یوسف کو سجدہ	//
خواب یوسفؑ کی اثری تعبیر	//
سجدہ تعظیمی	216
۲۔ غلہ کی قیمت کی واپسی	217
۳۔ راشننگ سسٹم اور بنیامین کا زائد کارڈ	218
تاکید کی وجہ	219
۴۔ اجرت باربرداری	220
لفظ بضاعۃ کی لغوی تحقیق	//
۵۔ یوسف کی بھائی کو پاس رکھنے کی تدبیر	222
اس تدبیر کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیوں کیا!	224
۶۔ سقایہ اور صواع کی بحث	//
پیالہ کی گمشدگی کی وجہ	225

مضامین	صفحہ
مصری عدالتیں	227
۷. یعقوبؑ کی آنکھوں کا بے نور اور بعد میں روشن ہونا	228
باب ۱۰: حضرت موسیٰ علیہ السلام	230
۱. مچھلی کا دریا میں راستہ بنانا۔	″
۲. مُردہ مچھلی کا زندہ ہونا۔	231
تاویلات اثری	232
مچھلی کا سُرنگ بنانا	233
۳. حضرت خضر کی شخصیت	″
۴. عصائے موسیٰؑ اور یدِ بیضا	236
۵. دریا کا پھٹنا	238
۶. بارہ چشموں کا پھوٹنا	″
عجل سامری	239
۷. حضرت یُونس علیہ السلام	241
یُونسؑ اور خرقِ عادت امور	″
قصۂ یُونس کی اثری ترتیب	242
تنقیدی مباحث	″
"یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں" ایک حدیث اور اس کی اثری تاویل	246
انبیاء کی حضرت یونسؑ پر تفضیل	248
۸. حضرت داؤد علیہ السلام	249
تسخیر تسبیح جبال و طیور	″
۹. حضرت سلیمان علیہ السلام	251
۱. بے مثال بادشاہی	″
اثری صاحب کے دل کی گھٹن	252
ہوا کی تسخیر	253
جنات پر غلبہ	″
سلیمانی عہد	″
۲. منطق الطیر اور اثری صاحب کی طنز	254
منطق الطیر کے مختلف مطالب	″
۳. منطق الطیر اور وادیٔ	256
اثری تاویل	257
۴. ہُدہُد کی پیغام رسانی اور ملکۂ سبا	259
ہُدہُد کون؟ پرندہ یا انسان یا طیارہ؟	260
۵. ملکہ سبا کا تخت	261
ٹھیکیدار اور ان کے ٹینڈر	262
عرشہا کی مختلف تاویلات	263
۶. شاہی محل اور لُجّہ کی لغوی تحقیق	265
پنڈلیاں ملکہ کی یا محل کی	266
۷. سلیمانی دور میں جمہوریت کے دھندے	267
۸. حضرت سلیمان کی وفات کے بعد کے انتخابات	270
۹. جنّ کی غیب دانی	272
باب ۱۱: حضرت ایوب علیہ السلام	274
قصۂ ایوب پر اثری اعتراضات	″
قصۂ ایوب کی نئی اثری ترتیب	″
ارکض برجلک کے مختلف مطالب	275
حضرت ایوب کی بیوی	278
سونے کی ٹڈیوں کی بارش	279
تاویلات کا دھندا	″

مضامین	صفحہ
حضرت ایوب کی ناکامی کا اصل سبب	281
۱۹۔ حضرت زکریا علیہ السلام	282
۱۔ کفالت مریم	"
۲۔ حضرت مریم اور بے موسم پھل	283
۲۰۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام	285
۱۔ پرندوں کی شکل اور نفخ	"
۲۔ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کرنا	287
۳۔ مُردوں کو زندہ کرنا	288
عیسیٰ کے پیٹنٹ طبی نسخے	289
۴۔ احیائے موتیٰ کے مختلف مطالب	"
۵۔ گھروں میں چھوڑا ہوا مال	290
۶۔ نزول مائدہ کی اثری تعبیر	291
اصحاب کہف	293
اصحاب کہف اور پانچ بے سروپا باتیں	"
(۱) غار میں سالہا سال تک سوتے رہنا۔	"
اثری تاویلات	294
امام بخاری کی مخالفت	295
(۲) اصحاب کہف کا سالہا سال بعد اٹھ کر کھانا کھانا	296
(۳، ۴) سوتے میں کروٹ بدلنا	297
اصحاب کہف کی معجزانہ زندگی	"
اثری صاحب کا من گھڑت قصہ اصحاب کہف	298
اس قصہ موضوعہ پر اعتراضات	299
رسول اللہ کے لیے پروگرام	301

مضامین	صفحہ
۲۱۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	302
۱۔ صغرسنی کا نکاح اور حضرت عائشہ	"
اثری صاحب کا موقف	304
۲۔ نبی اُمّی	"
۳۔ بلغمی تھوک اور تطہیر و تزکیہ	306
رسول اللہ کا تھوک	307
اثری صاحب کا تھوک کے معجزہ سے صاف انکار	308
عروہ بن مسعود ثقفی	309
۴۔ رسول اللہ پہ جادو کا اثر اعتراضات	"
اثری صاحب کی تاویل	311
باب ۱۲: خصوصیات کلام	312
۱۔ یہ بھی ـ اور ـ وہ بھی	"
۱۔ تخلیق آدم	"
تخلیق آدم کے متعلق حدیث کا جواب	314
۲۔ تکلم فی المھد	"
۳۔ صغرسنی کا نکاح اور حضرت عائشہ	315
۴۔ نبی اُمّی	"
۲۔ دقیق اور اُلجھے ہوئے جوابات	316
۱۔ حضرت ابراہیم اور آگ	"
۲۔ ذبح عظیم	317
۳۔ ستاروں کا سجدہ	"
۴۔ یونس مچھلی کے پیٹ میں	318

مضامین	صفحہ
۵۔ گہوارے میں کلام	″
۶۔ مثیل آدم	319
۷۔ تخلیق آدم	″
۳۔ تاریخ وجغرافیہ سے لاعلمی	320
۱۔ کچا گارا	″
۲۔ راشن ڈپو اور راشن کارڈ	″
۳۔ مصر کی عدالتیں	321
۴۔ حضرت سلیمان اور ہوائی اڈے	″
۵۔ عہد سلیمانی میں جمہوریت کی بہاریں	322
۴۔ اصل بحث سے گریز	323
۱۔ قربانی سے صدقہ وخیرات	″
۲۔ نفخ روح سے شوہر تک	″
۳۔ مثیل آدم	324
۴۔ آیت للناس اور بڑا گھرانہ	″
معروف معنوں سے گریز	325
قصہ یونس علیہ السلام	″
قصہ ہابیل وقابیل کا	326
قرآن کے ربط کو اوجھل کرنا	327
یوسفؑ کے خواب کی عملی تعبیر	328
قرآن کی ترتیب ذکری میں تقدیم تاخیر	″
آیت کا کچھ حصہ چھوڑ دینا	329
بے لگام ترجمہ یا حاصل مطلب یا ٹھیک مطلب	330
قرآن وحدیث کے مقابلے میں انجیل کو حجت سمجھنا	333
بنائے فاسد علی الفاسد	335
قصہ یوسف اور صواع کا مفہوم	″
حضرت زکریا اور اعتکاف	336
دوسرے انبیاء کرام کی حضرت یونس پر فضیلت	337
حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش	″
رسول اللہ کے لیے پروگرام	″
حضرت یونس کی داستان زندگی	338
حضرت ایوبؑ کی داستان	339
حضرت کہف کی داستان زندگی	340
کتابیات	342

دُنیا میں جتنے اور جیسے کچھ مظلوم رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مظلوم وہ صحف سماوی (آسمانی کتابیں) اور انبیاء علیہم السلام کی سیرت طیبہ کے وُہ نقوش حیات ہیں جو ان کی اُمتوں کے ہاتھوں میں پہنچتے رہے ہیں۔ ان صحف سماوی یا نقوش حیات پر جو ستم ڈھائے گئے، بالعموم ان کے تین ہی مرکز رہے ہیں، سیاسی، عقلی اور تقلیدی۔

پھر ان ظالموں نے اپنے اپنے مفروضات کے لیئے جو سہارے تلاش کیئے، بالجملہ ان کی تفصیل یُوں رہی ہے:۔

(۱)۔ وُہ قصّے کہانیاں جن کی حیثیت افواہوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

(۲)۔ وُہ مفروضات جو علم و مطالعہ کے سفر میں ان کے سامنے آئے اور ان کی حیثیت مفروضہ، خیالی یا فریب مطالعہ کی ہوتی ہے جو بالآخر اثنائے سفر میں ہی دم توڑ دیتے ہیں۔

(۳) یا پھر وُہ حسن ظن ہوتا ہے جس کے ترکش حیات میں دلائل کے تیروں کی کمی ہوتی ہے، جن کے بغیر طائرِ مقصُود کا شکار ممکن نہیں رہتا۔

ان تینوں مراکز کا طریق کار الگ الگ اور کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:۔

سیاسی مرکز: اہل سیاست ہمیشہ اپنے اپنے دَور میں کتاب و سُنّت کو اپنا حریف تصوّر کرتے آئے ہیں۔ اسلیئے سیاسیین سوء ہمیشہ اس تُوہ میں رہے ہیں کہ کسی طرح ان سے پیچھا چھڑایا جائے۔ جس کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ علماءِ سوء پیدا کر کے اپنے راستہ سے یہ بھاری پتھر ہٹائے اور خوشامدی ٹوڈیوں کی کمک پہنچا کر اپنے دَور کے جمہور کو رام کرنے کے لیئے دجل، لالچ، دھونس، دھاندلی اور دھن کے جال پھیلائے اور اس طرح وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب رہے۔

عقلی مرکز: جو سیاسیین سوء کے جال سے بچ نکلے وہ اپنی عقل خام کے دام فریب کے نذر ہو رہے گو اس قسم کے شیخ چلی گنتی کے ہی رہے ہیں تاہم شکوک و شبہات کو جنم دے کر ملّت اسلامیہ میں بے اطمینانی اور بے چینی پیدا کر کے فکری فضاؤں کو متزلزل کیئے رکھا۔ اس وادیٔ خارزار میں زیادہ تر جذباتی قسم کے لوگوں نے قدم رکھا یا پھر ایسے حضرات ان کی طرف لپکے جو غیر شعوری طور پر اس واہمہ میں مبتلا رہے ہیں کہ خدا کو بس ان سے پُوچھ پُوچھ کر چلنا چاہیئے تھا۔ لہٰذا جو بات ان کو اپنی عقل

خام کی کسوٹی سے باہر نظر آئی یا تو اس سے انکار کر دیا یا تاویلات کے ذریعہ ایسی باتوں کے مضامین کو شکار کرنے میں اپنی زندگی گزار دی۔

تقلیدی مرکز: تقلید آباء اور تقلید علماء نے ان کے مقلدین کو مجبور کیا کہ وہ کتاب و سنت کا مطالعہ اپنے پیشروؤں کی عینکیں لگا کر کیا کریں۔ پھر جہاں کہیں ڈھنڈلکے دکھائی دینے لگیں وہاں اپنی عینک کو بدلنے کی بجائے کتاب و سنت کے فطری مضامین کو بدلتے رہیں ۔ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں!

قدر مشترک: ان تینوں گروپوں میں دو باتیں بطور قدر مشترک رہی ہیں۔ (۱) الفاظ کے لغوی سہارے اور (۲) وہ تاریخی حوالے جو عموماً افواہوں نے تخلیق کیئے ہیں۔ دور حاضر کے متجددین اور منکرین بھی تقریباً انہی ہتھیاروں سے کام لے رہے ہیں۔ ان دونوں سے اگر یہ سہارے چھین لیئے جائیں تو ان کی بےبسی دیدنی ہوگی۔ لغوی معانی کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم، لیکن روحانی اصطلاحات کے سامنے یہ بےبس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ بھی گو فی الواقعہ قابل توجہ چیز ہے لیکن اس کے ذریعے کتاب و سنت کی صداقتوں اور حقائق کا شکار کرنا عقلاً اور شرعاً دونوں لحاظ سے مناسب نہیں۔

تالیف کتاب ہذا: ہمارے فاضل دوست اور معروف اہل قلم مولانا عبدالرحمن کیلانی نے متذکرہ بالا نادان دوستوں اور کتاب و سنت سے ان بےخبروں کی خوب خبر لی ہے اور ان جھوٹے سہاروں کو ایک ایک کر کے مسمار کیا ہے۔ پھر اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین۔ مولانا کا انداز نہایت علمی، فاضلانہ اور دلائل کے لحاظ سے انتہائی قاہرانہ ہے۔ جس کے لیئے ہم موصوف کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ گو تنقید کا رخ معدودے چند افراد کی طرف اور بالخصوص حافظ عنایت اللہ صاحب اثری گجراتی کی طرف نظر آتا ہے لیکن چونکہ اصولی ہے۔ اس لیئے اپنی جامعیت کے لحاظ سے تمام منکرین اور متجددین کی ساری خوش فہمیوں، مغالطوں، وسوسوں اور ذہنی عیاشیوں کا مسکت جواب ہے۔

کیا ہی بہتر ہو کہ مؤلف موصوف منکرین کے اعتراضات اور ان کے جوابات کے اصولی پہلوؤں کا خلاصہ ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں لگا دیں تاکہ قارئین کو سمجھنے اور احاطہ کرنے میں آسانی رہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

عزیز زبیدی

دار برٹن ۔ ضلع شیخوپورہ

۶/۸/۸۴

تقدیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ، والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ، اما بعد:

رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار، ومن قال فی القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار"

"مجھ سے حدیث بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرو، ہاں جو تمہیں علم ہو وہی بیان کرو، جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا پس وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے اور جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کی پس وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔" (ترمذی ص ۱۱۹ ج ۲) — نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار"

"جس نے قرآن پاک میں بغیر علم کے کہا پس وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے"

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد"

"جس نے ہمارے اس کام (دینی) میں نئی بات پیدا کی جو اس میں نہ تھی پس وہ مردود ہے"

یہ بات تو واضح ہے کہ دین صرف قرآن وحدیث کا نام ہے اور اس کی صحیح صورت صحابہ کرامؓ کا عمل ہے جبکہ قرآن پاک نے فرمایا ہے:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"

"آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر لیا، تم پر نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام دین پسند کر لیا"

اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما: کتاب اللہ وسنتی"

"میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم انہیں مضبوطی سے

پکڑے رکھو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، اللہ کی کتاب، اور میری سنت ۔

اب اگر ہم حافظ عنایت اللہ گجراتی کے ان خیالات کا جائزہ لیتے ہیں جو انہوں نے اپنی مختلف کتب میں ظاہر کیے ہیں تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان خیالات کا وجود نہ تو قرآن میں ہے نہ حدیث میں، نہ صحابہ کرامؓ کے اقوال میں، نہ فقہاء کی فقہ میں اور نہ محدثین ہی کی آراء میں۔ بلکہ پوری تاریخ اسلام اس قسم کے آراء اور قیاس سے خالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ان کے یا چند جدت پسند لوگوں کے اپنے خود ساختہ خیالات ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان خیالات سے قرآن کی توہین ہوئی ہے اور قرآن و حدیث کا مذاق اڑایا گیا ہے قرآن پاک کی تحریف کو تفسیر کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت کے انکار، انبیاء کی عصمت قرار دیا ہے بلکہ نیک اور صلحاء لوگوں پر تہمت لگا کر اسے ان کی پاکیزگی قرار دیا ہے۔

ام المؤمنین حضرت مریم صدیقہ طاہرہ جن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت میں میری بیوی ہو گی۔ نام نہاد یوسف نجار نامی شخص سے نکاح کا تصور دے کر قرآن و حدیث، اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المؤمنین کی توہین کی گئی ہے۔ اس قسم کے غلیظ عقیدہ رکھنے والے شخص کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کا احترام کرنا اسلام کو ڈھانے کے مترادف ہے۔ جیسے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام جس نے بدعتی کی عزت کی اس نے اسلام کے گرانے میں مدد کی خواہ وہ جتنا بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا اظہار کرے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کا شدید دشمن ہے۔ اس کے خلاف ہر صورت میں جہاد کرنا ضروری ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے اس سلسلہ میں ان کا خوب احسن طریقے سے تجزیہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس جدوجہد کو قبول فرمائے اور سادہ لوح جو اس گندے اور غلیظ عقیدے میں پھنسے ہیں اس کتاب کو ان کے لیے راہ ہدایت بنا دے۔

آخر میں ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ ایسے غلط عقائد کی تردید ہمیشہ کرتے رہیں گے معجزات برحق ہیں اور قرآن و حدیث، صحابہ کرام، محدثین عظام اپنی اپنی آراء اور اقوال میں اس کے قائل ہیں۔ معجزات کا منکر یا ان کی اپنی عقل سے غلط ملط تاویل کرنے والا شخص نہ تو اہل حدیث ہے نہ مسلمان ——
اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و سنت کی روشنی میں صحیح عقائد اور درست اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد مدنی ۔ ناظم جامعۃ العلوم الاثریہ جہلم — ۱۰/۱/۸۷ء

① حافظ عنایت اللہ اثریؒ اور ان کی تصانیف سے تعارف

② خرقِ عادت اُمور اور انکارِ مُعجزات سے متعلق چند بنیادی مباحث

حصہ اوّل

حافظ عنایت اللہ صاحب اثری اور انکی تالیفات

گزشتہ چند ماہ سے میرے مضامین بسلسلہ عجمی تصوّرات کا پہلا، دُوسرا اور تیسرا دَور ماہنامہ ترجمان الحدیث لاہور میں چھپ رہے تھے ان مضامین میں میں نے "عقل پرست" فرقوں یعنی جہمیہ اور معتزلین ہندوستان میں بالخصوص سرسید احمد خاں صاحب اور ان کے جانشینوں سے ہوتے ہوئے ادارہ طلوع اسلام کے عقائد ونظریات کا جائزہ پیش کیا تھا۔ بحث کا سلسلہ جاری تھا کہ انہی ایام میں میرے ایک عزیز نے مجھے جناب حافظ عنایت اللہ صاحب اثری گجراتی کی ایک تالیف "القول المختار والبیان المختار" ملاحظہ کے لیئے دی اور اس بات پر اصرار کیا کہ اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی ہونا چاہیئے اور اس کا جواب دینا بھی ضروری ہے۔

کتاب مذکورہ ——— جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ——— دراصل دو الگ الگ تالیفات کا مجموعہ ہے۔ بالفاظ دیگر دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّہ کا پُورا نام "القول المختار فی ما ورد عن النبی المختار" ہے اور یہ رسُول اکرمؐ کے حالات سے متعلق ہے۔ دُوسرے حصّہ کا نام "البیان المختار فیما ورد من انباء الرسل الاخیار" ہے۔ اور یہ آدمؑ سے لے کر عیسیٰ علیہ السّلام تک انبیاء کے حالات سے متعلق ہے۔ یہ ضخیم اور مجلّد مجموعہ تقریباً سات سو صفحات پر پھیلا ہُوا ہے۔

عیونِ زمزم کا تعارف

اس سے چند سال پیشتر میں نے مؤلف مذکور کی ایک تالیف "عیون زمزم فی میلاد عیسیٰ ابن مریمؑ" بھی سرسری نظر سے دیکھی تھی۔ جس میں آپ نے تمام اُمت کے ایک مسلمہ عقیدہ کہ "عیسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش بن باپ کے معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی" کی تردید کی تھی۔ اور اس میں بدلائل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ عیسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش بھی عام ضابطہ الٰہی کے مُطابق ہی واقع ہوئی تھی۔ اس میں نہ کوئی اعجاز ہے نہ خصوصیت۔ اور امت مسلمہ کا یہ عقیدہ تقلید آباء کے علاوہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ سرسری معلومات کی بنا پر مجھے یہ بھی معلوم ہُوا تھا۔ کہ مؤلف مذکور شہر گجرات میں ایک جامع مسجد اہلحدیث کے خطیب بھی ہیں۔ درس بھی باقاعدہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی

طالب علم ہو تو اسے حدیث وغیرہ پڑھاتے بھی ہیں۔ مجرّدانہ زندگی بسر کرتے ہیں بیوی بچہ کچھ نہیں منکسرالمزاج حاضر جواب اور ظریفُ الطبع ہیں۔ آپ کا پسندیدہ شغل تصنیف و تالیف ہے۔ البتہ سرسید مرحوم کی تالیفات سے بہت حد تک متاثر ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے میرے عزیز نے یہ خدمت میرے سپرد کی اور تبصرہ اور جواب کے لیئے اصرار کیا۔ چونکہ کتاب عیونِ زمزم فی میلاد عیسیٰ بن مریم بھی اسی موضوع سے متعلق تھی لہٰذا اس کتاب کا بھی از سر نو بنظر غائر مطالعہ کرنا میرے لیئے ضروری ہو گیا۔ تاکہ حافظ صاحب مذکور کو پوری طرح سمجھا جا سکے۔

موضوعِ کتاب "القول المختار وبیان المختار" اس وقت ہمارے پیش نظر کتاب مذکورہ کا دُوسرا ایڈیشن ہے جو دیدہ زیب طور پر شائع ہوا ہے اور اسے آپ کے شاگرد رشید جناب عبدالکریم صاحب اثریؔ نے نظر ثانی کے بعد شائع کیا ہے اس کتاب کے پہلے حصّہ "القول المختار" کے ٹائیٹل پر موضوع سے متعلق یہ عبارت درج ہے:

> "اس کتاب میں محمد رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ کا بیان ہے اور آپ کی عصمت کے خلاف جو باتیں کتب تفاسیر و سیر میں محض خوش فہمی کی بنا پر درج ہو کر لوگوں میں مشہور ہو چکی ہیں ان کا صحیح حل اور ٹھیک مطلب بیان کیا گیا ہے"۔

اور دُوسرے حصّہ بیان المختار کے ٹائیٹل پر یہ عبارت درج ہے:۔

> "اس کتاب میں آدمؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک ان تمام برگزیدہ بندوں (انبیاء و رسل) علیہم السلام کا بیان ہے جن کے قصص کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے نیز عصمتِ انبیاءؑ کے خلاف ایسی باتیں جو کتب تفاسیر و سیر میں محض خوش فہمی کی بنا پر درج ہو کر لوگوں میں مشہور ہو چکی ہیں۔ ان کا صحیح حل اور ٹھیک مطلب بیان کیا گیا ہے"۔

گویا مختصر الفاظ میں کتاب کا اصل موضوع "عصمتِ انبیاء" ہے۔ چنانچہ مؤلف صاحب مذکور نے خود بھی اس موضوع میں حصر کی طرف کئی مقامات پر وضاحت کر دی ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کے حالات میں جب جنتہ الخلد یا شجرۃُ الخلد کا ذکر آتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ بحث کہ جس جنّت میں آدمؑ اور حوّاؑ کو کچھ عرصہ رکھ کر نکالا گیا تھا وہ کون سی جنت تھی؟ آیا جنۃ الخلد یا کوئی دنیوی باغ تھا اور جس درخت سے ان کو روکا گیا تھا وُہ کون سا درخت تھا میرے نزدیک کوئی ضروری اور اہم بحث نہیں کیونکہ اس میں نہ تو کوئی اشکال ہے اور نہ کسی پر کوئی الزام، جو کہ اصل موضوع ہے"۔

(بیان المختار ص ۴۴)

ایک دُوسرے مقام پر رسولِ اکرمؐ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"چونکہ آپ خاتم النبیّین ہونے کے علاوہ افضل الرسل بھی ہیں۔ لہٰذا آپ کی عصمت کا بیان میں نے ایک مستقل کتاب "القول المختار" میں لکھ دیا ہے جو کہ اس کتاب کا پہلا حصّہ ہے۔" (بیان المختار صفحہ ۴۹)

مگر جب کتاب مذکورہ کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہُوا کہ اس اصل موضوع سے ہٹ کر انبیاء کے علاوہ بعض دُوسرے اصحاب کا ذکر بھی موجُود ہے مثلاً سُلطان ذُوالقرنین، حنہ بنت فاقوذ اور اصحاب کہف وغیرہ۔ اصل موضوع میں کچھ مزید وسعت کا جواز پیدا کرنے کے لیئے ہی اس دُوسرے ایڈیشن کے کار پرداز جناب عبدالکریم اثری کو حرف اوّل لکھ کر اس کی صراحت کرنا پڑی۔ اس "حرفِ اوّل" کا ملخص کچھ اس طرح ہے :۔

تسبیح۔ تحمید۔ سلام۔ صلوٰۃ کا اصل مفہوم : "اصل تسبیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اِن نقائص سے پاک وصاف بیان کیا جائے جو لوگوں نے خوش فہمی اور کم عقلی کی بنا پر اس کی طرف منسوب کر دیئے ہیں اور اصل تحمید یہ ہے کہ اس (اللہ تعالیٰ) کے کمالات کو ظاہر کیا جائے اور اس کی صفات کو بیان کیا جائے۔"

"اسی طرح پر اصل سلام یہ ہے کہ رسولؐ اللہ اور دُوسرے انبیاء کی نبوّت وسیرت پر جو بدطینت لوگوں نے الزام تراشے ہیں ان کو پُوری قوّت کے ساتھ ردّ کر دیا جائے اور صلوٰۃ یہ ہے کہ ان کے محاسن کو واضح کیا جائے۔" (حرف اوّل صفحہ ۳)

مندرجہ بالا اقتباس میں درج ذیل امور غور طلب ہیں۔

۱۔ تسبیح و تحمید باری تعالیٰ گو اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے تاہم سلام وصلوٰۃ کے یہ خودساختہ معنی سمجھانے کے لیئے تسبیح وتحمید کی مثال دینا ضروری تھا۔

۲۔ تسبیح وتحمید اور سلام وصلوٰۃ ہم معنی الفاظ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تسبیح وتحمید اللہ کے لیئے ہے اور سلام و صلوٰۃ تمام انبیاء کے لیئے۔

۳۔ صلوٰۃ وسلام کے پڑھنے یا بھیجنے کا حکم تو صرف رسولِ اکرمؐ کے لیئے مخصوص ہے مگر ان الفاظ کو غلط معنی پہنا کر دوسرے انبیاء کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔

موضوع میں وسعت اور اس کا جواز : پھر آگے چل کر اس حرفِ اوّل میں فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریگا تو ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی وُہ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں

اور صالحین کے ساتھ ہوں گے" (۴: ۶) لہٰذا جو لوگ اللہ اور اس کے رسُول کے فرمانبردار ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ جب کوئی بدزبان کسی نبی کی نبوت وسیرت پر حملہ کرے یا کسی صدیق کے صدق وصفا پر اعتراض کرے یا کسی شہید کی شہادت پر طعن کرے یا کسی صالح کی صالحیت پر حرف گیری کرے تو وُہ قلم اور زبان سے اس کی عالمانہ طور پر پُوری پُوری تردید کریں اور دندان شکن جواب دیں کہ یہ ٹھیک ٹھیک سلام ہے اور چاہیئے کہ وُہ ان کے محاسن بھی بیان کریں کیونکہ یہی اصل صلوٰۃ ہے"

مندرجہ بالا تشریح سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:-

۱۔ تسبیح اور سلام کا معنی ایک ہے اور تحمید اور صلوٰۃ کا معنی بھی ایک ہے۔ پہلے سیٹ کے معنی ہیں نقائص سے پاکیزگی بیان کرنا اور دُوسرے سیٹ کے معنی ہیں محاسن بیان کرنا۔

۲۔ صلوٰۃ وسلام کا حکم محض رسولِ اکرمؐ سے مخصوص نہیں بلکہ اس میں دوسرے انبیاء بھی شامل ہیں۔ مزید براں اس صلوٰۃ وسلام میں صدیق، شہید اور صُلحاء بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے فرمانبردار قیامت کے دن ان کے ساتھ ہوں گے۔ اس لحاظ سے اللہ اور رسُول کے تمام فرمانبرداروں کو بھی صلوٰۃ وسلام کا مستحق سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

۳۔ صلوٰۃ وسلام کا فریضہ صرف وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جو اہلِ قلم اور زبان ہوں۔ کم علم یا عام لوگ بھلا کسی کو کیا دندان شکن جواب دے سکتے ہیں جبکہ رسولِ اکرمؐ پر صلوٰۃ وسلام کا حکم عام مسلمانوں کو ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ صلوٰۃ وسلام کے معنی کی غلط تعبیر پیش کی گئی ہے۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر موصوف کو انبیاءؑ اور دُوسرے نیک سیرت لوگوں کی پاکیزگی اور محاسن بیان کرنا تھا تو وہ سلام وصلوٰۃ کے الفاظ درمیان میں لانے کے بغیر بھی یہ کام کرنے میں پُوری طرح آزاد تھے شاید اس کام کو متبرک اور اللہ کے حکم صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کی تعمیل ظاہر کرنا مقصود ہو۔ بہرحال ان دلائل سے موضوع میں وسعت ضرور پیدا کر لی گئی ہے۔

موضوع میں اَور وسعت

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں بنی اسرائیل کے اُن ملعون اور نافرمان حضرات کا ذکر بھی آتا ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ اور ایک دُوسرے مقام پر فرمایا کہ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ۔ تو آپ ان ملعونوں کی بھی تسبیح یا سلام کے لیئے تیار ہو گئے ہیں۔ آپ جسمانی طور پر ان کی شکل میں تبدیلی کے قائل نہیں بلکہ آپ کے خیال میں یہ تبدیلی محض ذہنی تبدیلی تھی۔ یعنی ان کے عادات وخصائل بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ ان آیات کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف پہلے بھی رہا ہے مگر راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان ملعونوں کی شکل میں تبدیلی واقع ہوئی تھی

کچھ تھوڑے مفسّر ایسے بھی ہیں جو محض ذہنی تبدیلی مانتے ہیں مگر قرآنِ کریم کے الفاظ کے ترجمہ میں جس طرح آپ نے تحریف فرما کر ان ملعونوں کی حمائت فرمائی ہے وُہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات کا انڑی ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَمَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۷/۱۶۶)	"وہ اپنی بدکاریوں کی وجہ سے خنزیر اور بندر کہلائے"۔ (ص ۳۹۲)
مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ (۵/۶۰)	"جو اپنی شرارتوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے مغضوب و ملعون ہوئے اور بندر اور خنزیر اور طاغوت پرست کہلائے"۔ (حوالہ ایضاً)

اب سوال یہ ہے کہ کیا کُونوا اور جعل دونوں کا معنیٰ کہلانا ہی ہے؟ کم از کم ترجمہ تو ٹھیک لکھ دیتے پھر جو چاہتے اس کی تفسیر فرماتے رہتے۔

پھر اپنے اس نظریہ کی حمایت میں آپ نے کمثل الحمار اور کمثل الکلب کے نظائر بھی پیش فرمائے ہیں۔ ان میں ک حرف تشبیہ اور مثل کا لفظ مستزاد ہے جو ان حیوانوں کی ایک ایک خصلت کی مناسبت سے ذکر ہُوا ہے یعنی عالم بے عمل کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گدھے پر کتابیں لدی ہوں۔ اس مثال میں یہ کب کہا گیا ہے کہ عالم بے عمل فی الواقع گدھا بن جاتا ہے یا جو شخص محض دنیا پرست ہو وُہ کُتا بن جاتا ہے جبکہ اُوپر کی آیات میں کُونُوا اور جَعَلَ کے الفاظ ان کی ظاہری شکل وصورت میں تبدیلی پر دلالت کرتے ہیں جو کم از کم عقل پرستوں کی عقل سے بہرحال ماوراء ہیں۔ اس موقعہ پر مسخ اور طمس وغیرہ الفاظ کو زیر بحث لانے کے بعد آپ نے جو نتیجہ پیش فرمایا ہے وُہ یہ ہے :۔

"مگر میں کہتا ہُوں کہ اسلام نے ضمیروں کے ساتھ عملوں کو بھی ٹھیک کر دیا ہے بلکہ شکل و صُورت بھی درست کرائی ہے اگر کوئی اعتقاداً اچھا ہے مگر عملاً اچھا نہیں تو وُہ بھی ممسوخ ہے اگر عملاً بھی اچھا ہے مگر شکل وصورت اسلامی نہیں تو وُہ بھی ممسوخ ہے۔ اسرائیلی ہر سہ طرح سے ممسوخ ہوئے اور اُمتِ محمدیہ بھی ان کی چال پر جا رہی ہے۔ خیال گندے ہیں مقال گندے ہیں اعمال گندے ہیں۔ کونوا قردۃً خاسئین کا مصداق بنے ہوئے ہیں"۔ (بیان المختار، ص ۳۹۵)

اب دیکھیئے کہ خیال کی گندگی، مقال کی گندگی اور اعمال کی گندگی یہ تو سب کچھ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ میں آ جاتا ہے۔ گویا حافظ صاحب کے خیال میں وُہ پہلے ہی قردۃً خاسئین تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۷/۱۶۶) اور اس حکم کے بعد ان میں مزید کچھ ذہنی یا جسمانی تبدیلی

ہوئی تھی یا نہیں؟

بات یہ چل رہی تھی کہ کتاب کا اصل موضوع تھا عصمتِ انبیاء، پھر اس میں وسعت پیدا کرکے صُلحاء کو شامل کیا گیا۔ پھر بدکرداروں کی تنبیع یا سلام یا پاکیزگی بیان کرکے آپ نے بدکرداروں کو بھی علی حالہٖ رہنے دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ایسے بدکرداروں کے لیئے جو سزا تجویز فرمائی وُہ آپ کو مناسب معلوم نہیں ہوئی تو پھر اس کتاب کا موضوع کیا ہُوا کتاب ہذا کے غائر مطالعہ سے معلوم ہُوا کہ آپ کا اصل موضوع تو خرقِ عادت امور کو تاویلات پیش کرکے ان کو معمول کے مطابق ثابت کرنا ہے اور اس لحاظ سے وُہ کسی مقام پر نہیں چوکے۔ مگر یہ بات آپ کھُل کر نہ کہہ سکے لہٰذا اس مقصد کو عصمتِ انبیاء کا جامہ پہنایا۔ رہے دوسرے امور جو زیرِ بحث آئے ہیں تو وُہ سب اس پوشیدہ مقصد پر پردہ ڈالنے کے لیئے شامل کر دیئے گئے ہیں مثلاً کیا فرشتوں کے پَر ہوتے ہیں؟ یا حضرت آدم کا قد کتنا تھا؟ ستارے تو بلند ہوتے ہیں تو انہوں نے یوُسف کو سجدہ کیسے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

عصمتِ انبیاء کا مطلب: اب موضوعِ کتاب "عصمتِ انبیاءؑ" کا ایک اور پہلو سامنے لائیے۔ آپ نے اس ضمن میں جتنے واقعات پیش فرمائے ہیں۔ ان کو تین قسموں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱)۔ ایسے فضول قصّے جو بعض مفسّرین نے اسرائیلیات سے نقل کر دیئے ہیں اور وُہ فی الواقع انبیاء کی سیرت پر ایک بدنما داغ ہیں مثلاً حضرت داوُدؑ کے متعلق اوریاہ والا واقعہ۔ ایسے واقعات کی سابق مفسّرین بھرپُور تردید فرما چکے ہیں جیسا کہ حافظ صاحب نے خود بھی ذکر کیا ہے فرماتے ہیں "بلکہ بعض محقق علماء کرام نے اس کی خوب دل کھول کر تردید فرمائی ہے" (بیانِ المختار صہ ۲۶۳)۔ ان محقّق علمائے کرام سے بہت پہلے حضرت علیؓ نے اپنے دَورِ خلافت میں یہ فرمایا تھا کہ جو شخص اوریاہ والا قصہ حضرت داؤدؑ کی طرف منسوب کرے گا میں اسے ایک سو ساٹھ درّے لگاؤں گا یہ حدِ قذف کا دُگنا ہے کیونکہ یہ ایک نبی پر اتہام ہے۔" آپ کے اس ارشاد کو حافظ صاحب نے بھی ص ۲۶۵ پر ذکر کیا ہے۔ پھر اس صراحت کے بعد دُوسرے محقّق علمائے کرام کی تردید کی ضرورت تو نہیں رہتی تاہم جن علماء نے اس اتہام کے خلاف لکھا، جس میں حافظ صاحب موصوف بھی شامل ہیں۔ اسے ان کا کارِ خیر ہی سمجھنا چاہیئے۔ حضرت آدم اور حوّا پر الزامِ شرک، حضرت سلیمان اور انگشتری کا قصّہ وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔

(۲)۔ ایسے فرضی اتہامات جن کو آج تک نہ کسی مفسّر نے اتہام سمجھا نہ ہی کسی مستشرق نے اتہام سمجھا لیکن صرف آپ کی نظروں میں وہ ایک اتہام ہے۔ آپ خود ہی کسی واقعہ کو اتہام کی صُورت دے لیتے ہیں۔ پھر اس کے دفاع میں قرآنی آیات کے ربط کا بھی ستیاناس کر دیتے ہیں اور فائدہ بھی کچھ نہیں ہوتا مثلاً

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے غلّہ کی قیمت وصول کرنے کے بعد ان کے سامان میں ان کی دی ہوئی رقم رکھ کر انہیں قیمت لوٹا دی ۔ یہ حضرت یوسفؑ کا اپنے بھائیوں پر احسان تھا لیکن آپ اسے حضرت یوسفؑ پر اتہام سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ نے غلّہ کی قیمت واپس نہیں کی تھی ۔ بلکہ اس غلّہ کا کرایہ بار برداری شتربانوں کو دے دیا تھا ۔ اس طرح آپ نے حضرت یوسف سے اس احسان کے اتہام کا دفاع کر کے انہیں معصوم قرار دیا ہے ۔ اگرچہ کرایہ باربرداری بھی ان کی طرف سے ادا کر دینا ایک "احسان" ہے ۔ بڑا نہ سہی ذرا چھوٹا سہی آخر مصر سے لے کر کنعان تک کرایہ باربرداری بھی کیا کم ہوگا لیکن اس طرح آپ نے اپنے فرضی اتہام کا دفاع کر کے ذہنی سکون حاصل کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے ۔ قرآنی الفاظ ان کا ہرگز ساتھ نہیں دیتے ۔ ظاہر ہے کہ اس انداز کی دینی خدمت، کو مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس طرح کے کافی واقعات آپ کو اس کتاب میں ملیں گے ۔

(۳) ۔ اور آپ کا اصل ہدف انبیائے کرام کی ذات سے متعلق خرق عادات امور اور معجزات کے "اتہام" کو دور کر کے ان واقعات کو مطابق فطرت ڈھالنا ہے ۔ یہی اتہام آپ کی نظروں میں وہ سب سے بڑا اتہام ہے جس نے آپ کو یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا ۔ اور اسی قسم کے اتہامات سے آپ انبیاء کی عصمت بیان فرمانا چاہتے ہیں آپ نے کسی نبی کا معجزہ نہیں چھوڑا جسے آپ نے اپنے مخصوص انداز میں تاویل و تحریف اور تضحیک[۱] کا نشانہ نہ بنایا ہو البتہ آپ ایسے واقعات ضرور چھوڑ گئے ہیں ۔ جن کا ذکر صرف احادیث میں ملتا ہے جیسے حضرت اسماعیل اور چاہ زمزم کا واقعہ یا حضور اکرمؐ کا حضرت علیؓ کی آشوب زدہ آنکھوں پہ لب لگانا ۔ اور اسی وقت آنکھوں کا درست ہو جانا ۔ یہ باتیں ان انبیاء کے محاسن میں تو شمار ہوتی ہیں مگر خوارق عادت ہیں لہٰذا محض احادیث صحیحہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے آپ نے ایسے بے شمار واقعات کو قابل التفات نہیں سمجھا ۔

حضرت عیسیٰ ابن مریم کی بن باپ پیدائش کا واقعہ ایسا واقعہ ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ثابت ہے ۔ اور قرآن کریم نے اس واقعہ کو تین مقامات پر "آیۃ" اور آیۃً للناس فرما کر واضح کر دیا کہ یہ خرق عادت واقعہ اللہ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہے جو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کسی مصلحت کے تحت کرتے رہتے ہیں مگر آپ اسی واقعہ کو حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ پر بہت بڑا اتہام سمجھتے ہیں چنانچہ عیونِ زمزم کے صفحہ ۵۱ پہ خود ہی ایک سوال اٹھاتے ہیں :۔

> "سید علی حائری شیعہ نے اپنی تفسیر لوامع التنزیل میں ابو البصیر سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو عبداللہ جعفر صادق سے دریافت کیا کہ اللہ پاک اپنی سنت کے مطابق سب کو ماں باپ سے پیدا فرماتا

---

[۱] مثلاً یونسؑ کے مچھلی کے پیٹ سے باہر آنے پر آپ کا تبصرہ (بیان المختار صفحہ ۲۴۸) یا سلیمانؑ کے پاس ایک لمحہ میں بلقیس کا تخت لانے پر تبصرہ (بیان المختار ص۲۴۰)

ہے پھر عیسیٰ علیہ السلام کو بے پدر کیوں پیدا کیا تو آپ نے فرمایا کہ اسے اپنی قدرت کا اظہار مقصود تھا۔"

پھر اثری صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

معجزہ یا اتہام "یہ موصوف پر اتہام ہے۔ زوجین سے پیدائش میں اللہ پاک کی بہت بڑی شاندار قدرت کا اظہار ہے۔ بے پدر پیدائش میں عورت اور بچہ دونوں کے لیئے بہت بڑی خفت ہے۔" (عیون زمزم ص۵۱)

چنانچہ اس قسم کے اتہامات کو انبیاء صالحین حتیٰ کہ بدکرداروں سے بھی دور فرما کر اُن کی تسبیع یا سلام کا حق ادا فرمایا ہے اور بالخصوص انبیاء کی عصمت بیان فرمائی ہے۔

خرق عادت امور سے انکار — جو کہ در اصل اللہ تعالیٰ کی جاری وساری قدرت کا انکار ہے کا دوسرا نام نیچریت ہے اور اس نیچریت کی بنا پر اثری صاحب کے پیشرو سرسید احمد خاں پر علماء نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا لیکن اثری صاحب ان سے بھی چار ہاتھ آگے نکل گئے ہیں بلکہ وہ نیچر کے منکر کو مستحق عذاب سمجھتے ہیں۔ بیان المختار کے صفحہ ۲۹۵ پر طبرانی سے ایک مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں:۔

تَاتِی الْمَرْاَۃُ فَتَجِدُ زَوْجَھَا قَدْ مُسِخَ قِرَدَۃً لِاَنَّہٗ لَا یُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ	عورت آکر اپنے خاوند کو پائے گی اس کی شکل مسخ ہو گئی وہ بندر بن گیا ہے کیونکہ وہ (اس کا خاوند) عقیدۂ تقدیر یا اللہ تعالیٰ کی جاری وساری قدرت پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔

نیچر کے منکر اس مقام پر آپ اس حدیث کا ترجمہ صرف اتنا ہی لکھتے ہیں کہ "عورت اپنے شوہر کو بندر پائے گی"۔ پھر مسخ، قذف، خسف، اور آسمان سے پتھروں کی بارش کی تاویلات پیش فرمانے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ۲۹۶ کے آخر میں لا یؤمن بالقدر کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ فالج، لقوہ، خطرناک امراض، زلزلوں اور بالائی منزلوں کے گرنے سے اینٹ پتھر برسنے سے تباہ ہوں گے کیونکہ "عموماً یہ لوگ مقادیر الٰہی اور اس کی نیچر کے منکر ہوں گے۔"

اب سوال یہ ہے کہ نیچر کا منکر تو کوئی کافر دہریہ بھی نہیں ہوتا پھر اس پر ایمان لانا چہ معنی دارد۔ جب کہ حدیث کے الفاظ میں ان کا جرم یہ ہے کہ "اِنَّہٗ لَا یُؤْمِنُ بالقدر" اور اسی جرم کی بنا پر ان کو مسخ، قذف، خسف اور آسمان سے پتھروں کی بارش کا عذاب ہوگا۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اثری صاحب نے قدر کے بالکل اُلٹ معنیٰ کر کے نیچر پرستی کی دلیل بھی مہیا فرما دی ہے ؏ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

مصنف کا مسلک گو آپ کے نام کے ساتھ اثری صاحب کا لاحقہ بھی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ آپ مسلکاً اہل حدیث ہیں تاہم آپ نے اپنی تصنیف میں بعض مقامات پر اس حقیقت کا کھل کر اعتراف بھی کیا ہے مثلاً اسی کتاب بیان المختار کے صفحہ ۱۹۱ پر فرماتے ہیں:-

"یہ مطلب میں نے ذی علموں کی ضیافت طبع کے لیئے بیان تو کر دیا مگر میرے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ یہ صحیح حدیثوں کے صریحاً خلاف ہے اور میں بفضلہ تعالیٰ اہل حدیث ہوں جن کے یہاں (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول) حدیث اسی طرح رسول سے تعبیر ہے جس طرح قرآن اللہ پاک سے تعبیر ہے۔"

اس اقتباس میں جہاں آپ نے کھلے طور پر اپنے اہل حدیث ہونے کا اعتراف کیا ہے وہاں یہ بھی درج فرمادیا ہے کہ آپ محض ضیافت طبع کے لیئے صحیح احادیث کے خلاف مطالب بیان فرما سکتے ہیں۔ خیر آگے چلئے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۹ پر اثری کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اثر سے اصطلاحاً و لغتہً حدیث اور اس کی روایت مراد ہے اور اہل حدیث کو اہل اثر یا اثری کہا جاتا ہے اور کتب احادیث و آثار مشہور ہیں۔"

پھر ایک مقام پر احادیث کے منکر کو یہودی، علم و عقل سے اندھا اور سچائی سے کوسوں دور قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"خواجہ صاحب (احمد الدین امرتسری) وغیرہ حدیث نبوی اور عصمت انبیاء کے قائل نہیں بلکہ یہودیوں کی طرح ان کی ذات گرامی پر اور ان کی حدیثوں پر کمینہ حملہ کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ پاک نے علم و عقل سے ایسا اندھا کیا ہے کہ وہ سچائی سے کوسوں دور ہیں۔" (ایضاً ص ۱۷۹)

اور ایک دوسرے مقام پر احادیث کے منکر کو مرتد (یعنی قابل قتل) قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"ادھر سامری نے موقع پا کر ایک بچھڑا کھڑا کر دیا تاکہ وہ اس کی پرستش کریں۔ یہ شخص پہلے بظاہر اہلحدیث کہلاتا تھا اور موسوی حدیثوں اور فرامین پر عامل تھا مگر بعد میں بچھڑے کی طرف متوجہ ہو کر گدی نشینی شروع کر دی اور عبد اللہ چکڑالوی کی طرح حدیث نبوی کا منکر ہو کر مرتد ہو گیا۔" (ایضاً ص ۲۱۷)

دوسرا رُخ ان مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے آپ بڑی سختی سے احادیث و آثار کو تسلیم کرتے ہیں۔ اب اس کا دوسرا رخ دیکھنے سے پیشتر تھوڑی سی تفصیل بتلانا ضروری ہے اثر لغتہً نقش پا یا پیچھے چھوڑے ہوئے نشان کو کہتے ہیں اس کی جمع آثار ہے۔ آثار قدیمہ مشہور لفظ ہے اور اصطلاحاً اثر کسی صحابی یا تابعی کے قول، فعل اور عمل کو کہتے ہیں اور اس کی تعریف و تحدید خود رسول اللہ نے یہ کہہ کر فرما دی تھی کہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" یعنی سب سے بہتر تو میرا زمانہ ہے۔ پھر

صحابہ کا پھر تابعین کا۔ رسول اللہ کے اپنے قول اور فعل کو سُنّت کہا جاتا ہے اور صحابہ اور تابعین کے اقوال و افعال کو آثار کہتے ہیں۔ احادیث میں سُنن و آثار سب کا ذکر ہے جس حدیث میں رسُولِ اکرمؐ کا قول مذکور ہو یا بالفاظ دیگر جس کی سند رسُولؐ اللہ تک پہنچتی ہو وُہ مرفوع حدیث کہلاتی ہے۔ جس حدیث میں کسی صحابی کا قول مذکور ہو یعنی اس کی سند کسی صحابیؓ تک پہنچتی ہو۔ اسے موقوف کہتے ہیں اور جس میں کسی تابعی کا قول مذکور ہو اور اس کی سند تابعی تک پہنچے وہ مقطوع کہلاتی ہے۔ اثری وُہ ہوتا ہے جو سُنن (مرفوع احادیث) کے علاوہ آثار (موقوف اور مقطوع احادیث) کو بھی درست اور قابلِ حجت تسلیم کرتا ہو بشرطیکہ اس کی اسناد یعنی رواۃ میں کوئی دُوسرا سقم نہ ہو۔

اب دیکھئے اثری صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے جو اُوپر مذکور ہُوا لیکن عمل یہ ہے کہ جو اثر انہیں اپنے نظریہ کے خلاف نظر آئے اسے بلا دریغ ردّ کر دیتے ہیں۔ مثلاً آپ قول المختار کے صفحہ ۱۳۶ پر ایک حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ روایت صحیح ہے مگر موقوف (یعنی حضرت انسؓ سے مروی) ہے جو کہ لائق حجّت نہیں خصوصًا اعتقادات میں قابلِ استناد نہیں"

اور بیان المختار کے صـ۲۳۹ پر حضرت ایّوب کی بیوی کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"عام مفسّرین نے فاضرب بہ ولا تحنث (۳۸/۴۴) میں ضرب کا مفعول عورت کو بتا کر اسے کوڑے لگوائے ہیں جس کا موقوفات اور مقطوعات میں بیان ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں اور میں نے اس کا مفعول حربی کافروں کو بتایا ہے"

اور عیونِ زمزم کے صـ۱۷ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"غیر نبیوں کا بیان (یعنی صحابہ، تابعین، محدّثین، مفسّرین وغیرہ) خواہ وُہ کثرت سے ہوں کسی بات کو واجب نہیں ٹھہرا سکتا۔ قرآن و حدیث سے ثبوت کی ضرورت ہے"

ان اقتباسات سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً:۔

(۱) موقوفات اور مقطوعات (یا صحابہ اور تابعین کے اقوال) حدیث کے ضمن میں آتے ہیں یا نہیں؟ زیادہ سے زیادہ آپ انہیں آثار کہہ سکتے ہیں اگر آپ کے نزدیک آثار قابلِ حجت نہیں تو آپ اثری کیسے ہُوئے؟

(۲) قرآن کے راوی بھی غیر نبی ہیں اور حدیث کے راوی بھی غیر نبی۔ صحابہ، تابعین، مفسّرین خواہ وہ ابنِ عباسؓ جیسے جلیل القدر صحابی ہی کیوں نہ ہوں آخر ہیں تو سب غیر نبی ہی۔ پھر اعتبار کس بات کا رہ گیا؟ اگر قرآن کی تفسیر کے معاملہ میں صحابی اور تابعین جنہوں نے قرآن کو خود رسولِ اکرمؐ سے سیکھا پڑھا اور سمجھا تھا ــــــ

کے اقوال کو اگر غیر نبی کا قول کہہ کر رد کر دیا جائے تو آخر آپ کو کون سے قرآن وحدیث سے نبوت کی ضرورت ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح منکرین حدیث احادیث کی رکاوٹ کو دور کر کے قرآن کی من مانی تاویلات کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں لغت پر انحصار کر کے دور از کار مجازی اور کنائی معنی تلاش کر کے قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا دیتے ہیں اور فی الحقیقت وہ منکر حدیث ہی نہیں بلکہ منکر قرآن بھی بن جاتے ہیں۔ بالکل یہی حربے جناب حافظ اثری صاحب بھی استعمال کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ منکرین حدیث تو صرف قرآن پر ہاتھ صاف کرتے ہیں جبکہ اثری صاحب کو اثری کہلانے کی بنا پر دوہری محنت پڑگئی ہے اور وہ قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث پر بھی ہاتھ صاف کرتے جاتے ہیں لیکن آپ کی اثریت کچھ ایسی مضبوط قسم کی ہے کہ اس میں پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ بات ہم صرف زبانی ہی نہیں کہتے بلکہ ہمارے اس دعویٰ کے کئی ثبوت آپ کو اس کتاب میں مل جائیں گے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔

آپ کی تصانیف پر علماء کے تبصرے:

ہم حیران ہیں کہ یہی اثری صاحب جو حدیث پر نقد و نظر میں اتنے متشدد ہیں کہ کسی سند میں اگر راوی کی کنیت[1] مذکور ہو تو بھی وہ اس حدیث کو اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ فلاں راوی مجہول ہے۔ انہی کے شاگرد رشید جناب عبدالکریم صاحب اثری نے جب کتاب ہذا "قول المختار اور بیان المختار" کو دوسرے ایڈیشن سے آراستہ فرمایا تو ابتدا میں "مشتے از خروارے" کے عنوان کے تحت تقاریظ درج فرمائی ہیں۔ جن کے تمام کے تمام راوی یا نقاد صرف مجہول الحال ہی نہیں بلکہ مجہول الاسم والکنیت بھی ہیں مثلاً:۔

پہلے راوی "ایک جیّد عالم" ہیں دوسرے "ایک مولانا" ہیں تیسرے "ایک بزرگ" ہیں چوتھے "ایک معمر بزرگ" ہیں پانچویں "ایک فاضل نوجوان" ہیں۔ چھٹے "گجرات شہر کے ایک معمر عالم" ہیں۔ اور ساتویں "ایک اور مولانا" ہیں۔

(ایضاً ص ۷، ۸)

روایت کا یہ انداز بالکل ایسا ہے جیسے کسی پیر صاحب کے مرنے کے بعد اس کے عقیدت مند پیر صاحب کی کرامات اور اوصاف کا ایک قصر عظیم کھڑا کرنا چاہتے ہیں تو "روایت ہے" یا "نقل ہے" لکھ کر بعد میں جو کچھ جی میں آئے لکھتے جاتے ہیں۔ ایک ایسے محقق عالم کے شاگرد رشید پر روایت کے سلسلہ میں ایسی توقع نہ تھی خیر اب "روایت" یا اصل اقتباسات کا متن (جتنا اور جو کچھ اس عنوان کے تحت درج ہے) بھی ملاحظہ فرمایئے۔

پہلے جیّد عالم نے البیان المختار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"اس احقر کی نظر میں موصوف خوش خلق ہیں لاطمع ہیں، حبِ جاہِ دنیوی کے عیب سے بھی مبرّا ہیں اور ایک فاضل عالم ہیں۔"

غور فرمایئے اس "جید عالم" نے بیان المختار پر کیا تبصرہ فرمایا ہے؟ اس کتاب میں بیان المختار کے مصنف کی

---

[1] بیان المختار میں ۱۲۵ پر لکھتے ہیں: "تیسرا راوی ابو عثمان ہے جو کہ مجہول ہے پتہ نہیں کہ وہ کون ہے لہٰذا یہ روایت محدثانہ طریق پر قابل وثوق نہیں۔"

تعریف تو بیان ہو گئی مگر تصنیف کے متعلق ایک لفظ بھی ملتا ہے ؟ لطف کی بات یہ ہے کہ باقی ناقدین نے بھی کچھ ایسے ہی تبصرے فرمائے ہیں مثلاً دوسرے "ایک اور مولانا" لکھتے ہیں :-

"موصوف نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن سے ان کی امتیازی علمی قابلیت اور محنت نمایاں ہوتی ہے"

اسی طرح تیسرے ناقد "ایک بزرگ" لکھتے ہیں :-

"موصوف ایک بڑے عالم فاضل آدمی ہیں اور اردو میں فصیح البیان ہیں۔ قرآن کے حافظ، احادیث کے ضابط۔ قرآن وحدیث کی ترجمانی میں آثار سلف کے جاننے والے ہیں"

چوتھے ناقد کا بھی یہی حال ہے البتہ پانچویں ناقد "ایک فاضل نوجوان عالم" نے کچھ تصانیف پر بھی تبصرہ کیا ہے لیکن یہ پورا اقتباس درج نہیں۔ اس میں سے چند فقرات درج کیے اور باقی چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اس اقتباس کے آخر میں ایک فقرہ یہ ہے کہ۔

"آپ کو معلوم ہے جس مسلمان کے قول میں ننانوے وجہیں کفر کی ہوں اور ایک وجہ اسلام کی بھی پائی جائے تو بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اسے کافر نہیں کہنا چاہیئے"

اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کفر اور اسلام تک پہنچ چکی تھی مگر یہ فاضل نوجوان امام ابو حنیفہ کی بات کا لحاظ اور رواداری سے کام لے کر اثری صاحب کے متعلق کفر کی بات کہنے سے احتراز کر گئے ہیں۔

چھٹے نقاد "گجرات کے ایک معمر عالم" اپنی تصنیف "الدرج الثمین" لکھنے کے بعد اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس احقر کی کتاب "الدرج الثمین" میں آپ کی مذکورہ ہر سہ کتب کے متعلق جو تمسخر اڑایا گیا ہے اس میں مجھے معذور سمجھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اسے طبع نہ کراؤں اور کاتب مست صاحب کو لکھ دوں کہ اسے کتابت میں نہ لائیں مگر افسوس کہ وہ کتابت کر چکے تھے"

"اس معمر عالم" نے بھی عذر لنگ پیش کر کے آپ سے انصاف نہیں کیا۔ اگر کاتب کتابت کر چکا تھا تو بھی کتابت کے بعد چھپنے تک کئی مراحل باقی ہوتے ہیں۔ اس معمر عالم نے ایک تو آپ کی تصانیف کا تمسخر اڑایا دوسرے طبع تو اپنے ارادہ واختیار سے کیا اور کاتب بیچارے کو نشانہ بنا کر معذرت بھی کر لی۔

اب آخری اور ساتویں نقاد "ایک اور مولانا" کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیے :-

"مولانا عبدالحلیم صاحب اور ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے کلام کو جس محمل پر بھی ہم نے محمول کیا ہے اس سے بظاہر معجزہ شق القمر کا انکار ہی ثابت ہوا ہے

مگر اس کے باوجود ان دونوں بزرگوں نے شاہ صاحب پر کوئی فتویٰ صادر نہیں فرمایا" بایں وجہ کوئی ضرورت نہیں کہ آپ کی ایسی تحقیقات جو عام علماء کرام کی تحقیق سے ہٹ کر ہیں۔ کوئی فتویٰ صادر کیا جائے"

اس اقتباس میں اثری صاحب اوران کی تالیفات پر جس قدر کڑی تنقید کی گئی ہے شاید اس سے زیادہ تنقید ممکن بھی نہ تھی اور اگر دوسرے ایڈیشن کے مہتمم جناب عبدالکریم صاحب اس پر ذرا غور فرما لیتے اور اس اقتباس کو درج نہ فرماتے تو بہتر ہوتا۔ اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱)۔ اثری صاحب کی تمام تر تحقیقات عام علمائے کرام کی تحقیقات کے مخالف ہیں۔

(۲)۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بیان سے صرف ایک معجزہ کا انکار ثابت ہوتا ہے مگر وہ بھی صراحتاً نہیں باقی تمام معجزات کے وہ قائل ہیں پھر بھی عبدالحلیم اور ان کے فرزند نے کفر کا فتویٰ صادر کرنے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ مگر یہاں اثری صاحب تمام معجزات کے منکر ہیں۔

(۳)۔ اس نقاد "مولانا" نے عبدالحلیم اور اس کے بیٹے کی مثال پیش کر کے اور رواداری سے کام لے کر اثری صاحب پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے سے احتراز کیا ہے۔

علم اور ہدایت: مندرجہ بالا اقتباسات میں ایک بات بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ کہ جناب اثری صاحب ماشاءاللہ ایک عالم فاضل شخصیت ہیں۔ آپ کے ایک دوسرے شاگرد رشید عبداللطیف افضل نے آپ کی تصانیف کی تعداد اڑھائی صد تک بتلائی ہے۔ البیان المختار میں بھی آپ کی آٹھ دس کتابوں کے نام آ گئے ہیں۔ آپ کی تفسیر آیاتٌ للسائلین عربی زبان میں ہے چکڑالویوں اور مرزائیوں سے غالباً آپ مناظرے بھی کرتے رہے ہیں۔ البیان المختار کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاس ایسی لائبریری بھی موجود ہے جس میں مراجع ومصادر اور کئی کتب لغت بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں آپ تقریباً پچاس ساٹھ سال سے درس و تدریس کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو اتنی مدت سے قرآن وحدیث پڑھا رہا ہو اور ان پر عبور رکھتا ہو۔ کیا وہ گمراہ ہو سکتا ہے تو اس کا جواب قرآن کریم یہ دیتا ہے کہ ہاں ایسا ممکن ہے۔ ارشاد باری ہے:

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۴۵/۲۳)

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اللہ نے اسے جاننے بوجھنے کے باوجود بھی گمراہ کر دیا ہے اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب خدا کے بعد اسکو کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے

آیت بالا سے تین باتوں کا پتہ چلتا ہے :-

(۱) ۔ علم اور چیز ہے اور ہدایت اور چیز۔ گو عام ضابطہ الٰہی یہی ہے کہ علم کی روشنی انسان کی زندگی سنوارنے اور گمراہی سے ہدایت کی طرف آنے کا سبب بنتی ہے مگر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ علم ہی گمراہی کا سبب بن جاتا ہے اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ انسان رشید یعنی ہدایت یافتہ اور نیک چال چلن والا ہو مگر عالم نہ ہو یہ سب کچھ ممکن ہے۔

(۲) ۔ علم کے باوجود گمراہی کا سبب عموماً کسی خواہش نفس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ خواہش عزت وجاہ اور مال کی بھی ہو سکتی ہے اور تحقیق پیش کرنے کے نام پر کسی باطل نظریہ کو ثابت کرنے کی بھی۔ کسی باطل نظریہ کو پہلے سے ذہن میں رکھ کر اگر ایک عالم قرآن پر غور کرنا شروع کر دے گا تو اسے بھی قرآن سے "کچھ نہ کچھ" مل ہی جائے گا چنانچہ کسی بزرگ صوفی — جو خود تناسخ کے قائل تھے — کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں قرآن کے ہر صفحہ سے مسئلہ تناسخ ثابت کر سکتا ہوں۔ حالانکہ یہ عقیدہ خالصتہً اسلامی عقیدہ کے منافی ہے :-

ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۙ (۲/۲۶)	اللہ تعالیٰ اسی قرآن سے بہت لوگوں کو ہدایت بھی دیتا ہے اور بہت لوگوں کو گمراہ بھی کرتا ہے۔

چنانچہ آپ غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ سب گمراہ فرقوں کے لیڈر عموماً ذہین وفطین اور عالم لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا محض عالم ہونا ہدایت کے لیئے مستلزم نہیں۔

(۳) ۔ ایسا انسان جو اپنی کسی باطل خواہش یا نظریہ کو الٰہ کا درجہ دے دیتا ہے یعنی بزعم خود اس کیلئے مستقل مزاج بن جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے کسی لومۃ لائم کا خوف نہیں۔ اور عام زبان میں ہٹ دھرم اور "میں نہ مانوں" کا مصداق بن جاتا ہے تو اس وقت اس پر ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اس کے دل اور کانوں پر مہر لگ جاتی ہے پھر اللہ ہی ہے جو اسے ہدایت دے دے مگر عام ضابطہ الٰہی کے مطابق اسکی ہدایت مشکل ہی ہوتی ہے۔

ہدایت اور اسکے مدارج

لفظ ہدایت کا لغوی معنی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی راہنمائی کرنا اور بھلائی کا راستہ دکھلانا ہے اور اس کی ضد ضلالت (گمراہی) ہے۔ (مفردات امام راغب)

اور یہ مندرجہ ذیل تین طریقوں پر ہوتی ہے :-

۱۔ فطری راہنمائی، جیسے بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں کی طرف بڑھتا ہے اور دودھ چوسنے کا طریقہ اسے پہلے ہی فطرت نے سکھلا دیا ہوتا ہے اور یہ فطری راہنمائی ہر چیز کو میسر ہوتی ہے اور یہ راہنمائی صرف اللہ تعالیٰ

کا کام ہے۔ ارشاد باری ہے :۔

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو مخصوص ساخت عطا فرمائی پھر اسے ہدایت دی۔	رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ (۲۰/۵۰)

(ب)۔ وہ لوگ جو قلب سلیم کے ساتھ رہنمائی کے طالب ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کی راہنمائی کے لیئے رسول مبعوث ہوئے اور الہامی کتب نازل ہوئیں۔ اس قسم کی ہدایت بھی گو منجانب اللہ ہی ہوتی ہے تاہم اس میں الہامی کتابیں، رسول اور علمائے حق واسطہ کا کام دیتے ہیں جیساکہ ارشاد باری ہے :۔

(اے محمدؐ!) بیشک آپ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں	وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴۲/۵۲)

(ج)۔ اور ایسے لوگ جو باطل عقائد و نظریات پر ڈٹ جاتے ہیں ان کو نہ قرآن ہدایت دے سکتا ہے نہ کوئی رسول اور نہ ہی عالم حضرات کیونکہ ان کے دل و دماغ میں ایک ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ٹیڑھ کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دُور نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہی مقلب القلوب ہے وہی اس کے اندازِ فکر میں تبدیلی پیدا کرکے اسے راہ راست پر لا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت رسولِ اکرمؐ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں :۔

آپؐ کسی کو ہدایت دینا چاہیں بھی تو نہیں دے سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔	اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۲۸/۵۶)

اور یہ وُہ لوگ ہوتے ہیں جو معاشرہ میں معاشرتی یا علمی لحاظ سے کوئی خاص مقام رکھتے ہیں۔ گمراہ فرقوں کے لیڈر اور عمائدین بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر ہی مختلف ہوتا ہے۔ اسلام لانے کے بعد بھی چونکہ اندازِ فکر میں تبدیلی یا دِل میں ٹیڑھ پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو بالخصوص یہ دُعا سکھلائی گئی کہ :۔

اے ہمارے پروردگار! جب تُو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر دینا۔	رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا (۳/۸)

اور ہمارے خیال میں جناب اثری صاحب بھی اسی زیغ قلب، ہٹ دھرمی اور بتدریج تبدیلی کا شکار ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آپ کے اندازِ فکر میں یہ تبدیلی بتدریج واقع ہوئی (اس تدریج کا ذکر ہم کسی دُوسرے مقام پر کریں گے)۔ بالآخر وُہ اس ہٹ دھرمی میں اتنے متشدد ہو گئے اور قرآنی آیات کی ایسی عجیب و غریب تاویلیں پیش کیں کہ منکرینِ حدیث کو بھی مات کر دیا۔

کتاب کے محاسن و مثالب

کتاب "القول المختار اور البیان المختار" کا مجموعہ جو میرے پاس برائے نقد و نظر آیا ہے بظاہر دیدہ زیب اور خوبصورت ہے کتابت

اچھی آفسٹ پیپر طباعت اچھی، جلد اچھی ہے۔ کتاب کو دیکھ کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس میں کتابت کی اغلاط بے شمار رہ گئی ہیں اور ان اغلاط کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔

فہرست میں درج شدہ عنوانات متن کتاب سے لگا نہیں کھاتے جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:۔

ا۔ بعض عنوانات کا فہرست میں تو صفحہ درج ہے مگر متن میں ان کا اندراج نہیں مثلاً فہرست بیان المنار میں :-

۱۔ فہرست میں "کیا فرشتوں کے پر ہوتے ہیں"؟ صفحہ ۱۰ درج ہے لیکن متن کے صـ۱۰ پر کوئی عنوان نظر نہیں آتا

۲۔ فہرست میں "جبرئیل کی معیت میں چھ صد فرشتوں کا نزول" صفحہ ۱۲ درج ہے لیکن متن پر یہ صفحہ صاف ہے۔ یا

۳۔ فہرست میں "کیا حوا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی تھیں"؟ صفحہ ۲۰ درج ہے لیکن متن میں اس صفحہ پر ایسا کوئی عنوان نہیں۔ اور اس طرح کی مثالیں بے شمار ہیں۔

ب۔ ایسے ذیلی عنوان ہیں کہ متن میں موجود ہیں لیکن فہرست میں ان کا اندراج نہیں۔ شائد فہرست کو مختصر بنانے کے لیئے ایسا کیا گیا ہو مثلاً متن میں صفحہ ۲۱۲ پر ایک ذیلی عنوان ہے "بالآخر" یہ فہرست میں درج نہیں اسی طرح متن میں صـ۲۱۳ پر ایک ذیلی عنوان ہے "اطلاع" یہ فہرست میں درج نہیں۔

ج۔ بعض ایسے ذیلی عنوانات ہیں جو مہمل ہیں یا ادبی لحاظ سے دوسرے ایڈیشن کے مہتمم کو پسند نہیں آئے تو انکی تفصیل پیش کر کے درج کردیا گیا ہے مثلاً :-

(۱) متن میں صفحہ ۱۸۶ پر ایک ذیلی عنوان ہے "مصری کشتہ" جسے فہرست میں "موسیٰ سے قتل کا صدور" لکھا گیا ہے اسی طرح

(۲) متن میں صفحہ ۲۰۶ پر ایک ذیلی عنوان ہے "طلاقتِ لسانی" جسے فہرست میں "موسیٰ کی زبان میں لکنت کا تصور غلط ہے" لکھا گیا ہے۔

فہرست اور متن میں ایسی تبدیلیوں سے غالباً فہرست کو جاذب بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس سے بنظر غائر مطالعہ کرنے والوں کے لیئے دقت پیدا ہوگئی ہے۔

جناب حافظ صاحب کا طرز تحریر بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ دینی مدرسوں سے فارغ شدہ طالب علموں کا ہوتا ہے۔ رنگ مناظرانہ ہے۔ سوال بھی خود ہی اٹھاتے ہیں اور جواب میں کوئی نکتہ بیان فرمادیتے ہیں جواب بعض دفعہ اس قدر الجھے ہوئے اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ بجائے کچھ سمجھنے کے انسان کسی نئی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ اس مناظرانہ قسم کے سوال وجواب میں آپ نے قاری کی تفہیم کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ بہرطور اپنی بات کو غالب رکھنے کے خیال کی بنا پر ایسی پیچیدہ عبارت آپ کو تحریر کرنا پڑی ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں اس کتاب میں جا بجا آپ کو ایسی مثالیں مل جائیں گی۔

اثری صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ جب کسی معجزہ کی تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے تو پہلے اس سے متعلقہ نبی کی زندگی کا پورے کا پورا قصہ بدل دیتے ہیں پھر قرآنی الفاظ کے اور اسی طرح متعلقہ حدیث اگر کوئی ہو تو اسکے بھی الفاظ کے مختلف کتب ہائے لغت سے مجازی اور کنائی معنی تلاش کر کے اپنے واقعہ مخترعہ کو درست ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور بالوضاحت لکھتے ہیں کہ ٹھیک مطلب اس کا یہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں مروجہ مفہوم کا کوئی ذکر نہیں مثلاً بیان المختار کے صفحہ ۵۴ پر ناقۃ اللہ کی پیدائش سے انکار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اونٹنی کو اس طرح پر پیدا کرنا اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ سے کچھ بعید اور ناممکن نہیں مگر سلسلہ تناسل کے بعد جب تک نسل قائم ہے اس طرح پر پیدا کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ہے"

لطف کی بات یہ ہے کہ اس موقع پر آپ نے قرآنی آیات اور ایک حدیث کو بھی نقل فرما کر ان کا مطلب اپنے منشاء کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ گویا آپ نے قرآن و حدیث فہمی سے اسی طرح کے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔

دین کے معاملہ میں ایک بہت بڑی گمراہی یہ ہوتی ہے کہ انسان صداقت و سچائی کے ساتھ اس پر عمل پیرا نہ ہو اور خواہش نفس کو امام بنا کر احکام الٰہی میں مرضی کے مطابق حیلہ سازیاں کرے اور خود فریبی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ من مانی بھی ہو گئی اور دین کا اتباع بھی ہو گیا۔ برائی کو برائی سمجھ کر اس میں مبتلا ہونا اتنا برا نہیں ہوتا جتنا برائی کو بھلائی کا رنگ دے کر اسے ادا کرنا مکروہ ہے۔

مؤلف کی خود پسندی: بایں ہمہ آپ کو اپنی علمیت پر بہت ناز بھی ہے اور آپ خود کو کسی بھی بڑے عالم یا محدث سے کم نہیں سمجھتے اور اس بات کا آپ نے جا بجا ذکر بھی فرمایا ہے مثلاً:

قول المختار کے ص۱۳ پر بحث چل رہی ہے کہ صحابہ کرامؓ اور رسول اکرمؐ بھوک کے وقت اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے۔ اثری صاحب امام ابن حبان کے حوالہ سے فرما رہے ہیں کہ حدیث میں جو لفظ حجر بمعنی پتھر آیا ہے وہ دراصل حجز (یعنی ر کے بجائے ز) تھا۔ اور حجز کے معنی پیٹی ہیں۔ بھوک کے وقت پتھر کے بجائے پیٹی باندھنا معنی زیادہ درست ہے اور راویوں کو نقل کرتے ہوئے ز کا نقطہ رہ گیا (تصحیف ہو گئی)۔ اثری صاحب اس ساری بحث کے بعد نتیجہ کے طور پر ص۱۳ پر "تعاقب" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:-

"حافظ ابن حجر اور امام خطابی و دیگر علمائے کرام نے ابن حبانؒ پر اس باب میں تعاقب فرمایا ہے مگر میں بفضلہ تعالیٰ امام موصوف (ابن حبان) کے ساتھ ہوں بلکہ میرے نزدیک تو تصحیف ظاہر کئے بغیر بھی لفظ حجر کا معنی کپڑا ہو سکتا ہے جیسا کہ نہایہ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے"

اس اقتباس سے درج امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) ۔ابن حبان نے تصحیف کا نکتہ بیان کر کے حجر کے بجائے حجز سمجھ کر اس کا معنی پیٹی کیا ہے ۔اس پر حافظ ابن حجر، امام خطابی اور دیگر عُلمائے کرام نے مواخذہ کر کے ان کی رائے کو غلط قرار دیا ہے ۔اس کے باوجود اثری صاحب ابن حبان کی تائید فرماتے ہیں اور اس رائے کی تردید کرنے والوں سے اپنے آپ کو کسی صورت کم علم نہیں سمجھتے ۔

(۲) ۔ مزید برآں آپ ابن حبان سے بھی زیادہ عالم ہیں ۔ان کو تو تصحیف کا نکتہ پیش کرنے کی ضرورت پڑی لیکن آپ حجر کا معنی ہی کپڑا ثابت کر سکتے ہیں ۔

(۳) ۔ اس کا ثبوت "نہایہ وغیرہ" ہے ۔ نہ عبارت منقول ہے نہ حوالہ ۔اسے بس ایک مناظرانہ چال ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

اسی طرح عیون زمزم کے آخری صفحہ پر زیر عنوان " اطلاع " لکھتے ہیں :۔

"تفہیم مودودی کا حوالہ اگر مقابلہ کے وقت غلط معلوم ہو تو وہ غلط نہیں کہ میں نے موصوف کے اخص مُریدوں کے توسط سے انہیں بعض اغلاط پر توجہ دلائی تو انہوں نے تسلیم فرما کر کچھ اصلاح کر دی ہے اور کچھ اُمید ہے کہ کر دیں گے کہ پلیٹ ہائے تفہیم محفوظ ہیں جیسے کہ موصوف کے خادموں سے زبانی سُنا گیا ہے۔"

اِس اقتباس سے درج ذیل دو اُمور پر روشنی پڑتی ہے :۔

۱ ۔ اثری صاحب ماشاءاللہ اتنے عالم ضرور ہیں کہ مودودی صاحب کی اغلاط نکالیں اور وہ انہیں درست تسلیم کر کے اصلاح کر لیں تاہم اثری صاحب کی یہ اطلاع محض سماعی ہے یقینی نہیں ۔

۲ ۔ اس غیر یقینی اور سماعی اطلاع کے باوجود آپ نے اپنے حسب منشا ان کا حوالہ دے دیا ہے ۔اب وُہ قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر حوالہ صحیح ثابت نہ ہو تو مجھے معذور سمجھیں ۔کیونکہ میں نے اس حد تک تو کام کر ہی دیا تھا اور خادموں نے اُمید بھی دلائی تھی ۔

باب ۲

خرق عادت امور کے مختلف پہلو

ہر وہ واقعہ جو عام قوانینِ قدرت کے خلاف صادر ہو۔ اس کی ایک قسم معجزہ ہے۔ معجزہ ہر ایسے خرق عادت واقعہ کو کہتے ہیں جس کا صدور کسی نبی سے ہو یا اس واقعہ کا اس نبی سے کچھ تعلق ہو۔

معجزہ سے انکار اور اس کی وجہ: معجزاتِ انبیاء سے انکار کا دستور ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور آج بھی موجود ہے لیکن پہلے لوگوں اور بعد کے لوگوں کے انکار کی وجوہ الگ الگ ہیں۔ سابقہ ادوار میں انبیاء کے معجزات سے انکار کرنے والے کافر لوگ ہوتے تھے۔ وہ اس لیئے انکار نہیں کرتے تھے کہ معجزہ کا وقوع قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ خوارقِ عادت امور کو تو وہ مانتے تھے بلکہ انبیاء سے خود معجزہ طلب کرتے تھے اور جب نبی کو معجزہ عطا کر دیا جاتا تو اسے جادو کہہ کر نبی کی رسالت کا انکار کر دیتے تھے۔ ان کے اس رویہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ خرق عادت امور کے قائل تھے وہ معجزہ ہی نہیں بلکہ جادو کو بھی تسلیم کرتے تھے اور دوسرے یہ کہ ان کے معجزہ سے انکار کی اصل وجہ انبیاء کی رسالت سے انکار اور مخاصمت تھی نہ کہ خرقِ عادت امور کا ناممکن الوقوع ہونا لیکن آج مسلمانوں کا ایک طبقہ معجزہ کا انکار اس بنا پر کرتا ہے کہ چونکہ یہ عام قانونِ قدرت کے خلاف ہے لہٰذا ناممکن الوقوع ہے۔

معجزہ کے اقرار کو یہ طبقہ عجوبہ پسندی اور عجوبہ پرستی کا نام دیتا ہے حالانکہ معجزہ سے انکار درحقیقت قدرت الٰہی سے انکار ہے جو کفر ہے بالفاظِ دیگر معجزہ سے انکار خواہ نبی سے مخاصمت کی بنا پر ہو یا قانونِ قدرت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ہو خواہ عصمتِ انبیاء کے نام پر نبی سے معجزہ کے "اتہام" کو دور کرنے کی بنا پر ہو (جیسا کہ اثری صاحب نے وضاحت فرمائی ہے) بہر حال اس کے کفر ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق: اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کافر جب بھی کوئی معجزہ دیکھتے تو اسے جادو کہہ کر اس کا انکار کر دیتے تھے۔ حسب ارشاد الٰہی:۔

وَإِن يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۵۴/۲	اور جب بھی یہ (کافر) کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ جادو ہے ہمیشہ سے چلا آتا۔

تو آخر معجزہ اور جادو میں مماثلت کیا ہے اور فرق کیا؟

یہ تو ظاہر ہے کہ معجزہ بھی خرق عادت امور سے تعلق رکھتا ہے اور جادو بھی اور اسی خرقِ عادت امر کیلئے

اللہ تعالیٰ نے سحر کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے۔ فرعون کے جادوگروں نے جب حاضرینِ مجمع کو رسیوں اور لاٹھیوں کے سانپ دکھلا کر مبہوت اور دہشت زدہ کر دیا تو اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝ (۷/۱۱۵)	جب انہوں نے (لاٹھیاں اور رسیاں) زمین پر ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر کے انہیں دہشت زدہ کر دیا اور بہت بڑا جادو پیش کیا۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کا معجزہ بھی یہی تھا کہ ان کی لاٹھی بحکم الٰہی سانپ بن جاتی تھی گویا معجزہ اور جادو میں ایک گونہ مماثلت کو قرآن نے بھی تسلیم کیا ہے جب کہ یہ دونوں باتیں خرقِ عادت امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو معجزہ کو جادو سے ممتاز کرتی ہیں۔ قرآن سے ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱)۔ جادو میں اشیاء کی حقیقت نہیں بدلتی بلکہ لوگوں کی نظر کو فریب دیا جاتا ہے جس سے وہ چیز کی ماہیت میں تبدیلی محسوس کرنے لگتے ہیں جیسا کہ آیتِ بالا سے ظاہر ہے۔ لیکن معجزہ میں لوگوں کی آنکھوں کی نظر بندی نہیں کی جاتی بلکہ چیز کی ماہیت فی الحقیقت تبدیل ہو جاتی ہے جب موسیٰؑ کا عصا سانپ بن کر حرکت کرنے لگا تو خود موسیٰؑ بھی اس سے ڈر گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى (۲۰/۲۱)	اسے پکڑ لو اور ڈرو مت! ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عصا فی الواقع سانپ بن گیا تھا اور اس حقیقت کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جادوگر یہ ماجرا دیکھ کر کہ عصا سے بنا ہوا فی الحقیقت ایک حقیقی سانپ بن کر ان کے بنے ہوئے سانپوں کو نگلنے لگا ہے تو وہ جادوگر موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ کیونکہ اس فن کے ماہر ہونے کی حیثیت سے یہ بات خوب جانتے تھے کہ موسیٰؑ کا یہ معجزہ جادو کی انتہائی پرواز سے بھی ماوراء ہے۔ کیونکہ ان کی رسیوں اور لاٹھیوں سے بنے ہوئے سانپ ایک دوسرے کو نگل نہیں سکتے تھے۔ وہ محض فریبِ نظر تھا۔

(۲)۔ جادو کا اہلاک ممکن ہے جیسا کہ ان جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو موسیٰؑ کے بنائے ہوئے سانپ نے نگل کر ان کا وجود ہی ختم کر دیا۔ لیکن معجزہ میں ایسا اہلاک ممکن نہیں۔ بلکہ وہ چیز یا تو اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آتی ہے۔ جیسے موسیٰؑ کا عصا سانپ بننے کے بعد پھر عصا بن جاتا تھا۔ اسی طرح آپؑ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالتے تو اس سے سفید روشنی نمودار ہوتی تھی۔ پھر جب دوبارہ اپنا ہاتھ اپنے جسم سے لگا لیتے تو ہاتھ اپنی سابقہ حالت میں آجاتا تھا صالحؑ کی اونٹنی اللہ کے حکم سے پہاڑ سے نمودار ہوئی۔ جب اس کی رگ کاٹی گئی تو چیخ مار کر اسی پہاڑ میں غائب ہو گئی رسول اکرم

کے دور میں چاند پھٹا۔ تو پھر جُڑ کر پُورا ہوگیا۔ اور یا پھر اسی حالت میں طویل مدت تک قائم رہتی ہے جیسے چاہِ زمزم یا موسیٰؑ کے عصا مارنے سے بارہ چشموں کا پھُوٹنا۔

(۳)۔ اگر کوئی قوم اپنے نبی سے کوئی خاص معجزہ طلب کرے اور وہی معجزہ اس نبی کو عطا کر دیا جائے۔ پھر بھی قوم ضد پر اڑی رہے تو اس قوم پر عذاب کا نازل ہونا یقینی ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (۱۷/۵۹)	اور ہم نے نشانیاں بھیجنا اس لیے موقوف کر دیں کہ اگلے لوگوں نے اس کی تکذیب کی تھی اور ہم نے ثمود کو اُونٹنی (صالحؑ کی نبوت کی) کھُلی نشانی کے طور پر دی تو انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور ہم جو نشانیاں بھیجا کرتے ہیں تو ڈرانے کو۔

قومِ ثمود نے اونٹنی کا معجزہ طلب کرنے کے بعد سرکشی کی تو اس پر عذاب آیا۔ قوم عیسیٰؑ نے آسمان سے پکی پکائی روٹی طلب کی۔ پھر سرکشی پر ان کو بندر اور سُؤر بنا دیا گیا۔ جس کے متعلق اللہ نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ:

قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۵/۱۱۵)	خدا نے فرمایا میں تم پر ضرور خوان نازل فرماؤں گا لیکن جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا اسے ایسا عذاب دوں گا کہ اہلِ عالم میں کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہو۔

لیکن جادو کا انکار کرنے سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ خواہ مطالبۃً ہی کوئی چیز ظہور پذیر ہوئی ہو۔

(۴)۔ معجزہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کا صدور نبی سے ہوتا ہے وُہ قانون واصول پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھایا سکھایا جا سکے جبکہ جادو ایک فن ہے جس کو اس کے اصول اور قوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن دان ساحر کسی وقت بھی کام میں لا سکتا ہے۔ اس کے اسباب بھی اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں مگر صاحبِ فن کو اس کی پُوری حقیقت معلوم ہوتی ہے یہی وجہ تھی کہ وُہ جادوگر جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں آئے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ یہ چیز فن سے ماوراء ہے لہٰذا وُہ ایمان لے آئے۔

(۵)۔ ساحر کی تمام زندگی خوف و دہشت ایذا رسانی اور بد عملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس کے شر سے بچنے کے لیئے اس سے خوف کھاتے اور مرعوب ہوتے ہیں جبکہ نبی کی تمام زندگی صداقت، خلوص، مخلوقِ خدا کی ہمدردی اور تقویٰ و طہارت سے عبارت ہوتی ہے۔ نبی کبھی اس معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا بلکہ کسی اہم موقع پر صداقت و حق کی حمایت میں اس کا مظاہرہ کرتا ہے۔

(۶)۔ اگر کبھی جادو اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو ہمیشہ معجزہ ہی غالب رہتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی

مغلوب و عاجز ہو جاتا ہے اور انبیاء و رسل کی تاریخ میں جب کبھی ایسا مقابلہ ہُوا تو جادُو نے ہمیشہ مات ہی کھائی۔

معجزہ کے لیے قرآنی لغت: معجزہ کا لفظ قرآن کریم میں نہیں ہے اور نہ ہی معجزہ کے لیے قرآن نے کوئی مخصوص لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن نے معجزہ کے معنوں میں آیۃ، مبصرۃ، بینۃ اور برھان کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

(۱) ۔ آیت کا معنیٰ اگرچہ عموماً نشانی ہی کر لیا جاتا ہے تاہم یہ لفظ مندرجہ ذیل تین معانی میں استعمال ہوتا ہے:۔

ا۔ بمعنی قرآن کا ایک جُملہ یا فقرہ: چُونکہ قرآن کے کُھلم کھلا چیلنج کے باوجود بھی کفار و مشرکین مکّہ قرآن جیسی ایک آیت یا جُملہ بھی پیش کرنے سے قاصر رہے لہٰذا قرآن کا ایک ایک جُملہ یا آیت، ایک ایک سُورت حتیّٰ کہ پوُرا قرآن بذاتِ خود ایک معجزہ ہے جو رسولِ اکرمؐ کو عطا ہُوا۔

ب ۔ آیت بمعنی ایسی نشانی جس میں غور کرنے سے اس چیز کا علم بھی حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس کے صانع کا بھی، جو اس چیز کی طرح ظاہر نہ ہو (مفردات امام راغب) اسی معنیٰ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو انفس (بدن کے اندر کی اشیاء) اور آفاق (جسم کے باہر کی اشیاء کائنات) میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان اشیاء کو آیات کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)	ہم عنقریب ان کو اطراف عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھلائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ خدا کی ذات برحق ہے۔

ج ۔ بمعنی معجزہ جو خرقِ عادت ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ (۲/۱۱۸)	اور وُہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے (یعنی کفار و مشرک) وُہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام لوگوں سے ہمکلام ہونا خرقِ عادت بات ہے اور کفار اسی طرح کی کوئی دُوسری نشانی طلب کرتے تھے جو خرقِ عادت ہو۔ لہٰذا یہاں آیت سے مُراد یقیناً کوئی خرقِ عادت بات یا معجزہ ہی ہو سکتی ہے۔

(۲) ۔ مُبصِرۃ: ایسی واضح نشانی کو کہتے ہیں جو بذاتِ خود اس طرح ظاہر ہو کہ اس کے دیکھنے سے آنکھیں کُھل جائیں اور حقیقت واضح ہو جائے (مفردات)۔ یہ لفظ بھی قرآن میں معجزہ کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً (۱۷/۵۹) — اور ہم نے قوم ثمود کو اُونٹنی معجزہ کے طور پر دی۔

(۳) ۔ بَیِّنَۃٌ : ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو فریقِ مخالف کے انکار کی صورت میں بطور ثبوت کے بھی پیش کی جا سکے اسی لحاظ سے اس کا اطلاق معجزہ پر بھی ہوتا ہے بالخصوص جبکہ ساتھ آیۃ کا لفظ بھی تائید مزید کر رہا ہو۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (۷/۷۳) — تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف ایک معجزہ آچکا ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لیئے معجزہ ہے۔

دُوسرے مقام پر فرمایا :

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (۱۷/۱۰۱) — اور ہم نے مُوسیٰ کو نو کھلی نشانیاں (معجزات) عطا کیں

(۴) ۔ بُرھان : بُرہان ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو فریقِ مخالف کے تمام دلائل سے زیادہ وزنی اور ان پر حاوی ہو اور نزاع کا فیصلہ کر دینے والی ہو۔ (مفردات)

درج ذیل آیات میں برہان کا لفظ معجزہ ہی کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے :۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ . اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ (۲۸/۳۱-۳۲)

(اللہ تعالیٰ نے مُوسیٰؑ سے فرمایا) اور یہ کہ اپنی لاٹھی ڈال دو جب مُوسیٰؑ نے دیکھا کہ وُہ حرکت کر رہی ہے جیسے سانپ تو پیٹھ پھیر کر چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) آگے آؤ اور ڈرو مت ۔ تم امن پانے والوں سے ہو (اور) اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو تو وُہ بغیر کسی عیب کے سفید نکل آئے گا (اور خوف کو دُور کرنے کے لیئے) اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑ لو ۔ یہ دو دلیلیں (معجزے) ہیں تمہاری پروردگار کی طرف سے ان کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جاؤ۔

معجزہ کا تعیّن

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب معجزہ کے لیئے قرآن نے کوئی خاص لفظ استعمال نہیں فرمایا تو یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں واقعہ فی الحقیقت معجزہ ہی ہے ۔ اس کا جواب بھی قرآنِ کریم نے دیا ہے ۔ ارشاد باری ہے :۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴/۱-۲) — قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا اور اگر کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمیشہ کا جادو ہے۔

(۱) کفار کا اعراض اور تکرار: اس آیت سے درج ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے :-
(۱) جس واقعہ کا صدور نبی سے متعلق ہو اور اس کے متعلق کفار کا اعراض یا اسے جادو کہنا ثابت ہو جائے تو وہاں آیت کا معنیٰ معجزہ اور وہ واقعہ بھی معجزہ ہوتا ہے۔ کافروں نے شق قمر کے وقت اعراض بھی کیا اور جادو بھی کہا۔ لیکن معتزلین اور ان کے ہمنوا صرف اعراض کرتے ہیں۔

(۲) انشقاق قمر واقعی ایک معجزہ ہے جس کا صدور ہو چکا ہے کیونکہ اس پر کفار کا تکرار ثابت ہے۔ لہٰذا آج جو لوگ اس آیت کا معنیٰ "قیامت کے قریب آنے پر چاند پھٹ جائے گا" کرتے ہیں۔ یہ ان کا اعراض ہے کہ ایسے احادیث کی طرف رجوع کرنے کے بجائے دوسری تاویلات پیش کرنے لگتے ہیں۔

(۲) آیت کی ابتداء بعض اوقات اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ایسے الفاظ آیت کی ابتداء میں بطور تمہید استعمال کرتے ہیں جن سے معجزہ کا تعین ہو جاتا ہے مثلاً :-

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (۱۷/۱)	وہ پاک ذات ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں۔

اس آیت کے ابتداء میں سبحٰن کا لفظ آیاتنا کے معانی کو خرقِ عادت امور کے ساتھ مخصوص کر رہا ہے۔ سبحان کا لفظ اہلِ لغت کے نزدیک بالاتفاق کلمہ حیرت و استعجاب ہے۔ اب اگر یہ سفر محض روحانی ہوتا تو اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں تھی۔ سوتے میں تو عام انسانوں کی روح کئی بار آسمانوں کا سیر و سفر کرتی پھرتی ہے۔ اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے کہ آپؐ کی روح صرف چھ سو میل کے فاصلہ پر بیت المقدس چلی گئی ہو۔ حیرانگی اور تعجب تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یہ سفر جسمانی تسلیم کیا جائے۔ پھر اس واقعہ کے بعد کفار کا تکرار بھی اس کے معجزہ ہونے کی تائید مزید کر رہا ہے جو کہ احادیث اور تاریخ سے ثابت ہے۔

(۳) آیت کا خاتمہ: بعض دفعہ آیت کا آخری ٹکڑا یا لاحقہ یا خاتمہ جو آیت میں بیان شدہ مضمون کی دلیل کے طور پر واقع ہوتا ہے معجزہ کی تعیین اور تائید کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا :-

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ	اور یہود کے یہ کہنے کے سبب کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو جو خدا کے رسول تھے قتل کر دیا ہے۔ (خدا نے ان کو ملعون کر دیا) انہوں نے نہ تو عیسیٰؑ کو

شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ـ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ٥ (۴/۱۵۷-۱۵۸)	قتل کیا، نہ سُولی پر چڑھایا۔ بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی اور جو لوگ انکے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں پڑے ہیں ان کو پیروی ظن سے سوا مطلق علم نہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انکو اپنی طرف اُٹھالیا اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

اب دیکھئے دُوسری آیت میں عیسیٰؑ کے بجسدہٖ اللہ تعالیٰ کی طرف (جو عرش پر ہے) اُٹھائے جانے کا ذکر ہے۔ اِس معجزہ سے یہودیوں نے اس لیئے انکار کیا کہ وُہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اُسے سُولی پر چڑھا کر مار دیا ہے تو پھر اس کا جسم کیسے آسمانوں کی طرف جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بہ تکرار الفاظ ان کے اس خیال کی تردید کر کے بتایا کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو نہیں بلکہ اس کی شکل سے ملتے جُلتے کسی دُوسرے آدمی کو قتل کیا تھا۔ اور خرقِ عادت کے منکر مسلمان اس لیئے انکار کرتے ہیں کہ وُہ ایک تو اللہ کے لیئے سمت مقرر کرنے کو شرک سمجھتے ہیں اور دُوسرے جسمانی طور پر آسمانوں کی طرف کسی انسان کے چڑھنے کے قائل نہیں کہ یہ نیچر کے خلاف ہے وُہ ان آیات کی تاویل یُوں کرتے ہیں کہ بیشک عیسیٰؑ یہودیوں کے ہاتھوں مقتول نہیں ہوئے مگر بعد میں طبعی طور پر وفات پائی تھی اور رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے معنی یہ کر لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے ہاں درجات بلند کیئے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہی بات تھی تو موت کے ساتھ ہی ساتھ رفعہ اللہ الیہ اور اس کے ساتھ ہی وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ طبعی موت تو ہر کوئی مرتا ہے اور اللہ تعالیٰ درجے بھی ہر مسلمان کے ایک دُوسرے پر بلند کرتا ہے۔ یہاں لفظ عزیز (جس میں شدت، قوۃ، غلبہ، قہر کے سب مفہوم شامل ہیں (مقائیس اللغۃ لابن الفارس) کا لفظ لانے کی کیا تُک تھی؟ پھر اللہ تعالیٰ نے حکیم کی صفت بیان کر کے یہ بھی بتلا دیا کہ عیسیٰؑ کو اپنی طرف اُٹھا لینے کی حکمت بھی وُہی بہتر سمجھتا ہے۔

۴۔ الفاظ کی وضاحت: بعض اوقات آیت کے الفاظ ہی ایسے واضح ہوتے ہیں کہ ان سے معجزہ کی تعیین کے علاوہ کوئی دُوسرا مطلب لینا محال ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ کے پیدائش کے سلسلہ میں ارشاد باری ہے:۔

وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ٥ (۱۹/۲۱)	تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیئے ایک نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ اور یہ بات طے شدہ ہے۔

اِس آیت میں اٰیۃً للناس کے الفاظ بذاتِ خود اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ بن باپ پیدا

ہوئے تھے۔ اگر عیسیٰ کی پیدائش کو بھی عام دستور کے مطابق والدین کی مقاربت کا نتیجہ سمجھا جائے۔ تو یہ عام دستور ہے۔ پھر اس میں لوگوں کے لیئے نشانی کیا ہوئی؟ علاوہ ازیں آیت کا آخری حصہ اس معجزہ کی تائید مزید کر رہا ہے کہ اللہ کے ہاں عیسیٰ کا بن باپ پیدا ہونا ہی مقدر ہے۔

خرقِ عادت اُمور عقل کی روشنی میں

خرقِ عادت اُمور کی اقسام: انسان کی عادت ہے کہ جب کوئی واقعہ عام دستور کے خلاف سُنتا ہے تو اس سے انکار کر دیتا ہے اور اگر بچشم خود دیکھ لے تو حیران رہ جاتا ہے لیکن اگر وہی واقعہ دو تین چار بار پیش آ جائے تو وُہ عادت بن جاتا ہے لہٰذا اس کی حیرانگی یا استعجاب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال تو انسان کی اپنی پیدائش ہے جو ناپاک پانی کے قطرہ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے بار بار توجّہ دلائی ہے لیکن چونکہ یہ عادت مستمرہ بن چکی ہے لہٰذا اس پر کسی حیرت واستعجاب کا ذکر تو درکنار اسے خیال تک بھی نہیں آتا۔

اس کی دُوسری قسم یہ ہے کہ کوئی ایک واقعہ انسانی تاریخ کے کسی خاص دَور میں تو معجزہ سمجھا جاتا ہے لیکن بعد کے ادوار میں وُہ معجزہ نہیں رہتا مثلاً حضرت سلیمانؑ کو یہ معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ ہَوا ان کے تابع تھی اور وُہ ایک ماہ کا سفر ایک پہر میں طے کر لیتے تھے لیکن آج ہوائی جہاز کی دریافت نے اس معجزہ کی اعجازی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر ارسطو یا فیثا غورث کے زمانہ میں کوئی شخص یہ اعجاز پیش کرتا کہ وُہ یُونان میں بیٹھ کر پاکستان میں رہنے والے کسی شخص سے بات چیت کر رہا ہے تو اسے عوام تو درکنار بڑے بڑے حکماء بھی پاگل قرار دیتے۔ لیکن آج ٹیلیفون کی ایجاد نے اس بات کو ممکن العمل بنا دیا ہے۔

اور تیسری قسم وُہ ہے جو عادتِ عامہ یا عادتِ مستمرہ سے ایک مخصوص شکل اختیار کر کے عادتِ خاصہ کی شکل اختیار کر جاتی ہے مثلاً عام دستور یہ ہے کہ بچّہ والدین کی شکل پر پیدا ہوتا ہے اور عموماً ایک دفعہ ایک ہی بچہ پیدا ہوتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی تو بچہ اندھا پیدا ہو جاتا ہے کبھی دو سر والا بھی پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی بیک وقت دو دو، تین تین، چار چار بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ گو یہ عام دستور نہیں تاہم انسان اسے اسلیئے مان لیتا ہے کہ ایسے واقعات بھی کئی بار ظہور پذیر ہو چکے ہیں پھر جس طرح عادتِ عامہ کے لیئے قدرت کا کوئی قانون ہے اسی طرح عادتِ خاصہ کے لیئے بھی قدرت کا کوئی قانون ضرور ہے۔ اگرچہ یہ قانون انسان کی دسترس سے باہر ہے۔

اور چوتھی قسم یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسے واقعات ظہور پذیر ہُوئے جن کا نہ تو بعد میں اعادہ ہُوا، نہ ہی

انسان اس کی کُنہ تک پہنچ سکا لہٰذا بعد میں آنے والے انسان نے ان کا انکار کر دیا۔ ایسے واقعات ہی خرقِ عادت اُمور کہلاتے ہیں۔ اگر ان واقعات کا تعلق کسی نبی سے ہو تو یہ معجزہ کہلاتے ہیں۔ یہ محض اللہ کی قدرت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے اور نسبت بھی اسی کی طرف ہوتی ہے۔ یہ عادت، نیچر، قانونِ قدرت، عامہ ہو یا خاصہ، سے بھی استثناء کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ایسے معجزات کا ذکر قرآنِ کریم میں بے شمار جگہ پر مذکور ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے معجزات یا خرقِ عادت امور کو من وعن قبول کر لینا چاہیئے یا ان کی تاویل پیش کر کے ان کو کسی مخصوص دَور کی علمی سطح تک لے آنا چاہیئے؟ جیسا کہ عقل پرستوں کا شیوہ ہے۔ اب دیکھیئے اس سوال سے پہلے یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وُہ یہ ہے کہ آیا انسان اشیائے کائنات کے خواص اور قوانین کا پُوری طرح احاطہ کر چکا ہے؟ اگر تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو ایسے معجزات کو من وعن تسلیم کر لینا ہی راہِ صواب ہے۔ اس سوال کے جواب میں سر سید احمد خاں جو کم از کم ہندوستان میں عقل پرستوں کے پیشوا تسلیم کیئے گئے ہیں۔ خود بھی لکھتے ہیں:۔

سر سیّد اور معجزات: "قوانینِ قدرت ہم کو معلوم نہیں اور جو معلوم ہیں وُہ نہایت قلیل ہیں اور ان کا علم بھی پُورا نہیں بلکہ ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی عجیب امر واقع ہو اور اس کے وقوع کا کافی ثبوت بھی ہو اور اس کا وقوع معلومہ قانونِ قدرت کے مطابق بھی نہ ہو سکتا ہو اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بغیر دھوکہ وفریب کے فی الواقعہ ہُوا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فی الواقعہ بلاشبہ اس کے وقوع کے لیئے کوئی قانونِ قدرت ہے مگر اس کا علم ہم کو نہیں کہ خلافِ قانون قدرت کوئی امر نہیں ہوتا۔ اور جب وُہ کسی قانونِ قدرت کے مُطابق واقع ہُوا ہے تو وُہ معجزہ نہیں کیونکہ ہر وُہ شخص جس کو وُہ قانون معلوم ہو گیا۔ اس واقعہ کو کر سکے گا۔" (تفسیر القرآن ج ۳ ص ۳۴) .... حکماء وفلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار خواہ کسی وجہ سے کیا ہو۔ ہمارا انکار صرف اس بنا پر نہیں کہ وُہ مخالف عقل کے ہیں اور اس لیئے انکار کرنا ضرور ہے بلکہ ہمارا انکار اس بنا پر ہے۔ کہ قرآن مجید سے معجزات وکرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرقِ عادت یعنی خلافِ فطرت یا خلافِ حقیقت کے امتناع پایا جاتا ہے جس کو ہم مختصر لفظوں میں یُوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر خلافِ قانونِ قدرت نہیں ہوتا۔" (حوالہ ایضاً)

کیا سمجھے آپ سید صاحب معجزہ کا اقرار فرما رہے ہیں یا انکار؟ در اصل آپ کے اقرار میں بھی ہزاروں انکار پوشیدہ ہیں۔ ایک طرف آپ یہ فرماتے ہیں کہ کوئی امر خلافِ قانونِ قدرت نہیں ہوتا دُوسری طرف یہ بھی اعتراف ہے کہ قوانینِ قدرت کا انسان احاطہ نہیں کر سکتا۔ تو اس سے تو معجزات کا اقرار ثابت ہوتا ہے نہ کہ انکار پھر آپ

خلافِ فطرت اور خلافِ حقیقت کو ہم معنی قرار دے کر قرآن کے معجزات کا انکار کر رہے ہیں۔ اب یہ بات آپ کو کون سمجھائے کہ حقیقت اور چیز ہوتی ہے اور فطرت اور چیز۔ قرآن میں مذکورہ واقعات حقیقت کے خلاف نہیں وُہ فی الواقعہ وقوع پذیر ہوئے ہیں مگر قانونِ فطرت کے خلاف ہیں۔ جبھی تو اُنہیں خرقِ عادت کہا جاتا ہے۔

مُنکرینِ معجزات کی دلیل اور اس کا جائزہ:

قوانینِ فطرت کے غیر متبدّل ہونے کے ثبوت میں جو آیت پیش کی جاتی ہے وُہ یہ ہے :۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا ۝ (۳۵/۴۳)

سو تم خُدا کی عادت میں ہرگز تبدّل نہ پاؤ گے اور خُدا کے طریقے میں کبھی تغیّر نہ دیکھو گے۔

اَب سوال یہ ہے کہ خُدا کا وُہ کون سا طریقہ یا قانون ہے جس میں تغیّر و تبدّل ممکن نہیں ؟ قوانینِ قُدرت تو لاتعداد ہیں اور مختلفُ النّوع ہیں۔ کچھ قوانین اجرامِ فلکی کی حرکت اور اُن کی کشش ثقل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ دُوسرے اشیاء کے خواص سے مثلاً مائعات نشیب ہی کیطرف بہتے ہیں اور جم کر سکڑ جاتے ہیں ہوا گرم ہو کر اُوپر اُٹھتی ہے۔ زہر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر کچھ قوانین ایسے ہیں جو اخلاقیات سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو جاندار اشیاء کے طبعی تقاضوں اور حیات و ممات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ قرآن کریم جس " اللہ کے طریقہ " کو غیر متبدّل قرار دیتا ہے۔ وہ کون سی نوع سے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں یہ الفاظ متعدد بار استعمال ہوئے ہیں اور ان سب مقامات کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس سُنّت یا قانون کو غیر متبدّل قرار دیا ہے وہ انسان کے اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے قانون کو غیر متبدّل قرار دیتا ہے یعنی جب کوئی قوم اپنی سرکشی کی بنا پر نبی کو وہاں سے نکلنے پر مجبُور کر دیتی ہے یا اخلاقی پستیوں میں گر جاتی ہے تو وُہ عذاب میں ماخوذ اور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ یہی اللہ کا قانون ہے جس میں تغیّر و تبدّل ناممکن ہے۔ اب متعلقہ آیات مُلاحظہ فرمایئے :۔

(۱)۔ وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا ۝ (۳۵/۴۳)

اور بُری چال کا وبال اس کے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔ یہ لوگ توبس پہلے لوگوں کے طریقہ کے منتظر ہیں۔ سو تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدّل نہ پاؤ گے اور نہ ہی خدا کے طریقے میں تغیر دیکھو گے۔

(۲)۔ وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ

اور قریب تھا کہ یہ لوگ تمہیں زمین (مکہ) سے پھسلا دیں تاکہ تمہیں وہاں سے جلاوطن کر دیں اندریں صُورت یہ

اِلَّا قَلِيْلًا سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۱۷/۷۷)	لوگ بھی تمہارے بعد نہ ٹھہر سکتے مگر تھوڑی مدت۔ جو پیغمبر ہم نے تجھ سے پہلے بھیجے تھے ان کے بارے میں بھی ہمارا یہی طریق رہا ہے اور تم ہمارے طریق میں تغیّر و تبدّل نہ پاؤ گے۔
(۳)۔ مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۰-۶۱)	وہ پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور جان سے مار ڈالے گئے جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں انکے بارے میں بھی ہمارا یہی طریقہ رہا ہے اور تم خُدا کی عادت یا قانون میں تغیّر و تبدّل نہ پاؤ گے۔
(۴)۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۴۸/۲۳)	پھر وہ نہ کسی کو دوست پاتے اور نہ مددگار یہی خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خُدا کی عادت میں تغیّر و تبدّل نہ پاؤ گے۔

مندرجہ بالا جملہ مقامات میں قوموں کی اخلاقیات اور ان کے زوال کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی وہ قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی ممکن نہیں۔

قوانینِ فطرت میں مستثنیات:

رہے دُوسرے قوانینِ فطرت یا قدرت تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ان میں تبدیلی ممکن ہے۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱)۔ عام قانونِ فطرت یہ ہے کہ تندرست والدین کے ہاں انہیں سے ملتا جُلتا بچہ پیدا ہو لیکن کبھی بچہ اندھا پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی لنگڑا لُولا کبھی دو سر والا۔ جو عام قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔

(۲)۔ مائعات کی یہ خاصیت ہے کہ وُہ جم کر سُکڑ جاتے ہیں لیکن پانی اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ پانی مائع ہونے کے باوجود جم کر پھیلتا ہے۔

(۳)۔ زہر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے لیکن کبھی وُہی زہر کسی انسان کے لیئے تریاق بھی بن جاتا ہے۔

(۴)۔ اجرامِ فلکی کی حرکت کے قوانین جو ہمیں لگے بندھے اصُولوں کے مُطابق نظر آتے ہیں۔ تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں بنی نوع انسان کی عمر نہایت قلیل ہے۔ ورنہ اس عظیم کائنات کا وجود میں آنا اور پھر کسی وقت فنا ہو جانا ان قوانین میں تغیّر و تبدّل کی واضح دلیل ہے۔

یہ اور ایسے بے شمار واقعات اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قوانینِ قدرت میں مستثنیات موجود ہیں۔ اگر زہر کسی انسان کے لیئے تریاق بن سکتا ہے تو آگ کسی خاص انسان کیلئے

ٹھنڈی اور سلامتی والی آخر کیوں نہیں بن سکتی؟

ہمارے خیال میں انکارِ معجزات کی وجہ یہ نہیں کہ قوانین فطرت میں استثناء ناممکن ہے کیونکہ ایسے مستثنیات تو اکثر مشاہدہ میں آتے ہی رہتے ہیں۔ بلکہ اس انکار کی تہہ میں وہی ارسطو کا خدا کے متعلق تجریدی تصوّر کارفرما ہے۔ جس نے خدا کو بھی اپنے وضع کردہ قوانین کا پابند بنا کر محض ایک خاموش تماشائی کی حیثیت دیدی ہے پھر ان معتزلین اور ان کے ہم نواؤں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ خُدا کو تو مجبور و بے بس اور قدرت سے عاری تصوّر کرتے ہیں مگر خود تقدیر کے معاملہ میں مختارِ کُل بن بیٹھتے ہیں۔

قدرتِ الٰہی کے دلائل:

اِس نظریہ ارسطو کے برعکس قرآن ایسے خدا کا تصوّر پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے ہر چیز کے وجود و قیام کا باعث ہے۔ ان کی نگرانی کرتا ہے وُہ قادرِ مطلق ہے، خبیر ہے حکیم ہے وُہ اپنے بنائے ہُوئے قوانین کا پابند نہیں بلکہ قوانین اس کے پابند ہیں وُہ جب چاہے اور جیسے چاہے اِن قوانین میں ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ کائنات کی توڑ پھوڑ اور تعمیر سب اس کی مرضی پر منحصر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بادشاہ اپنی مملکت کے لیئے قانون بناتا ہے لیکن جب اِس قانون کی زد اس کی ذات یا اس کے اِقتدار پر پڑتی ہے تو فوراً وُہ ایسے قانون کو بدل دیتا ہے۔ گویا وُہ ایک عام انسان کی طرح مخلوق ہو کر اور تمام طبعی تقاضوں کے سامنے بے بس ہونے کے باوجود بھی وُہ خود قانون کے سامنے مجبور و بے بس ہونا گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ اس قانون کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے تو کیا اللہ جو نہ تو مخلوق ہے اور نہ بے بس و مجبور ہے۔ اپنے قانون کے سامنے ہتھیار ڈال کر بے بس ہو جائے گا؟ ارشادِ باری ہے:۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷/۵۴)	یاد رکھو کہ اگر پیدا اس نے کیا ہے تو قانون یا حکم بھی اسی کا چلے گا۔

اَب اگر پیدائش کا سلسلہ جاری ہے اور نئی نئی چیزیں وجود میں آ رہی ہیں۔ کائنات میں توسیع ہو رہی ہے تو قانون سازی کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ مندرجہ بالا آیت میں ہم نے اَمر کا ترجمہ قانونِ قدرت یا قانونِ فطرت سے کیا ہے جس کی دلیل آیت ذیل ہے:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ (۷/۵۴)	سُورج، چاند اور سیّارے سب اس کے قانون کے تگّے بندھے ہیں۔

اور اِسی قانون کو آج کی زبان میں کشش ثقل، سیّاروں کی باہمی کشش کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ تمام سیارے اپنے اپنے مدار میں حرکت کر رہے ہیں اور ان کی حرکت میں ذرّہ بھر فرق نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ کا تخلیقی اور توسیعی عمل بدستور جاری ہے اور ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ ارشاد باری ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵/۲۹) | وہ ہر آن کسی دھندے میں لگا ہوا ہے!

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ (۵۱/۴۷) | ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے اور ہم ہی اس میں توسیع کرنے والے ہیں۔

اب اگر تخلیق کا عمل جاری ہے تو قانون سازی کا عمل بھی بدستور جاری ہے۔ اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (۳/۱۵۴) | اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ قانون سب کا سب اللہ ہی کے لیے ہے۔

یعنی قوانینِ فطرت جو بن چکے ہیں وہ بھی، جو قابلِ ترمیم، تنسیخ ہیں وہ بھی اور جو نئے بنائے جانیوالے ہیں وہ بھی سب کا اللہ ہی کو اختیار ہے۔

کیا اللہ اپنے قانون کے سامنے مجبور محض ہے؟

اب فرض کیجئے کہ ہم معتزلین اور ان کے ہمنواؤں کے مطابق اللہ تعالیٰ کو اپنے وضع کردہ قوانین کا پابند تصور کر لیتے ہیں تو اس پر مندرجہ ذیل اعتراض وارد ہوتے ہیں:

۱۔ سیاروں کی کھلی فضا میں مسلسل حرکت ان کی باہمی کشش کا نتیجہ بتلایا جاتا ہے لیکن ہم بعض دفعہ دیکھتے ہیں کہ کوئی سیارہ حرکت کرتے کرتے اچانک ٹوٹ کر گرتا اور پھر فضاؤں میں بکھر جاتا ہے لیکن باقی سیاروں کی اپنے مدار پر حرکت کی باقاعدگی میں چنداں فرق نہیں پڑتا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ایک سیارہ کے ٹوٹنے سے یہ نظام شمسی درہم برہم ہو کر فنا ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بالاتر اور مقتدر ہستی بھی موجود ہے جو کسی سیارہ کے فنا ہونے کے باوجود بھی باقی کائنات کو سنبھالے رکھتی ہے اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ (۳۵/۴۱) | خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ پھر اگر وہ ٹل جائیں تو خدا کے علاوہ کوئی ایسی ہستی ہے جو انہیں تھام سکے؟

۲۔ بارش کے لیے قانون مقرر ہیں یعنی سمندر پر سورج کی گرمی سے بخارات پیدا ہو کر اوپر اٹھنا، پھر ان بخارات کو ہواؤں کا کسی سمت اڑائے جانا یہاں تک کہ وہ بخارات کسی سرد منطقہ میں پہنچ جائیں اور پانی بن کر

برسنے لگیں۔ گویا بارش کے عوامل سمندر سے فاصلہ، سطح سمندر سے بلندی، ہواؤں کا رُخ، پہاڑوں کا رُخ اور بلندی ہیں۔ ان قوانین کے تحت کسی ایک خاص مقام پر خاص موسم میں بارش ہر سال یکساں ہونا لازمی ہے۔ مگر مشاہدہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک خاص مقام پر اسی موسم میں ایک سال تو بارشوں کی کثرت سے سیلاب آجاتا ہے اور اگلا سال خشک گزر جاتا ہے یہاں طبعی قوانین کے نتائج میں یہ کمی بیشی اور تبدیلی آخر کیوں واقع ہوتی ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی بالاتر ہستی ان قوانین اور ان کے نتائج میں تبدیلی کا پُورا اختیار رکھتی ہے۔

۳۔ انسان کی پیدائش کا قانون یہ ہے کہ وُہ اپنے والدین کی مثل ہوتا ہے اور ماحول کا اثر قبول کرتا ہُوا آگے بڑھتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ذہنی سطح کے والدین کے ہاں کوئی نابغہ ہستی پیدا ہو جاتی ہے جو خود ماحول کا اثر قبول کرنے کے بجائے پُورے ماحول پر اثر انداز ہو جاتی ہے اور عام قوانینِ فطرت سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ذہنی استعداد اُسے کہاں سے مہیا ہوتی ہے اور سابقہ قوانینِ فطرت کے خلاف کیوں ہوتی ہے؟

۴۔ اسی طرح انسان کے لیئے یہ قانون مقرر ہے کہ وُہ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ اس مادی دنیا میں بھی یہی قانون لاگو ہے اور آخرت میں بھی تو پھر اس آیت کا کیا مطلب ہوا۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (۲۷/۶۲)	بھلا وُہ کون ہے جو بیقرار کی پکار سُنتا اور پھر اس سے تکلیف کو دُور کر دیتا ہے۔

قانونِ قُدرت کے لحاظ سے یہ تکلیف اس کے اپنے ہی کسی عمل کے نتیجہ کے طور پر تھی۔ پھر اس کی دُعا کو کون سُن کر اس کی تکلیف کو دُور کرتا ہے اور اس عمل کے نتیجہ کو ختم کرتا اور کیوں کرتا ہے؟

۵۔ اسی طرح انسان کی زیست کے لیئے یہ قانون ہے کہ اگر وُہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی کریگا تو صحت مند رہے گا اور طبعی عمر پائے گا۔ الّا یہ کہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے لیکن ان قوانین کے علی الرغم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ (۲۱/۴۲)	کہو کہ رات اور دن میں خدا سے تمہاری حفاظت کون کر سکتا ہے؟

اگر خُدا اپنے قوانین کا پابند ہے جو وُہ بنا چکا ہے تو اس کی حفاظت کے کیا معنی؟

یہ چند مثالیں اس عقیدہ باطلہ کے تردید کیلئے کافی ہیں۔ اور اگر انسان اپنی زندگی میں غور کرے تو اسے اور بھی بیشمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ قلب سلیم عطا فرمائے تو قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر ہر آن نظر بھی رکھتا ہے، خبر بھی اور پوری گرفت بھی۔ پھر وہ جیسے چاہے کر دیتا ہے۔

باب ۳

خرقِ عادت اُمور سے انکار کا پس منظر اور اس کی تاریخ

ہستیِ باری تعالیٰ کے متعلق ارسطو کے نظریات: عقل پرستی یا وحی کے مقابلہ میں عقل کی برتری و تفوق کا آغاز دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا جبکہ ہند و یونان کا فلسفہ اسلام کی سادہ تعلیمات پر اثر انداز ہو رہا تھا جس نے ایک طرف تو "رہبانیت" کی راہ کھولی اور دوسری طرف جہمیہ و معتزلہ جیسے عقل پرست فرقوں کو جنم دیا۔ یونانی فلسفہ کے سرخیل افلاطون اور اس کے شاگرد رشید ارسطو تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ارسطو (م ۳۲۲ ق م) کے خدا کے متعلق نظریات کچھ اس طرح کے تھے:۔

"وہ ایک مجرد تصور[1] ہے۔ ایک مکمل اور جامع تصور۔ یہ کائنات جو خالق کی مظہر ہے، نامکمل اور ناقص ہے اور اس کی حمد و ثنا کے ذوق اور اس کی محبت کے جوش میں ارتقاء اور ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ باری تعالیٰ اپنا کوئی مادی وجود نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ علت العلل یا بنیادی علت ہے۔ اس سے کائنات میں حرکت اور نمو پیدا ہوئی ہے۔ بالفاظِ دیگر کائنات کے رنگا رنگ مظاہر اور اس کی حرکت کے پیچھے ایک ایسا تصور کارفرما ہے جو قدیم، قائم بالذات اور سراسر نیکی ہے۔ خدا کے مجرد تصور کے سوائے کوئی شئے قدیم نہیں بلکہ ساری اشیاء حادث ہیں۔ حتیٰ کہ خدا کی صفات بھی حادث اور نامکمل ہیں"

خدا کے متعلق ارسطو کے ان تصورات کو ذرا وضاحت سے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے:۔

۱۔ علت العلل یا ذات برحق مجرد تصور ہے۔

۲۔ وہ مستقل، قائم بالذات، برحق اور قدیم ہے۔

۳۔ وہ جانِ جاں ہے اور ساری کائنات اس کا مظہر ہے۔

---

[1] ارسطو کہتا ہے کہ مٹھاس کا تصور ہم اس بنا پر کرتے ہیں کہ دنیا میں میٹھی چیزیں موجود ہیں اور سرخی اور سفیدی کا بھی اسی وجہ سے شعور رکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت سی چیزیں رنگ کے اعتبار سے سرخ اور سفید ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم کہ سرخی کا تصور کسی شئے کے بغیر ممکن نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سرخی کے تصور کے ساتھ کسی ایک متعین شے یا چند مخصوص اشیاء کا تصور کسی ایسی چیز کے ساتھ ہی کیا جاسکتا ہے جو سرخ ہیں۔ اس سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اصل حقیقت سرخی ہے اور یہی مستقل اور پائیدار ہے اس کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ باقی رہے پیکر محسوس جن میں یہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ سب اعتباری چیزیں ہیں۔

۴۔ وہ اِن سب صفات سے عاری ہے جن کی نسبت انسان کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ صفات حادث ہوتی ہیں اور ذاتِ حق قدیم ہے۔

۵۔ ذاتِ باری نے دُنیا کو پیدا کیا، اسے حرکت دی۔ اسی بنا پر وہ پوری کائنات اور اس کی حرکت کی بنیادی عِلّت ہے۔

۶۔ ساری کائنات اُس کی حمد و ثنا میں منہمک ہو کر اور اس کی محبت سے سرشار ہو کر ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ لیکن یہ ارتقاء اسے کبھی بھی باری تعالیٰ کی طرح کامل نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ کائنات مادی وُجود سے آزاد نہیں ہو سکتی۔" (مذہب وتجدید مذہب از پروفیسر عبدالحمید صدیقی ص ۱۷۴)

گویا ارسطو، اس کے پیروؤں اور اس کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک خالق کائنات کی حیثیت محض ایک گھڑی ساز کی ہے جس نے گھڑی بنا کر اس میں ایک دفعہ کوک بھر دی ہے اور اب یہ گھڑی خود بخود چل رہی ہے۔ خُدا نے کائنات کی تخلیق و ارتقاء کے لیئے جو قانون بنا دیئے ہیں۔ اب وہ ان کا خود بھی پابند بن گیا ہے۔ اسکی حیثیت محض ایک خاموش تماشائی کی ہے۔ اب ان قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہ وُہ کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے شایانِ شان ہے۔

یہی وُہ تصوّر ہے جو اسلام کے عقل پرست فرقوں سے ہوتا ہُوا آج بھی اسی شکل میں موجود ہے۔ جس کا زندہ ثبوت دورِ حاضر میں ادارہ طلوعِ اسلام کی تالیف "کتاب التقدیر" ہے۔

جہمیہ: خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ تا ۱۲۵ھ) کے زمانہ میں ایک شخص جہم بن صفوان ظاہر ہُوا جو ارسطو کے نظریہ ذاتِ باری تعالیٰ سے سخت متاثر تھا۔ وُہ بھی باری تعالیٰ کے متعلق تجریدی تصور کا قائل تھا۔ وُہ بزعم خویش اللہ تعالیٰ کی مکمل تنزیہہ بیان کرتا تھا اور خدا تعالیٰ کی ان صفات کی نفی کرتا تھا جو قرآن وحدیث میں وارد ہیں۔ اس نے تنزیہہ الٰہی میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ بقول امام ابوحنیفہ اس نے اللہ تعالیٰ کو بالکل لاشے اور معدوم بنا دیا[1]۔ وُہ خُدا کے لیئے جہت یا سمت متعین کرنے کو شرک قرار دیتا تھا اور آیات ثم استویٰ علی العرش ﷺ یا الرحمٰن علی العرش استویٰ کی تاویل کر کے عرش سے مُراد حکومت اور استویٰ سے مُراد (غالب آنا) لیتا تھا۔ اسی طرح وُہ خدا کی طرف ہاتھ، پاؤں، چہرہ یا پنڈلی۔ جن کا ذکر قرآن کریم میں صاف طور پر موجود ہے ..... کی نسبت کرنے کو بھی ناجائز قرار دیتا تھا۔ لہٰذا ایسی آیات کو بھی اس نے فلسفیانہ موشگافیوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس کے خیال میں یہ بھی ناممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی سے راضی یا ناراض بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جن آیات میں

---

[1] بخاری کتاب التوحید والرد علی الجہمیہ۔ باب پہلا۔ حاشیہ مولانا وحید الزمان۔

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ یا غضب اللہ علیہم مذکور ہے۔ ان کی بھی وُہ دور از کار تاویلات پیش کر کے خدا تعالیٰ کی صفات سے مکمل "تنزیہہ" کر دیا تھا۔ یہی شخص فرقہ جہمیہ کا بانی قرار پایا۔

مسئلہ تقدیر میں یہ لوگ انسان کو مجبور محض سمجھتے تھے۔ وہ انسان کے ارادہ کو بھی منجانب اللہ تصوّر کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ انسان خود مخلوق خدا ہے لہٰذا مخلوق کے ارادہ کا غیر مخلوق ہونا لازم آتا ہے۔ اسی طرح انسان کے افعال کا خالق بھی خدا ہی ہے۔ انسان کی طرف افعال کی نسبت محض مجازی ہے۔ رہا جزا وسزا کا مسئلہ تو جسطرح افعال جبری ہیں۔ اسی طرح جزاء وسزا بھی جبری ہے یعنی جس طرح انسان جبر کی بنا پر اچھے اور بُرے افعال کرتا ہے اسی طرح جبر ہی کی بنا پر اسے جزا وسزا بھی دی جاتی ہے۔

(مسئلہ جبر وقدر از ابوالاعلیٰ مودودی ص ۵۸)

معتزلین اوران کے عقائد:

اس زمانہ میں ایک اور شخص واصل بن عطاء (۸۰ تا ۱۳۱ھ) کا ظہور ہُوا۔ جہم بن صفوان کی طرح یہ شخص بھی ایک مکتبِ فکر کا بانی تھا جو بعد میں اعتزال کے نام سے مشہور ہُوا۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اس کے عقائد جہم بن صفوان سے ملتے جُلتے تھے۔ یُونانی فکر کا رنگ اس پر بھی غالب تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جہمیہ توانسان کو مجبور محض تصوّر کرتے تھے اور جبر یہ عقائد کے ہمنوا تھے۔ جبکہ واصل بن عطاء انسان ہی کو اپنے افعال کا پُورا ذمہ دار سمجھتا تھا اور قدریہ عقائد کا حامل تھا۔ جہمیہ کی طرح معتزلہ بھی بڑے زور وشور سے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وُہ "توحید خالص" کے قائل ہیں اور باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ باری تعالیٰ یکتا اور قدیم ہے۔ اس معاملہ میں کوئی دُوسری صفت یا چیز اس کی شریک وسہیم نہیں۔ اگر اس کی صفات کو بھی اُسی طرح کی اَزلی اَبدی تسلیم کر لیا جائے تو تعدد قُدما لازم آتا ہے جو شرک ہے چنانچہ یہ لوگ خدا کی اَزلی صفات، قدرت، حیات، سمع، بصر وغیرہ کو اس معنیٰ میں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فی ذاتہٖ عالم، قادر، حی، سمیع اور بصیر ہے۔ اس کی کوئی صفت اس کی ذات پر الگ یا زائد نہیں۔

اَب دیکھئے کہ خدا کے متعلق اِس تجریدی تصوّر سے خدا کی حیثیت محض ریاضی کے ایک کلیہ کی سی رہ جاتی ہے جس کے مطابق ہر سبب لازمی طور پر ایک نتیجہ برآمد کرتا ہے اور علت ومعلول کا یہ بے جان اور ارادہ واختیار سے یکسر عاری نظام اِس کائنات کو میکانکی طور پر چلا رہا ہے۔ لیکن اسلام میں ایسے عقائد ونظریات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام میں خدا کی ذات ستودہ صفات ہے جو کائنات سے گہری محبت رکھتا ہے۔ وُہ صاحب ارادہ اور علیم وبصیر ہے۔ جو کچھ اس کائنات میں ہو رہا ہے نہ صرف وہ اسے اچھی طرح دیکھتا اور جانتا ہے بلکہ ہر آن اسکی نگرانی بھی کر رہا ہے۔ پھر وہ صاحب قدرت بھی ہے۔ کائنات میں ہر طرح کا ردّ عمل اسی کے ارادہ واختیار کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وُہ خود قانون ساز ہے۔ پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

وُہ بے جان قانون ــــ خواہ وہ اس کا اپنا ہی بنایا ہُوا ہو ـــــــ کا پابند نہیں بلکہ قانون اس کا پابند ہے۔ وُہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنی سنتِ جاریہ کے علی الرغم کسی مُردے کو زندہ کر دے۔ آگ میں برودت کی تاثیر پیدا کر دے معروف سلسلہ توالد و تناسل کے علاوہ کسی دُوسرے ذریعہ سے کوئی جاندار مخلوق پیدا کر دے۔ انسان جب تک ایسی حیّ و قیوم ہستی پر ایمان نہیں لاتا اسے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ریاضی کے لگے بندھے فارمولوں، علت و معلول کی بے جان کڑیوں یا مجرد تصور سے اخلاق اور رُوحانیت کے تقاضے کبھی پُورے نہیں ہو سکتے گویا معتزلین نے ایک طرف تو خدا کو معطل بنا دیا اور دُوسری طرف انسان کو مکمل خود مختار بنا دیا۔

جہمیہ اور معتزلہ کے عقائد کو مختصراً تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) عقل کی برتری و تفوق: یہ بات ان کے عقیدہ کا جزوِ لاینفک ہے۔ انہوں نے یونانی افکار سے ذہنی طور پر شکست کھا کر اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ شریعت میں فیصلہ کُن حیثیت رسُول کے بجائے عقل کو حاصل ہونی چاہیئے۔ بلا شبہ ہر انسان اسلام لانے تک تو مختار ہے کہ کہ اگر چاہے تو اسے قبول کرے چاہے تو ردّ کر دے۔ مگر اسلام لانے کے بعد اسلام عقل اور آزادیٔ فکر کو کُھلا نہیں چھوڑ دیتا۔ بلکہ عقل کو وحی کے تابع رہ کر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ بظاہر یہ لوگ بھی وحی الٰہی کے تابع رہنے کے قائل تھے، مگر عملاً ہر اس چیز سے انکار کر دیتے تھے جو ان کی عقل اور فلسفہ کے معیار پر پُوری نہ اُترتی ہو۔ چنانچہ انہوں نے تمام خرقِ عادت امور، انبیاء کے معجزات، اور حوضِ کوثر یا پلصراط وغیرہ عقائد کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا انکی دور از کار تاویلات پیش کر دیں۔

(۲) صفاتِ باری تعالیٰ: اسی عقل کی رہنمائی میں انہوں نے خدا کے متعلق تجریدی تصوّر قائم کیا اور اللہ تعالیٰ کو کارگاہِ کائنات سے معطل قرار دے دیا۔ پھر صفات کو اس سے علیحدہ اور حادث تسلیم کیا۔ وُہ قرآن کو مخلوق اسی بنا پر تسلیم کرتے تھے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور کلام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات حادث ہیں لہٰذا قرآن بھی مخلوق ٹھہرا۔ اب جو شخص قرآن کو غیر مخلوق کہتا تو وُہ اسے مشرک اور گردن زدنی قرار دیتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسی مسئلہ میں عباسی خلفاء کے حکم سے ایک طویل مدت قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ پھر یہ لوگ قرآن میں ناسخ و منسوخ کے بھی قائل نہ تھے وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ اس سے خُدا کے علم میں تنقیص لازم آتی ہے۔

(۳) مسئلہ جبر و قدر: اس مسئلہ میں جہمیہ اور معتزلہ براہِ راست ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ جہمیہ انسان کو مجبورِ محض کہتے تھے جبکہ معتزلہ اسے مختار مطلق قرار دیتے تھے۔ اعتدال کی وُہ راہ جو اسلام نے بتلائی تھی نہ ادھر تھی نہ اُدھر۔

عوام میں اپنے عقائد کو مقبول بنانے کے لیئے ان کا طریق کار یہ تھا کہ جو حدیث اُن کے نظریہ کے خلاف ہوتی۔ اس کا انکار کر دیتے تھے۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب احادیث کے مستند مجموعے مدوّن نہ ہوئے تھے۔ اور نہ ہی جرح وتعدیل کے قانون مرتب ہوئے تھے نیز موضوع احادیث کی بھرمار تھی۔ لہٰذا انہیں کسی خلاف عقیدہ حدیث سے انکار کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔ باقی رہا قرآن تو اس کی اپنے نظریہ کے مطابق تاویل کر لیتے تھے۔ البتہ تقدیر کے مسئلہ میں وُہ حدیثیں جو جہمیہ کے خیال کے مطابق بالکل درست ہوتیں وہی معتزلہ کے نزدیک قابل تاویل ہوتیں۔ اسی طرح جو آیات انسان کو خود مختار بتلاتی تھیں معتزلہ انہیں بعینہٖ تسلیم کر لیتے اور جہمیہ تاویل کر لیتے تھے اور جو آیات انسان کو مجبور ظاہر کرتی ہیں اسے جہمیہ بعینہٖ تسلیم کر لیتے اور معتزلہ تاویل کر لیتے تھے۔

ان لوگوں کے عقائد ایسے گمراہ کُن تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے انہیں مردُود قرار دیا اور مسلمانوں میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا۔ جنہوں نے اسی عقل و فلسفہ کے ہتھیار سے آراستہ ہو کر اسلام کا دفاع کیا اور ان عقائد کو خلاف عقل ثابت کیا۔ یہ گروہ متکلمین کہلائے۔ اس گروہ میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

معتزلین کا عروج وزوال:

جہمیہ فرقہ تو جلد ہی اپنے باطل افکار کی وجہ سے اپنا وجود کھو بیٹھا۔ البتہ معتزلہ کے لیئے ایک ایسی وجہ پیدا ہو گئی جو اس کے لیئے شہرت دوام کا باعث بن گئی۔ عباسی خلیفہ منصور بذاتِ خود واصل بن عطاء کے عقائد و نظریات سے متاثر تھا لیکن اس نے ان عقائد و نظریات کو اپنی ذات تک محدود رکھا۔ بعد میں یہی عقائد عباسی خلفاء میں وراثتاً منتقل ہوتے رہے۔ تاآنکہ مامون الرشید کا دور (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) آیا۔ تو ان عقائد نے سنگین نوعیت اختیار کر لی۔ مامون خود پکا معتزلی تھا لہٰذا اس نے جبراً یہ عقائد مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں کو جو قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے تھے۔ ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔ ان کی شہادت ناقابل قبول قرار پائی۔ مامون نے کئی ایسے مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں سے تہ تیغ بھی کیا۔ اکثر علماء اس دباؤ کے تحت مامون کو اس مسئلہ کا گول مول سا جواب دے کر اپنی جان بچا لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کو بھی اسی غرض سے بغداد بلایا گیا۔ مامون کے خادمانِ خاص میں سے ایک شخص امام صاحب کا دلی طور پر معتقد تھا۔ اس نے پیشگی امام صاحب کے قافلہ کو اطلاع بھیجدی کہ مامون نے قتل کے ارادہ سے آپ کو بُلایا ہے لیکن آپ کے پائے استقلال میں مطلق لغزش نہ آئی۔ البتہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جو قبول ہو گئی۔ مامون پر ایسا شدید تپ لرزہ طاری ہوا کہ ہزار کوششوں کے باوجود جانبر نہ ہو سکا۔ اور امام صاحب کا قافلہ راستہ سے ہی واپس بھیج دیا گیا۔

بعد کے خلفاء میں ان معتزلی عقائد کی وُہ شدت نہ رہی۔ تاہم امام صاحب موصوف نے تقریباً بیس سال قید و بند

کی سختیاں جھیلیں اور پشت پر کوڑے کھائے ۔ آپ اپنی جان پر یہ ظلم وستم سہتے رہے لیکن دین میں یہ الحاد کسی قیمت پر گوارا نہ کیا۔ بالآخر واثق باللہ (۲۲۲ - ۲۳۶ ھ) کا دور آیا ۔ یہ متبع سنت خلیفہ تھا لہٰذا اس نے آپ کو باعزت طور پر رہا کر دیا۔ اس طرح جب اعتزال سے حکومت کی پشت پناہی ختم ہوئی جو اس کا آخری سہارا تھا تو یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو پھر سے زندہ کر دیا۔ اگر خدانخواستہ اس وقت امام موصوف استقلال کا یہ نمونہ پیش نہ فرماتے تو شاید آج تاریخ اسلام کچھ اور ہوتی۔

دوسرا دور اور سر سیّد احمد خاں

بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی نظریات کا دوسرا دور تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ لیکن دوسری صدی ہجری کی بہ نسبت حالات بہت مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے اور انہیں سیاسی غلبہ حاصل تھا اور جن فلسفوں سے انہیں سابقہ پیش آیا تھا وہ مفتوح ومغلوب قوموں کا فلسفہ تھا اس وجہ سے ان فلسفوں کا حملہ مسلمانوں پر اجتماعی طور پر بہت ہلکا ثابت ہوا۔ اس کے برعکس تیرھویں صدی ہجری میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جب مسلمان ہر میدان میں پٹ چکا تھا۔ اس کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ معاشی لحاظ سے انہیں کچل ڈالا گیا تھا۔ اُن کا نظامِ تعلیم درہم برہم ہو چکا تھا اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی، سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلّط کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں فاتحوں کے فلسفے اور سائنس نے ان کو معتزلہ کی نسبت ہزار درجہ زیادہ مرعوب کر دیا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو افکار ونظریات درآمد ہو رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں۔ ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقید کر کے حق وباطل کا فیصلہ کرنا تاریک خیالی ہے اور زمانہ کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہی ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال لیا جائے۔

دوسرا فرق یہ پڑا کہ معتزلین خود صاحب علم لوگ تھے۔ عربی زبان اور عربی ادب میں پوری دسترس رکھتے تھے اور ان کو سابقہ بھی ایسے لوگوں سے پڑا تھا جن کی علمی زبان عربی تھی۔ عام لوگوں کا بھی تعلیمی معیار بلند تھا۔ علمائے دین ہر طرف موجود تھے لہٰذا معتزلین نہایت سنبھل کر بات کرتے تھے وہ صرف اس حدیث کی تاویل کرتے تھے جو ان کے عقائد سے ٹکراتی ہو۔ عام حیثیت سے وہ حجیت حدیث کے قائل تھے۔ مگر یہ دور ایسا ہے جس میں معترضین کا سرمایۂ دین بیشتر مستشرقین مغرب کا مرہون منت ہے اور عوام کی علمی سطح بھی انتہائی پست ہے۔ لہٰذا موجودہ حملہ معتزلین کے حملہ سے دوگونہ وجوہ کی بنا پر شدید تر ہے۔

آپ کے مخصوص نظریات و عقائد: برِّصغیر پاک و ہند میں اس دَور کے سرخیل سر سیّد احمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) ہیں۔ آپ نے مغرب میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس دَور میں یورپ صرف اسی بات کو ماننے پر تیار تھا۔ جو عقل و تجربہ کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہو اور ہر وُہ بات جو خارقِ عادت یا فوق الفطرت (SUPPER - NATURAL) ہو۔ اہلِ مغرب کے ہاں ناممکن الوقوع اور خلافِ عقل سمجھ کر ردّ کر دی جاتی تھی۔

دُوسرے سر چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) کا نظریۂ اِرتقاء بھی منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ یہ سوال پہلے بھی فلاسفروں نے پیدا کیا تھا کہ آیا انسان اولادِ ارتقاء ہے یا اس کی پیدائش کسی دُوسری نوعیت سے ہوئی ہے ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں ایک کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPICIES) لکھ کر یہ نظریہ مدوّن طور پر پیش کیا کہ انسان فی الواقع اولادِ ارتقاء ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ میں الگ کسی مضمون میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ بہر دست یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ نظریہ انسان کو دہریّت کی طرف لے جاتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈارون خود پہلے خدا پرست تھا، پھر وُہ "لاادریت" کے مقام پر آگیا اور آخر میں دہریہ ہو گیا۔ اسی وجہ سے یہ نظریہ کمیونسٹوں میں مقبول ہُوا اور وہ اس کا پرچار بھی کرتے ہیں۔

تیسرے یہ دَور خالص مادیّت پرستی کا دَور تھا۔ ہر کام کے زیبا اور نازیبا ہونے کا معیار دنیوی نفع و نقصان بن گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس تہذیبِ نو نے مساواتِ مرد و زن کا نعرہ لگا کر کئی قسم کے مسائل کھڑے کر دیئے تھے جو اسلامی تعلیمات سے براہِ راست ٹکراتے تھے۔

سر سیّد ان تمام افکار و نظریات سے شدید متاثر تھے۔ اور بعض خالص مادّی وجوہ کی بنا پر مُسلمانوں کی بھلائی اس بات میں سمجھتے تھے کہ مسلمان اس تہذیب و تمدّن کو جُوں کا توں اپنا لیں۔ اس غرض کے لیئے آپ نے دو گونہ اقدام کئے۔ ایک تو ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ مسلم کالج کی بنا ڈالی اور دُوسرے اسی دَور میں تفسیر القرآن لکھ کر اپنے افکار و نظریات کو کھُل کر قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس دو گونہ اقدام سے آپ نے مسلمانوں کی نئی نسل میں مغربی افکار و نظریات بھرنے اور شریعت اسلامیہ کا حُلیہ بگاڑنے کی جو خدمت سرانجام دی۔ اس پر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنچ گم ہر طرف دھُواں ہی دھُواں   وائے بر سعی سیّد احمد خاں

اس تفسیر میں آپ نے :-

۱۔ انبیاء کے معجزات سے یا تو سرے سے ہی انکار کر دیا یا ایسی تاویل پیش کی کہ وُہ معجزہ ہی نہ رہے۔ اگرچہ یہ تاویل بجائے خود کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو۔

۲. معجزات کے علاوہ باقی خارق عادت امور میں، جو قرآن میں مذکور ہیں بھی ایسی ہی تاویلات پیش کیں جیسے جنّت اور دوزخ کی کیفیات کہ

۳. ڈارون کے نظریہ سے متاثر ہو کر حضرت آدم کے فرد واحد یا ابوالبشر یا نبی ہونے سے انکار کر دیا اور انہیں بنی نوع انسان کا نمائندہ قرار دیا نیز فرشتوں اور ابلیس کے خارجی وجود سے بھی انکار کیا کیونکہ وُہ عقل و تجربہ کی میزان پر پُورے نہ اُترتے تھے۔

۴. مسائل حاضرہ پر قلم اُٹھا کر موجودہ تہذیب کی ہم آہنگی میں اسلامی تعلیمات کا حلیہ کچھ اس طرح بگاڑا کہ بعض عقائد و نظریات کی جڑیں تک ہلا دیں۔

اب ہم ان باتوں کے ثبوت میں آپ کے چند اقتباسات پیش کریں گے۔

جدید علم کلام کی ضرورت اور خصوصیات:

"اس زمانہ میں ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے۔ جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کو باطل ثابت کر دیں یا پھر انہیں اسلام کے مطابق کر دکھائیں ...... میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں۔ اور وُہ پوری کوشش ۔ حال کے علم طبعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہ گار اور یقیناً گنہ گار ہوں گے"۔

(پاکستان کا معمار اوّل سرسیّد ص ۵۵ مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام لاہور)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوا کہ سرسیّد صاحب کے خیال میں :۔

۱. موجودہ علوم طبیعی اور فلسفہ کا یا تو بطلان ثابت کرنا یا پھر انہیں اسلام کے مطابق کر دکھانا ایک بہت بڑا دینی فریضہ ہے۔

۲. جو لوگ اہلیت رکھنے کے باوجود ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتے وہ گنہ گار ہیں۔

اور سید صاحب پہلا کام تو نہ کر سکے البتہ دُوسرے کام کو کما حقہ سرانجام دے کر بزعم خویش دینی فریضہ سے بھی سُبکدوش ہو گئے اور گناہ سے بھی بچ گئے۔

احادیث، تفاسیر اور فقہ سب ناقابل حجت ہیں:

حیاتِ جاوید کے مصنّف حالی مرحوم، سرسیّد کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہُوئے فرماتے ہیں :۔

"اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصّہ جس کو تمام مسلمان مُلہم من اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمان کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح نبی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف وُہ حصّہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ جس میں جوبات مسائل

فلسفہ اور حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ" کہہ کر اپنے جدید علم کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعہ حدیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب دہ خود علماء مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں نہ کہ اسلام' اپنی بحث سے خارج کر دیا۔ اسی اصول کو ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا"۔ (حیات جاوید بحوالہ پاکستان کا معمار اوّل صفحہ ۵۷)

تفسیر قرآن اور نیچر و فلسفہ:

پھر یہی حیات جاوید کے مصنف آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"ضروری تھا کہ قرآن مجید کی ہدایتیں اس طرح بیان کی جائیں کہ اس سے ایک صحرائی اُونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط برابر فائدہ اُٹھائیں۔ قرآن مجید ہی ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدو اور ایک مقدس مولوی اس کے معانی سے جیسی ہدایت پاتا ہے' ایسا ہی ایک فلاسفر انہی الفاظ کے مفہوم سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی نقطہ کو نیچر یا فلسفہ کے خلاف نہیں پاتا"۔ (ایضاً ص ۵۸)

ان اقتباسات سے آپ کی تفسیر کا انداز کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ کوئی حدیث، تفسیر، کسی امام کی فقہ آپ تفسیر کے کام میں آڑے نہیں آسکتی پھر جب یہ راستہ صاف ہو گیا اور آئندہ کا لائحہ عمل یہ ہے کہ آپ قرآن کو فلسفہ اور نیچر کے مطابق ثابت کر دکھانے کا تہیہ کر اُٹھے اور اسے کار ثواب سمجھ کر اور گناہ سے بچنے کی خاطر اس کام کو سرانجام دیا۔ اب اس تفسیر میں جو کچھ مواد ہو گا اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ نتیجۃً مسلمانوں کے تمام فرقوں نے بالاتفاق سرسید پر کفر کا فتوے لگا دیا۔ ادارہ طلوع اسلام اس فتویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے کہ :-

سرسید پر جمہور علمائے اُمت کی طرف سے کفر کا فتویٰ:

"طرفہ تماشا یہ ہے کہ مختلف مذہبی فرقوں کے وُہ اجارہ دار جو دین خدا کے کسی اصول پر کبھی متفق نہ ہو سکے اور ہمیشہ دُوسرے فرقہ کو کافر سمجھا کیئے ان کا اجماع ہوتا ہے تو اس دیوانۂ ملت کی تکفیر پر جس نے کڑے اور نازک مرحلے پر پوری ملت کو موت سے بچا کر نئی زندگی عطا کی"۔ (پاکستان کا معمار اوّل ص ۸۳)

اب دیکھئے جو اس دیوانہ ملت نے قوم کو نئی زندگی بخشی وہ یہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل کو مغربی تعلیم و تہذیب کی گود میں پھینک کر سرکاری دفاتر میں چند ملازمتوں کے حصول کے قابل بنا دیا یا انگریز کے ماتحت ملکی

سیاست میں مسلمانوں کے حصہ رسدی کے لیئے کوشش کی۔ بحیثیت قوم انہوں نے مسلمانوں کی بھی خدمت سرانجام دی تھی۔ اس کے مقابلہ میں انہوں نے "اسلام" کی جو خدمت سرانجام دی وہ بھی پوری ملت کے سامنے تھی۔ ملت کے بیشتر فرقوں کا آپ کے کفر کے فتویٰ پر اجماع اس بات کی دلیل ہے کہ سید صاحب اسلام کے اصولی عقائد و نظریات پر حملہ آور ہوئے تھے اور اس بات کی بھی کہ آج کے گئے گزرے دورِ انحطاط میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کو مادی فائدے کی بجائے دین کی حفاظت عزیز تر ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی ایک فرقہ کا دوسرے کو کافر سمجھنا اور بات ہے اور اکثر فرقوں کا مل کر کسی ایک شخص یا فرقہ کے متعلق کفر کا فتویٰ متفقہ طور پر صادر کرنا اور بات ہے۔ جب اکثر فرقوں کا اجماع ہو جائے تو اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی جیسے منصور حلاج پر کفر اور قتل کا فتویٰ یا مرزا قادیانی پر کفر کا فتویٰ وغیرہ۔

طلوعِ اسلام: سرسید نے جس الحاد کا بیج بویا تھا۔ بحمد اللہ مسلمانوں کی اکثریت اس سے محفوظ رہی تاہم معدودے چند افراد آپ کے افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ادارہ طلوعِ اسلام نے نہ صرف یہ کہ آپ کی جانشینی کا حق ادا کیا ہے بلکہ الحاد کے کئی نئے دروازے بھی کھول دیئے ہیں۔ چنانچہ ادارہ مذکور کے مدیر جناب چودھری غلام احمد پرویز صاحب پر بھی اُمت نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔

پرویزی جماعت کے ایک سرگرم رکن جناب محمد علی صاحب بلوچ۔ بی اے جو غالباً بعد میں آپ کے ردیہ سے کچھ متنفر ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

پرویز صاحب پر علمائے اُمت کا متفقہ فتویٰ کفر:

"جناب پرویز صاحب کے خلاف جب پورے پاکستان کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا تو موصوف (پرویز صاحب) نے لکھا تھا:۔

اس سے بھی بڑھ کر ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات کو (یا کسی اور کو) یہ اتھارٹی کہاں سے مل جاتی ہے کہ وہ کسی کے کفر اور اسلام کا فتویٰ صادر کریں؟ علماء کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جسے چاہے کافر قرار دے دے"۔ (پمفلٹ کافر گری ص ۲۳)

" تو کیا جناب پرویز صاحب یہ بتانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے کہ خود پرویز صاحب کو کسی دینی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھے بغیر ہی یہ اتھارٹی کہاں سے حاصل ہو گئی ہے اور وہ جسے ان کا جی چاہے منافق بتادیں اور لوگوں کے خلاف نفاق کا فتویٰ صادر فرما دیں"۔ (حدیثِ دل گداز سے ص ۲۳-۲۴)

یہ تو خیر جناب محمد علی صاحب اور پرویز صاحب کا جماعتی معاملہ تھا۔ ہم بھی پرویز صاحب سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ کہ آپ کو کسی دینی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھ لینے کے بغیر ہی یہ اتھارٹی کیسے حاصل ہوگئی کہ آپ اپنے مزعومہ "نظام ربوبیت" سے انکار کرنے والوں کو کافر قرار دے دیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵)

یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظام ربوبیت سے انکار کرتے ہیں اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں سوان کے پروگرام بظاہر بڑے خوش آیند نظر آتے ہیں لیکن ان کے ٹھوس نتائج کبھی مرتب نہیں ہوسکتے۔ قیام انسانیت کے پروگرام میں ان کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

حافظ عنایت اللہ اثری: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ابتداءً صحیح معنوں میں اہلحدیث تھے۔ سر سید اور بعض دوسرے حضرات کی تصانیف کے مطالعہ سے آپ کے ذہن میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ چنانچہ اسی کتاب بیان المختار ــــ جس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور آپ کی زندگی کے بعد طبع ہوا ہے ــــ کے پہلے ایڈیشن میں آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کا خدا کی قدرت کاملہ سے بن باپ پیدا ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے ایک کتاب عیون زمزم لکھی جو شاید آپ کی زندگی کی آخری تصنیف ہے اس کتاب میں آپ نے عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ مجھے اسی سلسلہ میں اس کتاب کے مطالعہ سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپ عیون زمزم میں خود لکھتے ہیں:۔

"بیان المختار میں میں نے اس (متفق علیہ حدیث) کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ کوئی عورت جس نے بے شوہر بچہ جنا ہے وہ مس شیطان (زانی) سے محفوظ نہیں اور اس کی مس سے جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ حلال زادہ نہیں۔ ہاں عیسیٰ اور آپ کی والدہ ماجدہ اس کلیہ سے باہر ہے"۔ ....

انبیائے کرام کو اس زد سے بچانے کے لیئے میں نے یہ ترجمہ کر دیا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ قدرت خدا کے بہانہ پر سارا نزلہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر گرا دیا ہے۔ اللہ پاک مجھے معاف فرمائے"۔ (عیون زمزم ۹۷-۹۸ صفحہ)

ذہنی تبدیلی کا سبب: اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اثری صاحب کے ذہن میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی اس کا جواب آپ اس کتاب میں یوں دیتے ہیں:۔

"مولوی امام الدین صاحب گجراتی نے اپنے رسالہ" التنقیح فی ولادت المسیح" میں موصوف کی بے پدری پیدائش کا انکار فرما کر پدر ثابت کیا ہے اور دلائل میں سر سید مرحوم کی تفسیر کا انتخاب فرمایا ہے اور صد" پہ مرزا قادیانی کا ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے موصوف کی وفات پر تو (اپنی غرض کی بنا پر)

ندائے غیب اور مجدّدِ زمان:

اس شاگردِ رشید نے "گفت ہاتف" کہہ کر اثری صاحب کے ساری عمر کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ کیونکہ یہ خرقِ عادت امر ہے اور اثری صاحب اپنی عمر کے آخر میں کم ازکم خرقِ عادت اُمور سے انکار کے معاملہ میں اپنے سب پیشروؤں سے سبقت لے گئے تھے۔ چنانچہ قصہ مریم میں جہاں فناداھا مِن تحتھا کا ذکر آتا ہے تو اثری صاحب فرماتے ہیں کہ ایک قرأت فناداھا مَنْ تَحْتَھَا بھی ہے۔ یعنی جو شخص کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھا کھجوریں بیچ رہا تھا۔ اس نے آواز دی تھی۔ یہ قرأت اگر تھی بھی تو وہ دورِ عثمانی کے بعد سے متروک ہو چکی لیکن اثری صاحب کو یہی قرأت اچھا کام دے سکتی تھی لہٰذا اختیار فرمالیا کہ اس سے کم ازکم "ندائے غیب" کا قصہ تو ختم ہو جاتا ہے۔ اب اثری صاحب کی وفات کے بعد ان کے شاگرد "گفت ہاتف" سے آپ کو چودھویں صدی کے مجدّد ثابت کر رہے ہیں۔ تو اب اس غلطی کی اصلاح کون کرے گا؟

اور ہمارا خیال ہے کہ اگر افضل صاحب ان اشعار کو کسی باذوق شاعر سے درست کروا لیتے تو بہتر ہوتا کیونکہ آخری مصرعہ "مولوی عنایت اللہ اثری" بحر پر پورا نہ اُترنے کے علاوہ سلاست سے بھی عاری ہے۔

چونکہ میں نے پہلے آپ کی کتاب عیون زمزم ہی دیکھی تھی۔ لہٰذا پہلے اسی کا جواب حصہ دوم کی شکل میں حاضرِ خدمت ہے پھر حصہ سوم میں بیان المختار پر تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

بہت زور دیا ہے مگر اس کے دوسرے ذیلی ستون ولادت بے پدری کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ بلکہ اس کی تصدیق فرمائی ہے .... مولوی امام الدین صاحب نے اس جگہ یُوں بھی تجویز فرمایا ہے کہ "اب ضرورت زمانہ کسی دُوسرے مجدّد الوقت اور مجتہد الزماں اسلامی عالم کے انتظار میں ہے۔ جو ولادت مسیح کا مسئلہ بھی[1] صاف صاف دُنیا کو منوائے۔ سو بظاہر تو کوئی ایسا عالم با عمل نظر نہیں آتا۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔" (عیونِ زمزم ص۱۹۲)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

(۱)۔ عیسیٰؑ کو بے پدر بتانے کا آغاز سرسید نے کیا۔ امام الدین گجراتی۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اثری صاحب نے انہی کے دلائل سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ اثری صاحب نے سرسید کو بڑی تکریم سے سرسید مرحوم و مغفور لکھ کر جا بجا ان کے اقتباسات نقل فرمائے ہیں۔ (دیکھیے ص ۱۳۸، ۱۴۴ وغیرہ)

(۲)۔ مرزا قادیانی کو کرسی درکار تھی۔ لہٰذا اس نے محض وفات عیسیٰ پر زور دیا ہے۔

(۳)۔ اثری صاحب کو مجدّد الوقت اور مجتہد الزمان بننے کی ہوس میدانِ خارزار میں کھینچ لائی ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ اقتباس طلب و اجاب کے عنوان کے تحت درج فرمایا ہے جس کا واضح مطلب ہے کہ امام الدین گجراتی نے ایک بات کی آرزو کی تو آپ نے اس پر آمنّا کہا۔ جو کچھ بھی ہُوا ہم بہرحال یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اثری صاحب نے اس کتاب پر تیس سال سے زیادہ عرصہ صرف کر کے مغز ماری کی ہے۔ اس نظریہ پر ممکنہ اعتراضات سوچتے رہے اور ان کے جوابات تلاش کرتے رہے ہیں۔ ساری کتاب کا رنگ مناظرانہ ہے۔ خود ہی سوال اُٹھاتے ہیں پھر اس کا جواب دیتے جاتے ہیں اور جس قسم کی چالاکیاں مناظر حضرات کیا کرتے ہیں۔ آپ نے ان میں کسی میں کوتاہی نہیں فرمائی۔

آپ کے مجدّد الوقت اور مجتہد الزمان بننے یا کہلانے کی آرزو آپ کی زندگی میں تو پُوری نہ ہو سکی تاہم آپکی وفات کے بعد آپ کے کسی شاگرد عبداللطیف افضل نے آپ کی اس آرزو کو پُورا کر دیا۔ افضل صاحب موصوف نے آپکی تاریخ وفات سے متعلق دو اشعار لکھے جو اسی مجموعہ بیان المختار کے ص۲ کی زینت بنے ہیں یہ اشعار درج ذیل ہیں:۔

گفت ہاتف بگوش من بشنو * باخبر شو اگر نہ دانی!

ایں مجدّد ز صدِ چہار دہم[۱۴] * مولوی عنایت اللہ اثری

ترجمہ: ہاتف نے کہا میرے کان سے سُن۔ اگر تجھے پتہ نہیں تو سُن لے کہ مولوی عنایت اللہ اثری چودھویں صدی کے مجدّد ہیں۔

[1] گویا وفات مسیح کا مسئلہ تو مرزا غلام احمد قادیانی کی مہربانی سے طے ہو گیا۔ اب ولادت کا مسئلہ باقی ہے

حصّۂ دوم
ولادتِ عیسیٰ ابنِ مریم
بجواب
عیونِ زمزم

باب ۴

① ولادتِ عیسیٰ علیہ السّلام اور قرانِ کریم

عیسیٰ علیہ السلام کی پُوری زندگی خرقِ عادت اُمور سے بھرپُور ہے۔ آپ کی پیدائش بھی خرقِ عادات طور پر ہوئی۔ پھر آپ نے گود میں ہی لوگوں سے کلام بھی کیا۔ آپ مٹی سے پرندکی شکل بنا کر اس میں پھُونکتے تو سچ مُچ کا پرندہ بن جاتا۔ مادرزاد اندھے اور کوڑھی پر ہاتھ پھیرتے تو وُہ تندرست ہو جاتا۔ کسی مُردے کو قُم باذن اللہ کہتے تو وُہ جی اُٹھتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ آپ کی وفات بھی طبعی نہیں ہُوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمانوں پر اُٹھا لیا۔ یہ سب باتیں عقل پرستوں کے ذہن کے خلاف واقع ہوئی ہیں۔ لہٰذا آپ انہیں کیونکر تسلیم کر سکتے تھے۔

تالیف عیون زمزم

اور حضرت عیسیٰ کی خرقِ عادت پیدائش کے مسلہ نے تو اثری صاحب کو اتنا پریشان کر دیا کہ اس کے لیئے آپ کو ایک الگ کتاب "عیون زمزم" لکھنا پڑی۔ اس کتاب کی تصنیف کے محرک جذبہ کا تو ہم کسی اَور مقام پر ذکر کرآئے ہیں۔ سرِ دست یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں تفسیر بالرّائے اور غلط تاویلات کا جو نمونہ آپ نے پیش فرمایا ہے اُسے دیکھ کر علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آجاتے ہیں

زمن برصوفی و مُلاّ سلامے ❊ کہ پیغام خدا گفتند مارا!!

ولے تاویلِ شاں درحیرت انداخت ❊ خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

ترجمہ: میری طرف سے صُوفی اور مُلاّ پر سلام کہ انہوں نے ہمیں اللہ کا پیغام سُنایا لیکن ان کی تاویل کا انداز ایسا تھا جس نے خدا (پیغام بھیجنے والے) اور جبرئیل (پیغام لانے والے) اور مصطفیٰ (پیغام لوگوں تک پہنچانیوالے) سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ کہ ہم نے پیغام دیا کیا تھا اور اس صُوفی مُلاّ نے اس کو بنا کیا دیا ہے؟

اَور فی الواقعہ اثری صاحب نے اس میدان میں سب اگلے پچھلے مفسرین کے کان کتر ڈالے ہیں۔ کتاب کا رنگ مناظرانہ ہے۔ خود ہی ایک سوال اُٹھاتے ہیں۔ پھر اس کا جواب دیتے ہیں۔ سوال بھی اپنا، جواب بھی اپنا، قلم بھی اپنا، علم بھی اپنا، لغت بھی اپنا۔ جدھر چاہا موڑ لیا۔ ایسے مواقع پر مناظر قسم کے لوگ جس طرح کی عیاریاں اور شعبدہ بازیاں دکھلا سکتے ہیں۔ وُہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اثری صاحب نے کتاب عیون زمزم کی تالیف میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی۔ اور اسی لیئے غالباً فہرست مضامین مرتب کرنا اور اسے درج کرنا بھی گوارا نہیں فرمایا۔ ابتدا میں ہی سب سے پہلے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ میں نے آیۃ للسائلین میں ولادت

مسیح" پر کچھ نہیں لکھا۔ پھر تیس سال بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا پھر بھی اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا کہ اس کے لیے بڑی وسیع تفصیل کی ضرورت تھی۔ البتہ اس دوسرے ایڈیشن میں "ولادت مسیح" کے موضوع پر علیحدہ تصنیف کا وعدہ ضرور فرمایا تھا جسے مزید چند سال کے غور و خوض کے بعد آپ نے شائع کیا ہے۔

عیون زمزم کی ترتیب و تدوین: اس تصریح کے بعد آپ نے حضرت مریمؑ کے کچھ فضائل بیان کرنے کے بعد سوال و جواب کی صورت میں احصان فرج کے معنی بتلائے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ یہ احصان فرج کی بحث صرف اسی مقام یعنی صہ۲ پر نہیں کتاب میں اور بھی بہت سے مقامات پر جا بجا یہ بحث بکھری ہوئی ہے مثلاً دیکھئے صفحہ ۸۰ اور ۹۴۔ اس کے بعد دوسری بحث عذرا اور بتول سے تعلق رکھتی ہے تو یہ بھی متفرق مقامات پر مندرج ہے مثلاً دیکھئے صفحہ ۷، ۸، ۳۱، ۴۸، ۹۲۔ اس کے بعد تیسری بحث "مثیل آدم" سے متعلق ہے۔ یہ بحث بھی صفحہ ۸، ۹۰ اور ۱۵۳ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح سب بحثوں کا حال ہے۔ اس عدم ترتیب کی وجہ ذہنی انتشار بھی ہو سکتا ہے اور مطلب برآری بھی۔ بس جس جگہ کوئی "نیا نکتہ" ذہن میں آیا۔ اسے اسی جگہ درج فرما دیا۔ اندریں صورت آپ کے نظریات کا تعاقب کچھ مشکل سا مسئلہ بن جاتا ہے۔

دوسری مشکل جو اس کتاب میں الجھاؤ کا سبب بنتی ہے وہ یہ ہے کہ ولادت مریم سے متعلقہ آیات میں مستعملہ الفاظ کو آپ الگ الگ زیر بحث لائے ہیں۔ مگر اس میں قرآنی آیات کی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا مثلاً سورۂ مریم میں آیت نمبر ۲۷ کے لفظ فریاً پر تو آپ نے لغوی بحث صلہ۱۲ پر فرما دی ہے اور آیت نمبر ۱۶ کے لفظ مکاناً شرقیاً کی بحث صہ۱۳۱ پر جا کر فرمائی ہے۔ ایسی تقدیم تاخیر آپ کی ساری کتاب میں ملتی ہے۔

ولادت مسیح کا ذکر قرآن کریم میں دو مقامات پر تفصیلی طور پر مذکور ہے۔

۱۔ سورۂ مریم میں جو مکہ میں ہجرت حبشہ سے پہلے نازل ہوئی۔

۲۔ سورۂ آل عمران میں جو مدینہ میں نجران کے عیسائیوں سے مناظرہ کے موقع پر سنہ ۹ھ میں نازل ہوئی۔ اثری صاحب نے عیون زمزم کے آخری صفحات میں انہی دو مقامات متعلقہ ولادت مسیح کی عربی تفسیر اور اس کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ جسے اس کتاب کا اور آپ کے ذہنی افکار کا لب لباب سمجھا جا سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس تفسیر میں بھی آپ نے اس ترتیب نزولی کو بدل کر ترتیب تلاوت کو اختیار فرمایا ہے یعنی پہلے سورۂ آل عمران کی تفسیر پیش فرمائی ہے بعد میں سورۂ مریم کی آیات کی حالانکہ کسی معاملہ کے جملہ پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ آیات کی ترتیب نزول اور شان نزول کو سامنے رکھا جائے۔ اندریں صورت میں نے ان مشکلات کا حل یہی سمجھا ہے کہ آپ کی عربی تفسیر ہی کو بحث کی بنیاد قرار دیا

جائے۔ تاہم پہلے سورۂ مریم کی آیات کا اندراج کیا جائے بعد میں سورۂ آل عمران کی آیات کا۔ پھر ان آیات میں سے جو جو الفاظ آپ کی تحقیق کا ہدف بنے ہیں اور جس جس مقام پر وہ بکھرے ہوئے کتاب مذکور میں ملتے ہیں ان پر اسی مقام پر تبصرہ کیا جائے۔

حضرت عیسیٰ کی ولادت کا ذکر صرف سورۂ مریم اور آل عمران میں ہی نہیں بلکہ اور مقامات پر بھی جزوی طور پہ آیا ہے۔ سورۂ مائدہ، انبیاء، تحریم وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔ ایسے مقامات کو ہم آخر میں پیش کریں گے۔

اب سب سے پہلے سورۂ مریم کی متعلقہ آیات نمبر دار، ان کا معروف ترجمہ، پھر اس کے سامنے اثری عربی تفسیر کا ترجمہ پیش کریں گے۔ ساتھ ساتھ اثری لغت اور اس پر تبصرہ بھی پیش کرتے جائیں گے۔ بعد میں سورۂ آل عمران کی آیات۔ بعد میں متفرق سورتوں کی آیات کو پیش کریں گے:۔

(۱) سورۂ مریم کی متعلقہ آیات

آیت نمبر ۱۶ مع اثری تفسیر

آیات قرآنی	ترجمہ از فتح محمد جالندھری	اثری تفسیر (شروع از صـ ۱۷۳ عیون زمزم)
(۱۶) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾	اور کتاب (قرآن) میں مریم کو بھی یاد کرو جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرق کی طرف چلی گئیں۔	اور قرآن مجید میں مریم کا بیان کرو۔ جب کہ وُہ اپنے شوہر کے گھر سے جو کہ غربی جانب واقع تھا، ناراض ہو کر اپنے میکے گھر چلی گئی۔ جو کہ اس کے مشرقی طرف واقع تھا۔" (ع ع ص: ۱۷۳)

اس تفسیر میں آپ نے چند نکات بیان فرمائے ہیں:

اھل بمعنی شوہر یا شوہر کا گھر: اَھل بمعنی شوہر کا گھر۔ لغوی لحاظ سے اَھْل کا معنی کنبہ۔ اور رشتہ دار، بال بچے معروف معنوں میں اہل وعیال ہے۔ اَھلُ الرجل بمعنی بیوی تو ہوسکتا ہے بالخصوص جبکہ اولاد بھی نہ ہو لیکن اَھْلُ الاِمرأۃ بمعنی خاوند لغوی لحاظ سے غلط ہے۔

اس سلسلہ میں آپ نے ایک روایت سے استدلال فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اہلیہ اُمِّ سلمہ سے کہا تھا کہ لَیْسَ بِکِ عَلٰی اَھْلِکِ ھَوَانٌ .... تمہارے شوہر پر کچھ مشکل نہیں کہ یُوں کر دو یا یُوں کرو۔" (ع صـ ۱۳۲)۔ تو واضح رہے کہ اَھل بمعنی شوہر کا استعمال شاذ ہے جس کے لیئے واضح قرینہ کا موجود ہونا ضروری ہے جیسا کہ اس روایت میں موجود ہے لیکن آیت مندرجہ بالا میں ایسا کوئی قرینہ نہیں۔ قرآن کریم میں سَارَ بِاَھْلِہٖ،

قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا۔ اَهْلَ الْبَيْتِ غرضیکہ جہاں کہیں بھی استعمال ہُوا ہے بیوی کے معنوں میں ہی ہوا ہے۔ ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ یہ لفظ شوہر کے معنوں میں استعمال ہُوا ہو۔

نکاحِ مریم: اب اثری صاحب کا پہلا کارنامہ تو یہ ہے کہ حضرت مریم کا نکاح تو پہلے ہی فرض کر لیا ہے اور دوسرا یہ کہ یہاں اہل کا معنی شوہر یا شوہر کا گھر کر لیا۔ اس طرح ولادت عیسٰی کے معاملہ میں جو قصہ آپ پیش کرنا چاہتے ہیں اس کا کچھ نہ کچھ عکس تو فوراً نظر آنے لگتا ہے حالانکہ یہی نکاح کا معاملہ ہی اصل محلِ نزاع ہے۔ اس نکاح کے نہ مسلمان قائل ہیں۔ نہ یہودی نہ عیسائی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسے اہم معاملہ کے لیے آپ کچھ دلائل وشواہد بھی مہیا فرماتے۔ قرآن وحدیث یا اسلامی روایات سے نہ سہی، بائیبل سے ہی سہی۔ بایں ہمہ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ نکاح ہوا تھا۔ اور نیز یہ کہ شوہر پاس ہو نہ ہو اھل کا معنی شوہر یا شوہر کا گھر ہے۔ آئندہ آپ اسی بنائے فاسد پر (کہ مریم کا نکاح ہو چکا ہے) اور کئی بنیادیں استوار کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

اناجیل میں یہ تو مذکور ہے کہ حضرت مریم کی منگنی یوسف نجار سے ہوئی تھی۔ اس منگنی کو صرف چھ ماہ گزرے تھے اور ابھی شادی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت مریم اور فرشتوں کی مخاطبت کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کا ذکر متی باب ا آیات ۱۸ تا ۲۱ اور لوقا باب ا آیات ۲۶ تا ۳۶ میں ہے اور قریباً قریباً قرآن کریم کے بیان کے مطابق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن، حدیث یا احادیث میں یُوسف سے منگنی کا اشارہ تک بھی نہیں ملتا۔ لیکن اثری صاحب بائیبل سے بھی آگے بڑھ کر واقعہ مخاطبت سے پہلے نکاح ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

نکاح کا ثبوت: مکاناً شرقیا کی تحقیق جلیلہ اثری صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ ہے کہ شرق بمعنی قطع وشقاق ہے جیسا کہ کتب لغت میں شائع وذائع ہے اور کہ حیث طلعت وانت منکوحۃ" اور مطلب یہ ہے کہ وُہ کبیدہ خاطر ہو کر اپنے میکے گھر چلی گئی" (ع ص ۱۳۲)

زندہ باد۔ ترجمہ اور مطلب بیان کرنے میں کوئی آپ کی نظیر بن سکتا ہے؟ شرق کے معنی ہیں قطع وشقاق لیکن مطلب سے اس معنیٰ کا کوئی تعلق آپ کو نظر آتا ہے؟ شرق کا معنی ہے۔ سُورج کا نکلنا، آفتاب کا طلوع ہونا۔ اور مشرق بمعنی سُورج کے طلوع ہونے کی جگہ یا مقام اور شرقیاً مشرقی سمت یا جانب۔ آپ نے ایک تو شرقیاً کو مشرق کے معنی میں استعمال کیا۔ پھر" طلع بمعنی نمودار ہونا" کا غلط استعمال کیا۔ کیا جن عورتوں کی شادی ہوتی ہے وُہ اپنے میکے گھر سے نمودار ہوتی ہیں؟ اور تیسرے وَاَنْتَ منکوحۃ" کا اپنے پاس سے اضافہ کر کے حضرت مریم کا میکے گھر سے آنا اور نکاح بھی ثابت کر دیا۔ آپ کی اس تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک غلط بات کو پیش کر کے اس کے ثبوت میں کیا کچھ ہیرا پھیری کر سکتے ہیں۔

سسرال یا گوشہ نشینی: آیت مندرجہ بالا میں ایک لفظ اِنْتَبَذَتْ بھی ہے۔ جسے آپ ساری کتاب میں کہیں بھی زیر بحث نہیں لائے۔ نبذ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے پس پُشت ڈال دینا اور انتبذ عن القوم بمعنی قوم سے الگ ہو جانا۔ گوشہ نشین ہونا۔ عزلت نشینی اختیار کرنا ۔ گویا حضرت مریم اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر کسی مشرقی مقام میں جا کر گوشہ نشین ہو گئی ہیں۔ لیکن اثری صاحب حضرت مریم کو اپنے سسرال سے اپنے میکے گھر بھجوا رہے ہیں۔ اور وُہ بھی کبیدہ خاطر کر کے یہ "کبیدہ خاطر" خدا معلوم کس لفظ کا معنیٰ ہے۔ یا کس لفظ سے اس کبیدہ خاطری کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے۔ شاید آگے چل کر یہ عقدہ حل ہو جائے:-

آیت ۱۷ مع اثری تفسیر

(۱۷) فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷)	تو مریم نے اپنے گھر والوں سے پردہ کر لیا ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا تو وُہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا۔	میاں بیوی میں ان بن: اور وہاں جا کر وُہ رک گئی کہ واپسی کا نام تک نہیں لیا۔ اس اثنا میں اصل راز بھی کچھ افشا ہُوا اور زکریا کو بھی افسوس ہُوا تو خیر دوا اور دعا سے کام لیا گیا جس میں اللہ پاک نے برکت عطا فرمائی اور اُسے مخاطب فرما کر الہام فرمایا کہ تجھے لڑکا عطا کروں گا جس پر زکریا نے اسکے شوہر کو الہام دیکر اسے روانہ فرمایا کہ اسے منا کر واپس گھر لے آئے (ع۔ ز ص ۳)

جب اس اثری تفسیر پر کافی غور کیا تو معلوم ہُوا کہ:

(۱)۔ اِتَّخَذَ کے معنی "بنانا" نہیں ہوتے بلکہ" وہاں جا کر رُک جانا" کے ہوتے ہیں اور

(۲)۔ حجاب کے معنی "پردہ" نہیں ہوتے بلکہ "واپسی کا نام نہ لینا" ہوتے ہیں؛ اور

حضرت مریم کی شوہر سے اَن بن:

(۳) شوہر صاحب کچھ بیمار سے رہتے تھے جن کے لیئے حضرت زکریا نے دوا اور دُعا سے کام لیا۔ اور یہ راز بھی افشا ہُوا۔ کہ حضرت مریم کی کبیدہ خاطری کی وجہ غالباً یہی شوہر صاحب کی بیماری تھی۔ وہ بیماری کیا تھی؟ یہ عقدہ بھی آگے چل کر حل ہو گا۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا کی تاویلات: فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا کے معنی اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا نہیں ہوتے بلکہ "اسے الہام فرمانا" ہوتے ہیں۔

اب یہاں کئی ایک امور قابلِ غور ہیں ؛ مثلاً :-

(ا) "اُسے" کا مخاطب کون ہے۔ جسے الہام فرمایا گیا حضرت مریم یا حضرت زکریا۔ اثری صاحب کے خیال میں فرشتہ حضرت زکریا کی طرف آیا تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے غلط ہے کہ اِلیھا میں ضمیر مؤنث استعمال ہوئی ہے اور ذکر بھی حضرت مریم ہی کا ہو رہا ہے۔ حضرت زکریا کا نہیں۔ لہٰذا فرشتہ حضرت مریم ہی کی طرف آیا حضرت زکریا کی طرف نہیں آیا تھا۔

(ب)۔ اثری صاحب کے خیال کے مطابق وہ الہام یہ تھا کہ "لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا" یعنی جو فقرہ اس سورہ کی آیت ۱۹ میں آگے آئے گا۔ اثری صاحب کو اس فقرہ کے یہاں فٹ کرنے کی ضرورت یہ تھی کہ آپ کے قصۂ مخترعہ کا ربط قائم رہ سکے۔

(ج) حضرت زکریا یہ الہام اسی "شوہر صاحب" کے ہاتھ حضرت مریم کو روانہ فرماتے ہیں کہ یہ الہام سنائے کہ "میں تجھے بیٹا عطا کرنے آیا ہوں" لہٰذا خوش ہو کر میرے ساتھ گھر چلی آؤ یعنی جو کام اللہ تعالیٰ ھا کی ضمیر استعمال کرکے حضرت مریم کو پہنچایا تھا۔ اثری صاحب کئی واسطوں سے حضرت مریم تک پہنچاتے ہیں اور اس پیغام میں کچھ اپنا پیغام بھی شامل کر رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ الہام تو (بلکہ وحی کی ایک قسم بھی) عام انسانوں کے علاوہ جانوروں کو بھی ہو سکتی ہے اور اس میں فرشتہ بھیجنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے اس الہام کے لیے فرشتہ کیوں بھیجا (جس کی وضاحت سورۂ آل عمران میں یوں آئی ہے اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ ...... الآیۃ) اور حضرت زکریا کو واسطہ کیوں بنایا پھر حضرت زکریا نے "شوہر صاحب" کو اس پیغام رسانی میں واسطہ کیوں بنایا ؟ ان مشکلات کا ہمیں کوئی حل نظر نہیں آیا۔ سوا اس کے کہ اثری صاحب کے اس نظریہ "الہام" کو باطل سمجھا جائے۔

رُوح اور ملائکہ کی مختلف تعبیریں :

اثری صاحب نے لفظ رُوح پر اور بھی دو مقامات پر بحث فرمائی ہے۔ (۱) صہ۸۱ پر رُوح کے معنی آپ نے رحمت اور وحی دو معنی بتلائے ہیں لیکن تیسرے معنی فرشتہ کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ پھر صہ۱۵۱ پر سوال کی صورت میں اور سورۂ آلِ عمران کے حوالہ سے رُوح بمعنی فرشتہ کرنے کا جو بادلِ نخواستہ اقرار فرمایا ہے۔ وہ بھی قابلِ ستائش ہے ملاحظہ فرمائیے :

"اوّل تو فرشتوں کی اطلاع بواسطہ زکریا ہے اور اس کے ساتھ لِاَھَبَ لَکِ متعلق ہے۔ دُوسرے یُوں کہ وُہ خواب ہے جس میں اسے تسلّی دی گئی ہے پھر (تیسرے یہ کہ) قاصد (شوہر) نے پہنچ کر سب کچھ سُنا دیا اور ممکن ہے کہ وُہ کچھ دنوں تک وہاں پر ٹھہرا بھی ہوگا۔ پھر اسے ہمراہ لے کر اپنے گھر چلا گیا اور اللہ پاک نے برکت فرما دی۔" (ص ۱۵۱)

اَب دیکھئے اس اقتباس میں آپ نے (۱) الہام کو اطلاع بنا دیا ہے۔ (۲) "اِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِکَۃُ یٰا مَرْیَمُ" آیت کی موجودگی میں حضرت زکریا کو واسطہ بتا رہے ہیں (۳) لِاَھَبَ لَکِ کو اس مقام پر فٹ کر کے قرآن میں تقدیم و تاخیر کر رہے ہیں (۴) اس واقعہ کو "خواب" بتا رہے ہیں۔ (۵) حضرت زکریا بھی یہ الہام یا خواب حضرت مریم کو خود نہیں بتلاتے بلکہ "شوہر صاحب" کو واسطہ بناتے ہیں۔ (۶) یہ شوہر حضرت مریم کو صرف الہام یا خواب سُناتا ہی نہیں بلکہ وہاں کچھ عرصہ ٹھہرا رہتا ہے تاکہ حضرت مریم کو لڑکا عطا کر کے جائے۔ نعوذ باللہ من ھذہٖ الھفوات والخرافات۔

شوہر صاحب کی تندرستی: فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا کا اثری مطلب یہ ہے کہ "شوہر صاحب" کو جو بیماری تھی وہ یہ تھی کہ وہ حضرت مریم کی طرف سے بے رغبت تھا یا شائد نامرد تھا۔

اس بیماری کے لیے حضرت زکریا نے دوا اور دُعا بھی اس کے لیے کی تھی اور اس کی اسی "بیماری" کی وجہ سے حضرت مریم اس سے کبیدہ خاطر ہو کر اپنے میکے گھر چلی گئی تھیں اور اسی لیے سب بے رغبت بھی رہتا تھا۔ حضرت زکریا کے دوا دارو کا یہ اثر ہوا کہ اب اس میں جنسی خواہشات عود کر آئیں۔ جب وہ بیمار اور بے رغبت تھا تو گویا وہ "فرشتہ" یا "رُوح" تھا۔ اب جب اس میں جنسی خواہشات عود کر آئیں اور وہ بارغبت بن گیا تو اب وہ ایک تندرست انسان یعنی بَشَرًا سَوِيًّا بن گیا۔ اور اس حالت کی تبدیلی (یعنی بے رغبت سے بارغبت بننے) کے لیئے اللہ تعالیٰ نے تَمَثَّلَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اب اثری صاحب کے اپنے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ آپ ص۱۵۱ پر ایک سوال اُٹھاتے ہیں:۔

رُوح سے مُراد شوہر مریم: "رُوحَنَا سے مُراد جو مریم کا شوہر لیا گیا ہے۔ غلط ہے کیونکہ اللہ پاک نے قرآن مجید اور جبرئیلؑ اور عیسٰیؑ ہر سہ ہی کو رُوح فرمایا ہے" پھر اس کا جواب تحریر فرماتے ہیں:۔

"لغتِ قرآن، لغتِ حدیث اور لغتِ عرب ہر سہ میں رُوح کے بہت سے معانی بیان کیئے ہیں۔ یہاں پر وہ ۳ سے (یعنی عیسٰیؑ سے) مشترک ہو کر بیان ہوا ہے۔ پہلے تو وہ فرشتہ کی طرح بے ضرورت تھا جیسے کہ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف) کا مطلب بیان کر آیا ہوں۔ پھر جب وہ تندرست ہو کر اسے لینے آیا تو اس وقت وہ بشرًا سویًا کا مصداق ہو چکا ہوا تھا"

کچھ سمجھے آپ کہ "یہاں پر وہ ۳ سے مشترک ہو کر بیان ہوا ہے" کا کیا مطلب ہے؟ اور "وہ"

سے مُراد کون ہے؟ بحث توروح کی چل رہی ہے۔ اور روح کا تیسرا معنی آپ عیسیٰ بتلا رہے ہیں۔ "وہ" کی مزید تشریح غالباً فرشتہ نہیں بلکہ "شوہر صاحب" ہیں جو پہلے فرشتہ کی طرح بے ضرورت تھے۔ یہی شوہر صاحب حضرت عیسیٰ سے مشترک ہو کر بیان ہوئے ہیں۔ یہ مشترک کر کے کس نے بیان کئے ہیں۔ قرآن کریم میں تو اس کا اشارہ تک نہیں۔ قرآن کریم کوئی معموں یا پہلیوں کی کتاب تو ہے نہیں۔ وہ تو عربی مبین ہے جو اسکے اولین ان پڑھ مخاطبوں کی سمجھ میں بھی بخوبی آجاتی تھی۔ وہ بھلا شوہر صاحب اور عیسیٰ کے مشترکہ بیان کو کیا سمجھے ہوں گے؟ پھر ان کے بعد آج تک بھی اس مشترک ہو کر بیان ہونے کی کسی کو سمجھ نہیں آسکی۔ آخر اثری صاحب نے یہ عقدہ حل فرمایا۔

شوہر مریم کے فرشتہ ہونے کی وجہ:

پھر اثری صاحب نے شوہر صاحب کو فرشتہ ثابت کرنے کے لیئے حضرت یوسف اور حیا باختہ عورتوں کے قول کو پیش کیا ہے جبکہ حضرت یوسف نہ بیمار تھے نہ بے ضرورت تھے بلکہ متقی تھے۔ ان عورتوں نے جو یوسفؑ کو ملک کریم کہا تو اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ جس بدکاری کے جال میں حضرت یوسفؑ کو پھانسنا چاہتی تھیں۔ اس سے حضرت یوسفؑ بچ نکلے۔ کیا حضرت یوسفؑ کا کسی سے نکاح ہوا تھا اور جائز میل ملاپ سے یوسفؑ نے پرہیز کیا تھا جس کی بنا پر انہیں ملک کریم کہا گیا تھا؟ مگر یہاں جو نقشہ اثری صاحب دکھلا رہے ہیں وہ ایک جائز منکوحہ سے عدم مساس اور بے توجہی کی شکایت ہے اور وہ بھی بغیر کسی بگاڑ کے (ع۔ ص۱۱) تو اپنی بیوی سے اس قسم کی بے رغبتی خوبی کی بات نہیں بلکہ اخلاقی اور شرعی جرم ہے اور اتنا شدید جرم ہے کہ حضرت مریم بیچاری کبیدہ خاطر ہو کر اپنے میکے گھر چلی جاتی ہیں۔ پھر بھلا ایسے بدبخت شوہر کو فرشتہ کہنے کی کیا تک ہے؟

اور دوسری وجہ حضرت یوسف کو ملک کریم کہنے کی یہ تھی۔ کہ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے حسن وجمال میں بے مثال تھے۔ ان کے حسن کا چرچا تمام شہر میں ہونے لگا تھا اور چہرے سے نور ہی نور ٹپکتا تھا۔ اور اس بات کا اثری صاحب کو بھی اعتراف ہے (دیکھئے ص۱۵۶)۔ اسی وجہ سے تمام عورتیں ان پر فریفتہ ہو گئی تھیں۔ لیکن مریمؑ کے مزعومہ شوہر میں کون سی ایسی خوبی تھی۔ جس کی بنا پر اسے نوری فرشتوں کے مثل قرار دیا جاسکے۔ مصری عورتوں نے ان کو ملک کہا تو حسن وجمال کی وجہ سے کہا اور کریم کہا تو ان کی بزرگی اور اتقاء کی وجہ سے کہا۔ لیکن اس مزعومہ شوہر میں وہ کونسی ایسی خوبی ہے کہ اسے ملک کریم سمجھا جائے۔

قاضی بیضاوی اور اثری:

اثری صاحب قاضی بیضاوی پر بہت گرم ہیں۔ اس لیئے کہ انہوں نے اپنی تفسیر بیضاوی میں فتمثل لھا بشراً سویاً کے تحت لکھا ہے کہ یہاں روح سے مُراد جبرئیلؑ ہیں جو ایک خوبصورت نوجوان کی شکل میں حضرت مریم کے سامنے آئے تھے اور انکے بال گھنگریلے

تھے۔ تاکہ عفیفہ کے دل میں اُمنگ پیدا ہو کر مذکورہ صورت پیدا ہو جائے" (ع ص ۲۳) پھر حاشیہ پر اثری صاحب لکھتے ہیں:" یہ سب کچھ کرالیا تو باقی کام کی کیا رکاوٹ تھی؟"

اب یہ اتفاق سمجھیے کہ اثری صاحب نے اس اعتراض کو واضح کرنے کے لیئے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں جن میں ان کے اعتراض کا از خود جواب آگیا ہے اسی ص ۲۳ کے حاشیہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ" ابراہیم نے فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ان کی خدمت میں کھانا رکھا مگر انہوں نے نہیں کھایا کہ حقیقت بشری نہیں۔ لُوط کے پاس فرشتے انسانی شکل میں آئے جنہیں وہ دیکھ کر ڈر گئے انہوں نے کہا کہ ہم بظاہر انسان ہیں مگر حقیقت بشری نہیں مگر معلوم نہیں یہاں پر انہوں نے (علماء یا قاضی بیضاوی) نے فرشتہ کو بدارادہ پر کیوں مشتعل کرایا اور معصومہ اگر اُسے فرشتہ جانتی تھی تو وہ مشتعل کیسے ہوئی؟ اور اگر سچ مچ اُسے غیر شوہر انسان سمجھا تھا تو وہ پاک کیسے رہی؟" (حوالہ ایضاً)

اب یہ تو اثری صاحب نے تسلیم کر لیا کہ جبرئیل خواہ کس شکل میں آئے۔ اُن کی حقیقت بشری نہیں تھی۔ لہٰذا زوجین کی طرح میل ملاپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا نفخہ رُوح کا ذکر تو یہ قرآن سے ثابت ہے۔ یہ خواہ جبرئیل کی وساطت سے ہُوا ہو، اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے اور اسی نفخہ سے حمل ٹھہر گیا تھا۔ اب رہا یہ خیال کہ فرشتہ کو یا حضرت مریم کو ہیجان پیدا ہوا تھا یا نہیں؟ تو یہ سب مفسرین کی اپنی اپنی آراء ہیں۔ جن کا جواب ہمارے ذمہ نہیں۔

اسی بات کو اثری صاحب نے ص ۶۰ پر دہراتے ہوئے لکھا ہے۔ "ہمارے مفسر بزرگوں کے خیال میں یہ سب کچھ ہُوا اور اسے مانا بھی گیا مگر جائز طور پر شادی سے انکار ہے کیا خوب صدیقہ و عفیفہ کا احترام و اعزاز ہے۔ الامان"۔

پھر ص ۸۳ پر لکھتے ہیں کہ" اللہ پاک نے ایک رُوح کو انسانی شکل میں بھیج کر مریم کے رحم میں تلقیح فرمادی۔ جس سے مریم کو بیٹے کا حمل ٹھہر گیا۔ سب کچھ ہوا مگر نکاح نہیں ہونے دیا کہ یہ کفر ہے۔ کیا خوب ہے"!

بعد ازاں ص ۱۳۶ پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں" تفسیری خیال خطرناک" اور اس کے تحت لکھتے ہیں:

کسی کی جوان لڑکی کو کوئی نوجوان، خوبصورت گھنگھریالے بالوں والا لڑکا خلوت میں مل کر یُوں کہہ دے کہ "مَیں تجھے لڑکا دینے آیا ہوں تو کیا اندازہ لگایا جائے گا؟ پہلے اپنے گھر سے شروع کریں۔ پھر مریم کی طرف متوجہ ہوں"۔

یہاں پہنچ کر اثری صاحب کا مفسرین پر پارہ بہت چڑھ گیا ہے۔ لیکن اگر آپ" تفسیری خیال خطرناک" کی عبارت میں یہ اضافے بھی کر لیتے کہ وُہ لڑکا فرشتہ تھا۔ اس نے حضرت مریم کو یہ بات پہلے بتلا بھی دی تھی لہٰذا اس کی حقیقت بشری میں تبدیلی ہی نہ ہوئی تھی۔ تو آپ کے اعتراض کا پورا جواب آجاتا۔ باقی جو کچھ مفسرین نے لکھا گو ہمیں مفسرین کی آراء کو بھی دخل ہے تاہم اس کی بنیاد قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے۔ نفخہ رُوح کے باوجود

قرآن کریم نے حضرت مریم کو محصنۂ فرج صدیقہ اور فرمانبردار کے القاب سے نوازا ہے اور رسول اللہ نے اسے عفیفہ عذرا اور بتول بتلایا ہے۔

تصویر کا دُوسرا رُخ: یہاں تک تصویر کا ایک رُخ زیرِ بحث تھا۔ اب دُوسرا رُخ سامنے لائیے جو اثری صاحب پیش فرماتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کو خلوت میں حضرت مریم کے پاس بھیجتے ہیں جس کا نکاح وہ خود بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ اس معروضہ شوہر کے متعلق اثری صاحب کے متضاد بیان ہیں۔ ایک یہ کہ وُہ بیمار یا نامرد تھا جس کے لیے حضرت زکریا نے دوا بھی کی اور دُعا بھی کی اور دُوسرا یہ کہ اس میں کوئی بگاڑ نہیں تھا البتہ بے رغبت ضرور تھا۔ لیکن مریمؑ کے اس کبیدہ خاطر ہو کر میکے چلے جانے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وُہ اضطراری طور پر بے بس نہیں بلکہ اختیاری لحاظ سے مجرم تھا جو اپنی بیوی کے حقوق پُورے نہیں کرتا تھا۔ دُوسری طرف عفیفہ مریمؑ کی یہ تصویر پیش فرماتے ہیں کہ انہیں نعوذ باللہ جنسی خواہش اتنی زیادہ تھی کہ وہ شوہر کی اس بے رغبتی سے کبیدہ خاطر ہو کر میکے چلی گئیں۔ ہزاروں گھرانے ایسے ہوتے ہیں جہاں زوجین میں کوئی ایک بیمار یا لاپرواہ ہوتا ہے تو زوجین صبر و شکر سے وقت گزارتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کسی وقت اولاد بھی دے دیتے ہیں۔ اگر مرد بیمار ہو تو باحیا عورتیں اس بات کا والدین یا کسی دُوسرے سے ذکر تک نہیں کرتیں۔ لیکن بقول اثری صاحب حضرت مریم میں یہ خواہش جنسی اتنی زیادہ تھی کہ وُہ صبر نہ کر سکیں اور عدم مس کی شکایت کی بنا پر وُہ شوہر کو چھوڑ کر اپنے میکے گھر چلی گئیں۔ وُہ عفیفہ جو پیدائش سے عبادت میں عمر بسر کر رہی تھی۔ اب اس میں جنسی ہیجان اتنا زیادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ بیمار شوہر کی بیماری اور شفا کا صبر نہیں کرتیں اور عدم مساس کی شکایت لیے ہوئے خاوند کو چھوڑ کر میکے گھر چلی جاتی ہیں۔ الامان والحفیظ۔

آیت ۱۸ مع اثری تفسیر

(۱۸) قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾	مریم بولیں اگر تم پرہیزگار ہو تو میں تم سے پناہ مانگتی ہوں۔	جب وہ اس کے پاس پہنچا۔ تو مریم نے وہی شکایت کی جو ایسی سے مانع ہوئی اور طلاق کا مطالبہ کیا کہ میں تجھ سے طلاق چاہتی ہوں کہ تیرا میرا ملاپ نہیں ہو سکا۔

اب دیکھیے قرآن کے بیان کے مطابق یہ جگہ بیت المقدس کی شرقی جانب ہے۔ یہاں حضرت مریم لوگوں سے علیحدہ ہو کر اکیلی عبادت میں مصروف رہتی ہیں۔ فرشتہ انسانی شکل میں سامنے آتا ہے تو آپ اس مقام پر ایک غیر انسان کو دیکھ کر سخت پریشان ہو جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر تمہیں کچھ خدا کا خوف ہے تو میں تجھ سے اللہ سے پناہ چاہتی ہوں کہ میرے نزدیک نہ آنا۔ لیکن اثری صاحب کے بیان کے مطابق یہ حضرت مریمؑ کا میکہ گھر ہے جہاں دوسرے لوگ بھی موجود ہیں۔ شوہر صاحب آتے ہیں۔ تو حضرت مریم اس سے اور کوئی بات نہیں کرتیں۔ شوہر کو دیکھتے ہی غصہ سے لال پیلا ہو کر پہلی بات یہ کرتی ہیں کہ مجھے طلاق دے دو۔ کیونکہ تم نے مجھے آج تک چھوا نہیں اور میرے حق زوجیت کو پُورا نہیں کیا۔ قرآن حضرت مریم کو شہوانی جذبات سے مبرّا قرار دیتا ہے لیکن اثری صاحب حضرت

مریم کو شہوانی جذبات سے مغلوب قرار دیتے ہیں۔

شوہر کی اجنبیت: قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ شخص حضرت مریم کے لیئے بالکل اجنبی تھا جبھی تو حضرت مریم نے اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا کہا تھا لیکن اثری صاحب کے بیان کے مطابق وُہ شخص اجنبی نہ تھا بلکہ ان کا شوہر تھا تو پھر حضرت مریم کو اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا آپ اس شوہر کی صورت وسیرت کو جانتی نہ تھیں؟ کہ وُہ خدا ترس اور نیک سیرت ہے یا بد اطوار۔ قرآن کہتا ہے کہ اس موقعہ پر آغاز کلام حضرت مریم سے ہُوا اور مریم نے اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ سے آغازِ کلام کیا۔ لیکن اثری صاحب کہتے ہیں کہ مطالبہ طلاق سے پہلے حضرت مریم نے وہی عدم مَس کی شکایت کی تھی جو واپسی سے مانع ہوئی۔ کیا ایسی باتوں کا اشارہ تک اس آیت میں کہیں نظر آتا ہے؟

مطالبۂ طلاق: اثری صاحب کا بیان یُوں بنتا ہے کہ آغاز کلام شوہر صاحب نے کیا اور وہ پیغام جو آگے آیت میں آئے گا "لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا" اس پیغام سے یہ آغاز کیا گیا۔ پھر ساتھ چلنے کے لیئے منت سماجت کی۔ حضرت مریم نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا اور بعد میں اپنے گھر والوں کے سامنے ہی مطالبۂ طلاق پیش کر دیا۔ اثری صاحب نے اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ کے الفاظ سے طلاق کے مطالبہ کا استشہاد قبیلہ جون کی اس بدسرشت عورت سے کیا ہے جو ملکہ جون کی صورت میں رسول اللہ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یہ عورت بے وقوف بھی تھی اور کبر ونخوت کا پُتلا بھی۔ اس نے رسول اکرمؐ کی شان میں یہ گستاخانہ الفاظ بھی کہے تھے:

کیا شہزادیاں بھی بازاری لوگوں (اپنی جانوں) کو بخشا کرتی ہیں۔	وَهَلْ تَهَبُ الْمَلِكَةُ نَفْسَهَا لِلسُّوْقَةِ (بخاری کتاب الطلاق)

تو اس گفتگو کے ساتھ متصل اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ کے الفاظ بھی کہہ دیئے۔ آپؐ نے اندازہ لگا لیا کہ ایسی متکبر اور دنیا دار عورت سے نباہ مشکل ہے۔ لہٰذا آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ اس کو اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ گویا اس پوری گفتگو سے طلاق کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ آپؐ خدا سے بہت ڈرنے والے اور خوددار تھے جس کی اس نے پناہ طلب کی تھی۔ لہٰذا آپ نے جونیہ عورت کو رخصت کر دیا۔

لیکن اثری صاحب کے زوجین آپس میں ہر لحاظ سے کفو ہیں کیونکہ یوسف مریم کا چچیرا بھائی ہے (ع ص۵۷) دونوں آل عمران سے ہیں۔ دونوں منذور ہیں (ع ص۵۱)۔ ان کا نکاح (دروغ بر گردن اثری) حضرت زکریاؑ نے کیا۔ پھر آخر حضرت مریم نے عدم مس کی بنیاد پر جوسب کے سامنے طلاق کا مطالبہ کر دیا تو کیا یہ درست تھا؟ اور شوہر صاحب بھی غالباً اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا کا مصداق نہ تھا جو اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ کے الفاظ سُنکر بھی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ کچھ زیادہ ہی بے غیرت قسم کا انسان تھا۔

رُوحنا کے دو مختلف مطلب: ایک اور نکتہ یاد رکھیئے۔ سابقہ آیت میں اثری صاحب نے فَاَرْسَلْنَا اِلَیْهَا رُوْحَنَا کا مطلب یہ بیان فرمایا تھا۔ کہ "ہم نے حضرت زکریا کو الہام فرمایا کہ وہ مریم تک پیغام پہنچا دے (ص ۱۴۷)۔ اب اسی کے الفاظ میں دوسرا مطلب یہ ہُوا کہ ہم نے مریم کی طرف (بلا واسطہ زکریا) اپنا رُوح (بے رغبت یا بیمار انسان یعنی فرشتہ) مریم کا مفروضہ شوہر بھیجا۔ جو اب مریم کے سامنے ایک بالکل تندرست انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

حضرت مریم کے نکاح کا اثری ثبوت: فرماتے ہیں۔ کہ "جونیہ عورت سے رسول اکرمؐ کے نکاح کی تصریح احادیث صحاح میں موجود نہیں ہے تاہم امام بخاری نے اسے کتاب الطلاق میں درج فرما کر ظاہر کر دیا ہے کہ پناہ طلاق ہے لہٰذا نکاح ثابت ہے کہ اس کے بغیر طلاق نہیں اسی طرح مریمؑ کا نکاح ثابت ہے۔ انکار کی کوئی وجہ نہیں" (ع ص ۱۴۰۔ حاشیہ)

اب دیکھئے یہ عورت ملک یمن کے دور آپؐ کے پاس لائی گئی اور یہ اثری صاحب خود ہی بتلا رہے ہیں کہ صحاح میں اس کے نکاح کی کوئی تصریح نہیں۔ آپؐ نے جو اسے رخصت کیا تو طلاق کے لفظ بھی استعمال نہیں فرمائے بلکہ فرمایا اَلْحِقِیْ بِاَهْلِكِ۔ یعنی اپنے گھر چلی جاؤ (اثری صاحب کے ترجمہ کے مطابق تو اس کا ترجمہ ہونا چاہیئے اپنے خاوند سے جا ملو) اب رہی یہ بات کہ "چونکہ بخاری نے اسے کتاب الطلاق میں بیان فرمایا ہے لہٰذا ثابت ہُوا کہ پناہ طلاق ہے" اس دلیل کی کمزوری بالکل واضح ہے امام بخاری نے تو ایلاء اور ظہار کو بھی کتاب الطلاق میں بیان فرمایا ہے تو کیا یہ سب طلاقیں ہیں؟

اب اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ "چونکہ طلاق نکاح کے بعد ہی دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ حضرت مریم کا نکاح ہے"؛ اور اسی دلیل کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ چونکہ جونیہ عورت کے نکاح کی صحاح میں کوئی تصریح نہیں لہٰذا اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ کا مطلب طلاق نہیں ہو سکتا۔ امام بخاری نے تو جدائی کی سب صورتوں کو کتاب الطلاق میں درج کر دیا ہے تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ یہ سب صورتیں طلاق ہی ہیں۔ پھر جب طلاق ہی ثابت نہ ہو تو نکاح کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

آیت ۱۹ مع اثری تفسیر

آیت	ترجمہ	اثری تفسیر
(۱۹) قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (۱۹)	اس فرشتہ نے کہا میں تمہارے پروردگار کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں تاکہ تمہیں پاکیزہ لڑکا کا بخشوں۔	اس نے اپنی صحت کا حال بھی سنایا اور اللہ پاک کا الہام بھی سنایا۔ اس پر کچھ بات چیت کرنے کے بعد اس نے کہا الہام میں یہ تصریح ہے کہ نکاح مبارک ثابت ہوگا اور اللہ پاک اپنے الہام کے مطابق پاکیزہ لڑکا عطا فرمائے گا۔

اثری لغت: اب ذرا اثری لغت بھی ملاحظہ فرمائیے:۔
(۱) اس آیت میں رسول بمعنی "فرشتہ" نہیں بلکہ "قاصد" ہے۔

(۲) ، اور رب کا معنیٰ "پروردگار" نہیں بلکہ مُربّی ہے ۔ یعنی حضرت مریم کا کفیل زکریا علیہ السلام ۔

ربطِ قصہ : اب دیکھئے قرآن کی تصریح کے مطابق تو بات یُوں چلتی ہے ۔ جب حضرت مریمؑ اپنے خلوت کدہ میں ایک اجنبی نوجوان کو دیکھا تو اللہ سے پناہ مانگنے لگی ۔ اس پر اس نووارد نے حضرت مریم کی پریشانی اور اضطراب کو یہ کہہ کر دور کیا ۔ کہ میں کوئی انسان نہیں بلکہ تمہارے پروردگار کا بھیجا ہُوا فرشتہ ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں ۔ لیکن اثری صاحب کہتے ہیں کہ یہ رُوح دراصل فرشتہ اس لحاظ سے تھا کہ مریم کے لیئے رحمت بن کر آیا تھا مگر تھا اس کا شوہر ہی جو بے رغبت ہونے کی وجہ سے بھی فرشتہ تھا ۔ جسے زکریا نے بطور قاصد بھیجا تھا ۔ اس کو مریم نے دیکھتے ہی طلاق کا مطالبہ کر دیا ۔ مگر وہ کہنے لگا کہ مجھے تو زکریا نے تمہارے پاس قاصد بنا کر بھیجا ہے ۔ میں از خود نہیں آیا ۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا پھر آخر میں الہام کا وہ حصہ بھی بتلایا جو ہُوا تو حضرت زکریا کو تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں مخاطب حضرت مریم کو کیا تھا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو مخاطب کر کے خود الہام کر نہ سکتا تھا اللہ نے اس الہام (وحی نہیں بلکہ الہام) کو جو خاص حضرت مریم سے متعلق تھا حضرت زکریا کو واسطہ بنایا پھر حضرت زکریا نے شوہر صاحب کو واسطہ بنایا ۔ واسطہ در واسطہ ہو کر یہ الہام بالآخر حضرت مریم تک پہنچ ہی گیا ۔ یہ بات سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ الہام تو وُہ بات ہوتی ہے جو کسی کے دل میں ڈالی جائے ۔ اور جب یہی بات دُوسرے تک منتقل کی جائے تو وُہ پیغام یا رسالت بن جاتی ہے ۔ الہام نہیں رہتی ۔

آیت نمبر ۲۰ مع اثری تفسیر

(۲۰) قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ⑳	مریم نے کہا میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جب کہ مجھے کسی بشر نے چھُوا تک نہیں اور نہ ہی میں بدکار رہوں ۔	مریم نے تعجب سے کہا کہ میرے شوہر کی طرف سے یعنی تیری طرف سے مساس تو ہُوا نہیں تو لڑکا کیسے ؟

اثری لغت (۱) بشر کے معنیٰ "آدمی یا انسان" نہیں بلکہ صرف ایسا شوہر ہوتا ہے جو پاس بیٹھا ہو یعنی اس کا معنیٰ میرا شوہر بھی ہے اور تُو اسے شوہر بھی ۔ اللہ تعالیٰ تو واحد غائب کا صیغہ استعمال کرتے ہیں لیکن اثری صاحب نے اس تفسیر میں مخاطب کا صیغہ بنا لیا ہے ۔ اچھا جیسے آپ کی مرضی ۔

(۲) اس موقع پر لَمْ اَكُ بَغِيًّا کے کچھ معنی نہیں کیونکہ یہ الفاظ اثری صاحب کے قصہ کو خراب کرتے ہیں

شوہرِ مریم کی خصوصیات : اثری صاحب کا یہ بشر کوئی عام بشر نہیں بلکہ مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہے (۱) یہ بشر اللہ کی "رُوح" تھا جو حضرت مریم کی طرف رحمت بن کر آیا تھا (فارسلنا الیھا رُوحنا) کی تفسیر

(۲) یہ بشر "فرشتہ" تھا (وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ کی تفسیر) اور فرشتہ اس لحاظ سے تھا کہ وہ نامرد یا بیمار

تھا یا ویسے ہی اپنی عورت سے بے رغبت تھا اور جو بشر عورت سے بے رغبت ہو وُہ فرشتہ ہی ہوتا ہے کیونکہ یوسفؑ کو حیا باختہ عورتوں نے ملک کریم کہا تھا (ع صلا)

(۳) یہ بشر جب بارغبت یعنی تندرست انسان بن کر مریم کے پاس آیا تو اب پھر وہ محض بشر ہی تھا۔ فرشتہ کے اوصاف اس سے ختم ہو گئے تھے۔

(۴) یہ بشر حضرت مریم کا خاوند ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ حضرت مریم عدم مس کی شکایت کر رہی ہیں اور وہ عفیفہ بھی ہیں لہٰذا ان کے متعلق یہ خیال کہ انہوں نے کسی عام بشر کی بات کی ہو ان کی عفت و احترام کے منافی ہے۔ اسلیئے یہ بات از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کا پہلے نکاح ہو چکا تھا۔ (ع صلا)

لفظ بشر کا بھید: اب رہی یہ بات کہ شوہر سامنے بیٹھا گفتگو کر رہا ہے اور حضرت مریم کو اسی سے عدم مس کی شکایت بھی تو آپ نے شوہر کو ہی مخاطب کیوں نہ کیا کہ مجھے تجھ سے عدم مس کی شکایت ہے۔ یہ بات جب اثری صاحب کے ذہن میں آئی تو سوال و جواب کی مخصوص طرز میں اس کا جواب دیتے ہیں سوال یہ بناتے ہیں: "مریم نے بشر کی جگہ زوج کیوں نہیں کہہ دیا؟" (ع ص ص۱۰۹) پھر اس کا سوال کا جواب یُوں دیتے ہیں کہ:

"اچھا تو اس نے لَمْ اَتَزَوَّجْ کیوں نہیں کہہ دیا کہ میں نے نکاح نہیں کیا ہُوا۔" (حوالہ ایضاً)

غور فرمائیے! کج بحثی کی اس سے زیادہ واضح مثال کوئی اَور مل سکتی ہے؟ تاہم آپ کے اس جواب کا جواب ہمارے ذمہ ہے۔ اور وُہ یہ ہے کہ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ میں نکاح کی جائز صُورت اور زنا بالجبر دونوں شامل ہیں۔ چُونکہ حضرت مریم کنواری تھیں لہٰذا جائز صورت ختم ہوئی اب ناجائز صورت یعنی زنا کی دو شکلیں ہیں۔ ایک بالجبر دوسرے بالرضا۔ حضرت مریم نے دونوں باتوں کی تردید کی ہے کہ نہ مجھ کو کسی نے چھوا یا زبردستی کی اور نہ مجھے اس کام سے کوئی رغبت ہے کیونکہ میں بدکار نہیں۔

اثری صاحب یہ جواب دینے کے بعد مزید وضاحت یُوں فرماتے ہیں کہ: "اگر وُہ زوج کی تصریح کرتی تو اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد ناچاکی پیدا ہو گئی ہے اور شوہر راضی نہیں اور عمداً علیحدہ ہے اور طلاق پر آمادہ ہے۔ جیسے کہ اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ جب نکاح کے بعد میل ملاپ سے پہلے طلاق کی صورت پیدا ہو جائے تو دریں حالات کوئی عدت نہیں۔" (صلا)

کیا سمجھے آپ کہ حضرت مریمؑ نے زوج کیوں نہیں کہا؟ سوال یہ تھا کہ مریم نے بشر کی جگہ زوج کیوں نہیں کہہ دیا۔ اسکے جواب میں ثابت آپ نے یہ کر دکھایا ہے کہ نکاح کے بعد مس سے پہلے طلاق ہو جائے تو کوئی عدت نہیں۔ کیا سوال گندم جواب چنا کے مصداق اس سوال و جواب میں کوئی ربط ہے؟

آیت ۲۱ مع اثری تفسیر

(۲۱) قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا (۲۱)	فرشتہ نے کہا ایسا ہی ہوگا تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ بات مجھ پر آسان ہے اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیئے نشانی اور رحمت بنالیں اور یہ بات طے شدہ ہے	تو اس شوہر نے مریم کو سب کچھ سمجھا بجھا کر کہا کہ تیرے جیسے منذوروں کے لیئے اسوہ حسنہ ٹھہرے گا، اور کہ تیرے مُربّی نے مجھے تیری طرف روانہ کیا ہے کہ تجھے الہام سناؤں اور اپنے گھر لے چلوں۔

آیۃً لّلنّاس کی تاویل: اب اس تفسیر اثری کے ساتھ ساتھ "آیۃً لّلنّاس" کی علیحدہ تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے: "آیۃً لّلنّاس میں آیت سے مُراد نمونہ اور ناس سے مُراد وُہ لڑکے یا لڑکیاں ہیں جو منذور ہو چکے ہیں تاکہ وُہ اس نکاح کو نظیر ٹھہرا کر نکاح کریں۔ اور اولاد پیدا کریں اور گھریلو زندگی بسر کریں کہ وُہ تبلیغ دین اور اسلام کی اشاعت سے مانع نہیں"۔ (ع صفہ ۱۳۰)

اس تفسیر اور تشریح کی روشنی میں آیت بالا کی پُوری تشریح یُوں بنتی ہے کہ :-

مریم کے شوہر نے مریم سے کہا کہ تیرے مربّی زکریاؑ نے یہ بات کہی ہے کہ "یہ بات مجھ پر آسان ہے" اور تاکہ ہم اسے (یعنی اس واقعہ نکاح کو) منذوروں کے لیئے ایک نمونہ بنادیں۔ اور اپنی طرف سے رحمت بھی اور "یہ کام ایک طے شدہ بات ہے۔"

اثری صاحب نے اپنی تفسیر میں (۱) هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے جو کہ شوہر کی زبانی زکریاؑ کا مقولہ ہے۔ یہ بات کیا تھی جو زکریاؑ کے لیئے آسان تھی۔ آیا یہ نکاح تھا جو وُہ مدتوں پیشتر یُوسف سے کرچکے تھے؟ پھر اس موقع پر یہ بات کہنے کا کیا مطلب ہے"۔

(۲) لِنَجْعَلَهُ میں حضرت زکریاؑ کے علاوہ دُوسرا فاعل کون ہے؟ کہ ضمیر جمع متکلم استعمال ہوئی ہے؛ اور ہٗ کی ضمیر اثری صاحب نے نکاح کی طرف پھیر دی ہے۔ حالانکہ نکاح کا اس مقام پر کیا سارے قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔

(۳) آیۃ کا ترجمہ آپ نے نمونہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ قرآن حدیث اور لغت تینوں کے خلاف ہے۔ نمونہ کیلئے قرآن نے اُسوہ کا لفظ دو بار استعمال فرمایا ہے۔ اور لغت میں نمونہ کیلئے ایک اور لفظ قُدوۃ بھی ملتا ہے۔ آیت کے معنی قرآن مجید کا مجملہ، 'نشانی' معجزہ اور عبرت تو ہو سکتے ہیں مگر نمونہ مُراد لینا ہر لحاظ سے غلط ہے۔ کاش آپ اس معنی کے لیئے کسی لغت کا حوالہ ہی درج فرما دیتے۔

(۴)۔ ناس کے عام لفظ کو منذوروں میں مقید کرنے کا سیاق و سباق میں کوئی قرینہ موجود نہیں پھر دوسرے مقام پر آیۃً للعالمین کا لفظ آیا ہے جو اثری صاحب کی تاویل کو غلط قرار دیتا ہے۔

(۵) حضرت زکریاؑ کا قاصد کہتا ہے کہ کَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا مگر چونکہ وُہ قضا پر قُدرت نہیں رکھتا تھا لہٰذا اثری صاحب نے

اس کا ترجمہ کر دیا کہ "تجھے الہام سناؤں اور اپنے گھر سے چلوں۔ کیا امر اُنْقِضُیِّا کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی روٹھی ہوئی بیوی کو منا کر گھر لے جاتے؟

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ اس ساری آیت کی تشریح و تفسیر میں اثری صاحب نے سیاق و سباق سے قطع نظر کر کے اپنا سارا زور لِنَجْعَلَهُ اٰيَةً لِّلنَّاسِ پر صرف کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم اسی جملہ کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لائینگے

لِنَجْعَلَهُ اٰيَةً لِّلنَّاسِ: میں ضمیرہٗ کا اصل مرجع عیسیٰؑ کی پیدائش ہے لیکن اثری صاحب نے ضمیرہٗ کا مرجع نکاح قرار دیا ہے جو کئی لحاظ سے غلط ہے :۔

(۱) عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر تو قرآن میں چل ہی رہا ہے لیکن حضرت مریم کے نکاح کا سُراغ تک نہیں ملتا۔ اثری صاحب کے اس ذہن کا ماخذ بائیبل یا یہود تو ہو سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث یا اسلامی روایات ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ جیسے کہ آپ نے خود بھی اعتراف فرمایا ہے کہ "یہود اب بھی دُنیا میں موجود ہیں اور ان کی کتابیں بھی موجود ہیں ان سے دریافت کر لیا جائے کہ انہوں نے کیا اعتراض کیا تھا؟ آیا یہ اعتراض تھا کہ اس نے شادی نہیں کی اور بچہ پیدا کر لیا ہے جو کہ ناجائز ہے یا یہ اعتراض تھا کہ اس نے موجودہ شریعت کے خلاف شادی کی ہے۔ جس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے"۔ (ع ص۱)۔

ہم اس مقام پر اس بات سے صرف نظر کرتے ہیں کہ یہود یا یہودی لٹریچر سے بھی شادی ثابت نہیں ہو سکتی اور اس بات سے بھی کہ از روئے قرآن ان کا اصل اعتراض کیا تھا۔ یہاں صرف یہ بات ملحوظ رہے کہ لِنَجْعَلَهُ میں ہٗ کی ضمیر کا مرجع نکاح قرار دینا اثری صاحب نے یہود اور ان کے لٹریچر سے اخذ کیا ہے۔

(۲) اس مقام پر تو اللہ تعالیٰ نے ضمیر واحد غائب استعمال کر کے ہٗ کا مرجع عیسیٰؑ کی پیدائش قرار دیا ہے اور اُسے آیۃ یعنی معجزہ کہا ہے لیکن مزید دو مقامات پر عیسیٰؑ کے ساتھ آپ کی والدہ کو بھی شامل کیا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک نشانی بنتے ہیں۔ ارشاد باری ہے :۔

(۱) وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱/۹۱)	اور ہم نے حضرت مریم اور اس کے بیٹے کو جہان والوں کیلئے نشانی بنایا۔
(۲) وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً (۲۳/۵۰)	اور ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشانی بنایا۔

آیت سے مراد نکاح مریم ہے؟ اب ظاہر ہے کہ اگر لنجعلہٗ میں ہٗ کا مرجع نکاح قرار دیا جائے تو اس نکاح میں حضرت عیسیٰؑ کا کیا دخل تھا؛ جب کہ مابعد کی دونوں آیات سے واضح ہے کہ ماں کے ساتھ بیٹے کا بھی اس آیت میں دخل تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہٗ کی ضمیر کا مرجع نکاح غلط ہے اور اسی طرح آیت کا معنی نمونہ بھی غلط ہے اور اصل بات یہی ہے کہ ہٗ کا مرجع حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہے اور چونکہ یہ بلا پدر ہوئی لہٰذا آیت ہے۔ اور اس آیت "میں حضرت عیسیٰؑ کا بھی ایسے ہی تعلق ہے جیسے اس کی والدہ کا۔ لیکن

نکاح کی صورت میں اس میں زکریا اور مریم تو شامل ہو سکتے ہیں۔ حضرت عیسٰی اور اُن کی والدہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہٗ کا مرجع نکاح غلط ہے۔

(۳) ناس کے معنی کو مطلق سے مقید کر کے اس کے معنی "منذور لوگ" کرنا اس لیئے غلط ہے کہ دوسری آیت میں آیۃً للعالمین کے الفاظ آگئے ہیں۔ کیا اب عالمین سے بھی مُراد منذور لوگ لیئے جا سکتے ہیں؟ ذرا ہوش فرمائیے:

لفظ آیۃً کی ایک نئی توجیہہ 'بڑا گھرانہ': عیونِ زمزم میں ایک دُوسرے مقام پر اثری صاحب نے آیۃً للنّاس کی ایک اور انوکھی توجیہہ پیش فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

(بوقت پیدائش عیسٰی یہود کو) "اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ بال بچوں میں گھریلو زندگی شروع کر کے عہدِ نذر کو توڑا گیا ہے اور خطرہ پڑ گیا ہے کہ اس کے بُرے اثر سے ہیکل کا کام درہم برہم ہو جائے گا۔ دُوسری طرف اصل مقصود کے طور پر تھا کہ اس بد رسم و رواج کو اُٹھا کر ضرورت مند مجردوں کی شادی کرائی جائے اور یہ کام کسی بڑے گھرانے سے شروع کیا جائے جس کے لیئے مریم صدیقہ نے اپنی جان کو پیش کیا۔ جس کا ثمرہ بھی (اللہ پاک نے اسے اچھا دیا۔ ولنجعلہٗ آیۃً للنّاس ورحمۃً منّا (مریم) وجعلنا ابن مریم وامّہٗ آیۃ (مومنون) وجعلنا ھا وابنھا آیۃ للعٰلمین (انبیاء)

......مثال کے طور پر مساوات کے سلسلہ میں رسول اللہ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا نکاح اپنے متبنّٰی آزاد کردہ غلام زید سے کر دیا۔ پھر جب ان کی آپس میں بدسلوکی ہو کر طلاق ہو گئی تو آپ نے اس کی دلجوئی کے پیشِ نظر اس سے خود نکاح فرما کر اس بد رسم و رواج کو مٹایا کہ متبنّٰی کی مطلقہ سے شادی درست نہیں...... ان دونوں مواقع پر آپ نے اپنے آپ کو پیش کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑے گھرانے سے اصلاحی کاموں کی ابتدا بہتر ہوتی ہے تاکہ چھوٹے لوگوں کی راہ میں مشکلات پیش نہ ہوں۔" (ع ص۱۱۱)

اَب دیکھئے کہ (۱) اگر سوال یہ ہوتا کہ "اصلاحی کاموں کی ابتدا کہاں سے ہونی چاہیئے؟" تو اس کے جواب میں یہ دونوں واقعات پیش کر کے ثابت کیا جا سکتا تھا کہ یہ کسی بڑے گھرانے سے ہونی چاہیئے"۔ لیکن مشکل یہ ہے اصل سوال یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ آیۃ" اور آیۃً للنّاس کا معنیٰ کیا ہے؟ پہلے موقعہ (یعنی پیدائش عیسٰی) کے لیئے تو اللہ تعالےٰ نے تین دفعہ آیۃ، آیۃً للنّاس اور آیۃً للعالمین فرما دیا ہے۔ دُوسرے اصلاحی واقعہ کے لیئے ایک دفعہ بھی کہیں صرف لفظ آیۃ کا استعمال فرمایا ہے جبکہ یہ دونوں اصلاحی کام بڑے گھرانہ سے شروع ہوئے ہیں؟

(۲)۔ ان دونوں واقعات میں اگر کوئی قدر مشترک ہے۔ تو وُہ صرف "بڑا گھرانہ" ہے۔ پہلے واقعہ کی جزئیات مجردوں اور منذوروں کی شادی کی ترویج کے طور پر حضرت مریم صدیقہ کا اپنی جان کو نکاح کے لیئے پیش کرنا جب مسلّم ہی نہیں تو ان واقعات کو منطبق بنانے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ اس سے مسئلہ زیرِ بحث کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

آیت ۲۲ مع اثری تفسیر

(۲۲) فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾	سو مریم حاملہ ہو گئیں اور اس حمل کو لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں۔	اور جب مریم شوہر کے ہمراہ روانہ ہوئی اور اپنے گھر آباد ہوئی تو وقت پر حمل ہو گیا اور ادھر سے اپنے شوہر کے ہمراہ کسی دنیوی ضرورت کیلئے کہیں دور دراز کا سفر بھی اختیار کرنا پڑا۔

قرآن کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ سے اس مخاطبت کے بعد حضرت مریم حاملہ ہو گئیں لیکن چونکہ کنواری تھیں اس لیئے لوگوں کی باتوں سے بچنے کی خاطر کسی دور افتادہ مقام میں جا کر گوشہ نشین ہو گئیں لیکن اثری صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اپنے شوہر سے مخاطبت کے بعد "مریم اس کے ہمراہ روانہ ہوئیں۔ پھر وقت پر حمل ٹھہر گیا اور ادھر سے اپنے شوہر کے ساتھ کسی دنیوی غرض کے لیئے کہیں دور دراز کا سفر بھی اختیار کرنا پڑا" پھر کسی دوسرے مقام پر بائیبل کے حوالہ سے یہ تصریح بھی فرما دی کہ یوسف نجار کو حکومت کی طرف سے مردم شماری کیلئے بیت اللحم کی طرف بھیجا گیا (صے ۱۳۹)۔ اثری صاحب اسی سفر میں حضرت مریم کو شوہر کے ساتھ روانہ فرما رہے ہیں گویا فانتبذت بہ میں ہ کا مرجع حمل نہیں بلکہ شوہر مریم ہے۔

مریم کی شوہر کے ساتھ روانگی: اب سوال یہ ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے انتبذت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جس کی طرف اثری صاحب کبھی توجہ نہیں فرماتے۔ انتبذ کے معنی صرف چلے جانا نہیں بلکہ جا کر گوشہ نشین ہونا ہے۔ اگر حضرت مریم شوہر کے ساتھ اپنے سسرال ہی گئی تھیں تو یہ عزلت نشینی کیونکر ہو سکتی ہے؟

(۲) دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ فحملتہ فانتبذت بہ بالکل متصل الفاظ اور ان دونوں کے ساتھ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ ان میں فحملتہ میں ہ کی ضمیر تو اثری صاحب عیسیٰؑ کی طرف موڑتے ہیں لیکن ساتھ ہی بہ میں ہ کی ضمیر کا مرجع یک لخت تبدیل کر کے اس کے شوہر کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اور اس طرح مریم کو شوہر کے ساتھ روانہ فرما دیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں مقامات پر ضمائر کا مرجع حضرت عیسیٰ کا حمل ہے۔

آیت ۲۳ مع اثری تفسیر

(۲۳) فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾	پھر درد زہ انہیں کھجور کے تنے کی طرف لے آیا کہنے لگیں "کاش میں اس وقت سے پہلے مر چکی اور بھولی بسری ہو گئی ہوتی۔	اور ایسا ہوا کہ بیت لحم میں ایک کھجور کے درخت کے پاس پہنچ کر اسے درد زہ شروع ہو گیا۔ افسوس کیا کہ اگر کسی بہتر ٹھکانا پر اس سے پہلے پہنچ گئی ہوتی تو اچھا ہوتا اور اتنی تکلیف نہ ہوتی۔

اثری لغت: (۱) فاجاءھا المخاض۔ اجاء فعل متعدی ہے۔ بمعنی آنے کو لازم ٹھہرانا۔ لے آنا (منجد) گویا

اس میں اختیار کے بجائے اضطرار پایا جاتا ہے۔ یعنی درد زہ کی تکلیف سے بیقرار ہو کر حضرت مریم اپنے گوشہ عزلت سے نکل کر باہر ایک کھجور کے تنا تک چلی آئیں۔ لیکن اثری صاحب اسے ایک اتفاقی امر قرار دے رہے ہیں لکھتے ہیں "اور ایسا ہوا کہ ......"

(۲) جِذۡعِ النَّخۡلَةِ کے معنی میں سے آپ جذع کا ترجمہ گول کر گئے۔ کھجور کا درخت صرف "النخلۃ" کا معنی ہے اور جذع النخلۃ۔ یعنی کھجور کے درخت کا تنا اور یہ معنی اثری صاحب کو خوب معلوم ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں بیان المختار میں آپ نے کَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَیۡهَا کے عنوان کے تحت اس لفظ پر بحث بھی فرمائی ہے مگر یہاں اس لفظ کا ترجمہ گول کرنے میں جو مصلحت ہے وہ آپ بھی سمجھتے ہی ہوں گے کہ اسی "جذع النخلۃ" سے ایک خرق عادت امر وابستہ ہے۔

حضرت مریم کا موت کی آرزو کا اصل سبب؟

جب وضع حمل کا وقت قریب آیا تو مریمؑ نے کہا "کاش میں اس وقت سے پہلے مر کر بھولی بسری بن چکی ہوتی"۔

قرآن کے تسلسل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس رسوائی کے ڈر سے آپ ایک دور افتادہ مقام پر آ کر گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ اب اس رسوائی یا لوگوں کی چہ میگوئیوں اور اعتراضات کا وقت سر پر آ پہنچا تھا۔ لہٰذا آپ کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے لیکن اثری صاحب کہتے ہیں کہ سفر میں درد زہ کی پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت کی وجہ سے انہوں نے ایسے الفاظ کہے تھے جو دو لحاظ سے غلط ہے:۔

(۱) حضرت مریمؑ کا شوہر ساتھ تھا اور جب وہ گھر سے عازم سفر ہوئے تھے تو ان دونوں کو خوب معلوم تھا کہ ایسا وقت عنقریب آنے والا ہے وہ سامان سفر یقیناً ساتھ لائے ہوں گے۔ پھر جس مشکل وقت کے لیئے انسان پہلے سے تیار ہو وہ مشکل ہوتا کب ہے؟ رہی درد زہ کی تکلیف تو یہ کوئی ایسی انوکھی تکلیف تو نہ تھی جو صرف حضرت مریم کو ہی پیش آئی ہو۔ وہ تو سب عورتوں کو پیش آتی ہی ہے۔ پھر اس موقعہ پر حضرت مریم کے ایسے بیقراری اور بے صبری کے الفاظ کہنے کا کیا مطلب؟ جو کبھی کسی عام عورت نے بھی نہیں کہے؟

(۲) ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے ہاں بڑی شان والا پہلوٹھا لڑکا پیدا ہونے والا ہے تو یہ ایسی خوشی کا مقام اور وقت تھا کہ عام عورتیں تو درد زہ کی تکلیف کو اس خوشی کی وجہ سے نہایت صبر سے برداشت کر لیتی ہیں۔ کبھی کسی نے مرنے کی آرزو نہیں کی۔ پھر آخر حضرت مریمؑ کو وہ کونسی انوکھی تکلیف پہنچی تھی جو وہ ایسے بے صبری کے الفاظ منہ سے نکالنے لگیں۔

شوہر مریم کی گمشدگی:

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب حضرت مریم کو درد زہ شروع ہوتا ہے اور ایسے موقع پہ شوہر کی ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، تو آپ اسے گم کر دیتے

ہیں۔ گویا اثری صاحب کے اس ڈرامہ سے شوہر صاحب کا کردار آئندہ کے لیئے ختم ہو جاتا ہے۔ ایک مقام پر یہ ضرور فرمایا ہے کہ وُہ کوئی دائی یا دوا لینے گیا ہوگا۔ لیکن وُہ مڑکر واپس نہیں آیا۔ نہ ہی اثری صاحب نے آئندہ کسی آیت کے تحت تفسیر میں شوہر صاحب کا اضافہ فرمایا ہے۔ آپ نے شوہر صاحب سے جو کام لینا تھا وُہ لے چکے۔

آیت ۲۴ تا ۲۶ کی اثری تفسیر

(۲۴) فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

سو اس کے نیچے سے فرشتہ نے اسے پکارا کہ غمناک نہ ہو۔ تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ بنا دیا ہے اور

"کھجور کے مالک نے جو اس کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور کھجوریں بیچ رہا تھا۔ ازراہِ انسانی ہمدردی مریم کو اس بات کی اجازت دیدی کہ جہاں سے چاہے، جب چاہے اور جتنی چاہے اس سے اتار کر تازہ بتازہ اپنے کام میں لائیے اور یہ نیچے چشمہ بھی بہہ رہا ہے۔" (ص۱۶۴)

(۲۵) وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ تم پر تر و تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔

(۲۶) فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

تو کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم کسی آدمی کو دیکھو تو کہو کہ میں نے خدا کے لیئے روزہ کی منت مانی ہے لہٰذا آج میں کسی آدمی سے کلام نہ کروں گی۔

"اس سے حسب ضرورت پانی بھی پیئے اور آرام کرے اور اگر کوئی بات چیت کرنے تو اسے یوں کہہ دے کہ میں نے وفائے نذر کے سلسلہ میں خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے لہٰذا باتوں سے معذور ہوں۔" (ص۱۶۵)

قرآن کریم کے تسلسل سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب مریمؑ کی زبان سے ایسے حسرت و یاس کے الفاظ نکلے۔ تو فوراً رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور نیچے سے ندائے غیب آئی کہ اے مریم اس درخت کے ٹنڈ کو ذرا اپنی طرف ہلاؤ تو تم پر تازہ بتازہ کھجوریں گر پڑیں گی اور دیکھو تمہارے پروردگار نے پانی کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے اور تمہارے نیچے ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ سو کھجوریں کھاؤ، پانی پیو اور اپنے بچّے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر کسی آدمی کو دیکھ پاؤ اور خطرہ محسوس کرو کہ وُہ کوئی بات نہ پوچھے یا اعتراض نہ کر دے تو کہہ دینا کہ میں نے آج اللہ کے نام کا روزہ رکھا ہے۔ لہٰذا آج میں کسی سے کلام نہ کروں گی۔

اب ان آیات میں تین باتیں ایسی آگئیں جو خرقِ عادت ہیں:

۱۔ ندائے غیب ۲۔ کھجور کے ٹنڈ سے تازہ کھجوروں کا جھڑنا اور ۳۔ چشمہ کا اجراء

یہ بھلا عقل پرستوں کو کیسے ہضم ہو سکتی ہیں لہٰذا ان کی تاویلات بھی سنیں اور اعتراضات بھی۔ چنانچہ اثری صاحب فرماتے ہیں:۔

ندائے غیب: "تفسیر سورۂ مریم میں سر سید مرحوم و مغفور نے فرمایا ہے کہ" ہمارے نزدیک آواز دینے والا نہ فرشتہ تھا نہ حضرت عیسیٰ بلکہ کوئی انسان تھا۔ جس نے حضرت مریم کی حالتِ اضطرار معلوم کر کے کہا کہ "گھبراؤ مت" اور فرمایا کہ یہاں سے لے کر رانبیاً تک اسی شخص کا کلام ہے۔" (ص: ۱۳۹)

اثری صاحب کو یہ تاویل بہت پسند آئی۔ اب اس پر اضافہ یہ فرماتے ہیں "میرے نزدیک یہ درخت کا مالک ہے جو ایسے موقع پر ہمدردی انسانی کے پیشِ نظر اجازت دے رہا ہے اور ممکن ہے کہ قیمت بھی ادا کر دی گئی ہوگی اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی حسبِ پسند جہاں سے جتنی چاہو اور جب چاہو اُتار اور اُترواکر (کسی سے) سکتے ہو۔ میری طرف سے پوری پوری اجازت ہے"۔ (ص ۱۳۹)

اب دیکھئے اس اقتباس میں اثری صاحب نے تین میں سے دو مسائل کو حل فرما دیا۔ ندائے غیب کا بھی اور درخت کے ٹنڈ سے تازہ کھجوریں جھڑنے کے معاملہ کا بھی۔ مگر ان باتوں کا کیا کیا جائے کہ:

کھجور کے ٹنڈ سے تازہ کھجوریں گرنا: (۱) قرآن میں اسی مقام پر دو بار جِذْعِ النَّخْلَةِ کا لفظ آیا ہے النخلہ کا کہیں ذکر نہیں لیکن آپ اسے کھجور کا باردار درخت قرار دے رہے ہیں۔

(۲) یہاں کوئی نخلستان یا کھجوروں کا باغ نہ تھا۔ بلکہ صرف ایک کھجور کا تنا تھا۔ اگر اسے اثری صاحب کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے النخلہ کھجور کا ایک باروار درخت ہی سمجھ لیا جائے۔ تو کیا آپ نے کوئی ایسا شخص بھی دیکھا ہے جس کا صرف ایک کھجور کا درخت ہو۔ اور وہ اس ایک درخت کا پھل اُتار کر اسی مقام پر کھجوروں کی دکان لگا کر بیٹھ جائے۔ ایسی بات تو پورے باغ کی صورت میں بھی نہیں ہوتی۔ عموماً پھل توڑ کر قصبوں اور شہروں میں برائے فروخت بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ بڑا بیکار اور ناکارہ قسم کا انسان تھا جو وہیں ایک کھجور کا پھل اتار کر اسی کے نیچے دکان لگا کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ جہاں کوئی بھولا بھٹکا گاہک ہی آ سکتا ہے کیونکہ وہاں آبادی تو ہوتی نہیں۔

(۳) جب اس کھجور کے مالک نے قیمت بھی پیشگی وصول پالی۔ تو وہ بہت خوش ہوا ہو گا کہ جنگل میں بیٹھے بیٹھے اس کی کھجوریں بک گئیں۔ پھر آخر اس کی انسانی ہمدردی کیا ہوئی؟

پھر اثری صاحب اس باغ کے مالک کی ندا کے لئے ایک علمی دلیل بھی مہیا فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:
"قراۃ مشہورہ میں (یعنی مصحف عثمانی میں جو آج کل رائج قرآن کا مستند نسخہ ہے اس میں) مِنْ جارہ ہے (یعنی مِنْ تَحْتِهَا ہے) اور دوسری قراۃ میں (اس قرات کا حوالہ آپ نے محفوظ رکھا ہے) میں مَنْ موصولہ ہے (یعنی مَنْ تَحْتَهَا ہے) اور مراد اس سے وہ شخص ہے جو کہ کھجور کا مالک ہے اور اس کے نیچے بیٹھا ہوا ہے اور

اسے فروخت کر رہا ہے"۔ (ص۔ ۱۳۹)

اب دیکھئے کہ یہ" دوسری قرأت" اگرچہ دورِ عثمانی سے متروک ہو چکی ہے تاہم آپ کو یہی پسند آئی ہے کہ آپ کے کام کی چیز ہے۔ لہٰذا قرأت موجودہ کو آپ نے معتبر نہیں سمجھا۔ علاوہ ازیں اگر اس دوسری قرأت کو بفرضِ تسلیم معتبر سمجھ بھی لیا جائے تو یہ کب لازم آتا ہے۔ کہ وہ کھجور کے درخت کا مالک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ کھجوریں بھی بیچ رہا ہو؟ اس سے تو کوئی بھی راہ چلتا مسافر مراد لیا جا سکتا ہے۔ آخر اس شخص کے کھجور کے مالک ہونے، کھجوریں فروخت کرنے قیمت وصول کر لینے کے بعد بھی "انسانی ہمدردی" جتانے اور مریم سے "انسی الیوم" میں ہمکلام ہونے کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟

چشمہ کا اجراء: اب رہا تیسرا معاملہ چشمہ کے جاری ہونے کا مسئلہ تو اس کے متعلق اثری صاحب کہتے ہیں کہ اس نیچے بیٹھے ہوئے کھجور کے مالک نے حضرت مریم کو یہ اطلاع بھی دی کہ "یہ نیچے چشمہ بہہ رہا ہے"۔ یہ ترجمہ ہوا قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا کا۔ یعنی جس چیز کو ایسے آڑے وقت میں جاری کر کے اللہ تعالیٰ نے خاص نعمت و انعام کا اظہار کیا ہے۔ اثری صاحب کے نزدیک یہ چشمہ پہلے سے ہی وہاں بہہ رہا تھا جو نہ مریم کو نظر آیا نہ اس کے شوہر صاحب کو (حالانکہ حضرت مریم اوپر ربوہ پر تھیں) لہٰذا کھجور کے مالک کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت پیش آئی۔

اثری صاحب کی منظر کشی: اب صورت حال یہ ہوئی ایک کھجور کا درخت ہے۔ اس پر پھل لگا ہوا ہے۔ کھجور کے نیچے ایک چشمہ بھی بہہ رہا ہے۔ اور نیچے مالک بیٹھا کھجوریں اتار کر فروخت بھی کر رہا ہے۔ لیکن حضرت مریم اوپر ایک ربوہ یا ٹیلہ پر ہیں۔ وضع حمل کا وقت ہے اور وہ ٹیلہ ایسا ہے جہاں سے حضرت مریم کا ہاتھ کھجوروں کے پھل تک پہنچ سکتا ہے یعنی وہ کوئی مینار کی قسم کا ٹیلہ ہے جو کھجور کے پھل تک اونچا ہے اس سے اونچا نہیں گیا۔ ورنہ اگر یہ ٹیلہ عام ٹیلوں جیسا ہوتا تب تو کھجور کا درخت بھی اسی ٹیلہ پر واقع ہوتا لیکن یہ ٹیلہ مخروطی تھا۔ جہاں سے حضرت مریم کا ہاتھ آسانی سے کھجوروں تک پہنچ پاتا تھا۔ اب کھجور کا مالک قیمت وصول کرنے کے بعد حضرت مریم کو ایسے نازک حالت میں اجازت دیتا ہے کہ درخت کی جس طرف سے جتنا چاہو، اور جب چاہو پھل اتار سکتی ہو اگر پانی کی ضرورت پڑے تو یہ نیچے چشمہ بھی بہہ رہا ہے اس ربوہ سے نیچے اتر کر یہاں آکر پانی بھی پی سکتی ہو۔ یہ تو اس کی انسانی ہمدردی تھی اور اثری صاحب کی انسانی ہمدردی یہ ہے کہ آپ نے ایسے آڑے وقت میں شوہر صاحب کو گم کر دیا۔ اور بتلایا کہ شاید وہ کسی دایہ کی تلاش میں چلا گیا ہو۔

رَبوہ کا منظر: اس منظر کشی کی ضرورت آپ کو اس لیے پڑی کہ قرآن میں ہے
وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ (۲۳ / ۵۰)
اور ہم نے مریم اور اس کے بیٹے کو ایک نشانی بنایا اور انہیں ایک ٹیلہ پر رہنے کی جگہ دی۔

اب یہاں ٹیلہ کا ذکر بھی ضروری تھا اور اگر کھجور کا درخت بھی اس ٹیلہ پر قرار دیتے تو پھر مِنْ تَحْتِهَا والی بات نہیں بنتی تھی۔ لہٰذا اس ٹیلہ کو مینار کی شکل کا بنا دیا۔ تاہم آپ کی تفسیر و تشریح میں دو باتیں پھر بھی کھٹکتی رہتی ہیں:

(۱) قرآن میں ہے وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ۔ یعنی اے مریم! تم کھجور کے ٹنڈ کو زور سے اپنی طرف ہلاؤ۔ یہ درخت تم پر اپنی کھجوریں گرائے گا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ میں کھجور کے مالک کے نیچے ہونے، مریم کو اجازت دینے، مریم کے ہاتھ سے پھل توڑنے کی کہیں گنجائش نکل سکتی ہے؟

(۲) قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا۔ تیرے پروردگار نے تیرے نیچے چشمہ بنا دیا ہے۔ اب اثری صاحب اس قصہ میں ربّ تو زکریا کو قرار دے چکے ہیں اور وہ نہ اس بات پر قادر ہیں اور نہ یہاں موجود ہیں اور اگر یہاں رب کا معنی پروردگار ہے تو بھی کم از کم ترجمہ و تشریح میں اس کا نام تو لینا ہی چاہیئے تھا۔

قَرِّي عَيْنًا سے شوہر کا ثبوت: قَرِّي عَيْنًا یعنی تفسیر میں تو اثری صاحب نے "اور آرام کرے" فرمائے ہیں۔ مگر تشریح میں خوب زہر اُگلا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"آنکھوں کی ٹھنڈک بھی وہی بچہ ہوتا ہے جو کہ ماں باپ دونوں سے (جائز طریقہ سے) پیدا ہوا ہو۔ صرف ماں سے نہ پیدا ہو سکتا ہے نہ آنکھوں کی ٹھنڈک کہلا سکتا ہے؟ .... فرعون کی عورت نے موسیٰؑ کی بابت یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اگرچہ اس کے ماں باپ دونوں کی بابت انہیں کچھ معلوم نہیں پھر بھی ان میں سے کسی کو بھی یہ وہم نہیں گزرا کہ یہ بچہ ماں باپ کے بغیر یوں ہی اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ عیسیٰؑ کی بابت یہ خیال کیوں پیدا ہو گیا کہ اس کا کوئی باپ نہیں۔ حالانکہ ان کے ماں باپ دونوں کا پتہ حسب نسب تک معلوم ہے۔" (ص ۱۲۱)

خُدا کی قُدرت کا تمسخر: اس اقتباس میں اثری صاحب نے عیسیٰ اور موسیٰ کا تقابل کر کے جس طرح خدا کی قدرت کاملہ یا معجزہ کا تمسخر اُڑایا ہے۔ وہ صاف ظاہر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے واقعات میں سوائے قرۃ عین کے لفظ کے اور کسی بھی قسم کی کوئی مناسبت ہے؟ بات ولادت مسیح کی چل رہی ہے۔ اب دیکھئے کہ قرآن نے :۔

(۱) حضرت مریم کو أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا کہا ہے۔ کیا حضرت موسیٰ کی والدہ کیلئے

ایسے لفظ کہیں آئے ہیں؟

(۲) حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کو آیۃً لِلنّاس، آیۃً اور آیۃً للعالمین کہا ہے کیا حضرت موسیٰ اور اس کی والدہ کو بھی ایسا کہا گیا ہے؟

(۳) حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے صدیقۃً اور قانتۃً کہا ہے۔ کیا موسیٰ کی والدہ کو بھی ایسا کہا گیا ہے؟

(۴) حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے رُوحٌ منہ اور کلمۃٌ منہ کہا ہے۔ کیا حضرت موسیٰ کو بھی ایسا کہا گیا ہے؟

(۵) حضرت مریم کو رسُول اللہ نے عذرا اور بتول کہا ہے کیا موسیٰ کی والدہ کو بھی ایسا کہا گیا ہے؟

پھر ان دونوں واقعات کو کیسے ایک دُوسرے پر منطبق کیا جا سکتا ہے جبکہ عیسیٰ کے ذکر سے مقصود اُن کی پیدائش کا ذکر ہے اور مُوسیٰ کے ذکر سے مقصُود پیدائش کے بعد ان کی تربیت کا ذکر ہے۔

اب رہی یہ بات کہ میاں بیوی سے پیدا شدہ بچہ ہی آنکھوں کی ٹھنڈک کہلا سکتا ہے۔ یہ کلیہ ہی سرے سے غلط ہے اگر یہ بات ہوتی تو جانوروں کی ماؤں کو کبھی اپنے بچوں سے پیار نہ ہوتا۔ آنکھوں کی ٹھنڈک تو زانیہ کو بھی اپنے بچے سے ہوتی ہے ورنہ حرامی بچے کبھی تربیت نہ پا سکتے۔ اور عیسیٰ کی بلا باپ ولادت تو حضرت مریم کا ایک ایسا شرف ہے جو ان کے علاوہ کسی عورت کو نصیب نہ ہوا۔ پھر بھلا عیسیٰ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کیوں نہ ہوتے؟ حضرت مریم کا کوئی جائز یا ناجائز شوہر ثابت کر کے حضرت عیسیٰ کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دینا یہودی ذہن کی پیداوار تو ہو سکتا ہے۔ مسلمان بھلا اسے کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ اور باپ کا نسب نامہ بھی یہودی اور عیسائی تو بتلا سکتے ہیں پھر یا وہ لوگ جو اسرائیلیات کو قرآن پر ترجیح دیتے ہوں۔

فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا پر اعتراض:

سرسید کی اس بات کو کہ "وھزّی الیک سے لے کر انسیًّا تک (یعنی آیت ۲۴، ۲۵، ۲۶) کسی انسان کا کلام ہے فرشتہ کا نہیں"۔ برحق ثابت کرنے کے لیئے اور یہ بات واضح کرنے کے لیئے کہ یہ کلام درخت کے مالک کا ہے۔ اثری صاحب نے قرآن کی مذکورہ آیت کو بھی تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہاں میرے ترجمہ سے بہتر اور کوئی ترجمہ ٹھیک نہیں۔ (وہ آپ کا ترجمہ ایک دفعہ پھر سامنے لائیے" اور کوئی بات چیت کرے تو اسے یُوں کہہ دے کہ میں نے وفائے نذر کے لیئے خاموشی کا روزہ رکھا ہُوا ہے۔ لہٰذا باتوں سے معذور ہوں"۔ (ص ۱۷۵) کیونکہ یہ دونوں بزرگ (یعنی جبرئیل یا عیسیٰ) کذب گوئی کی تلقین سے پاک ہیں اور مریمؑ اس کی تعمیل سے پاک ہے نہ اس نے کوئی نذر مانی ہوئی ہے اور نہ یہ کہ اتنی طویل بات انی نذرت للرحمٰن صومًا فلن اکلم الیوم انسیًّا (مریم) اشارے سے سمجھائی جا سکتی ہے .... اور یہ سب صاحب نخلہ کی ہمدردی ہے مگر قابلِ عمل نہیں کہ اس (غلط اور خلاف واقع) بہانہ سے ہر کوئی

خود اس کے پاس آکر بات چیت نہ کرے گا کہ ایسے نازک موقع پر ڈاکٹری اور طبی طور پر بھی باتوں سے روک تھام ہوتی ہے۔ جس کے لیئے ایک آدھ دن کافی ہوتا ہے جیسے کہ اُلیوم سے ظاہر ہے اگر وہ عذر ہوتا جو کہ مشہور ہے تو پھر یہ قید فضول ہو جاتی کہ اچھا آج اسے روزہ پورا کرنے دو۔ کل، پرسوں، اترسوں اس سے بات چیت کر لی جائے گی۔ دریں صورت یہ غلط عذر بھی بے کار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہی مطلب ٹھیک ہے جو کہ اُوپر بیان ہُوا ہے"۔ (ص: ۱۴۰)

اِس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) نفوثی سے انبیاء تک جبرائیل کا کلام نہیں ہو سکتا۔ جبرئیل بھلا اس دروغ بیانی پر مریمؑ کو کیسے اُبھار سکتا تھا جب کہ مریمؑ نے فی الواقعہ کوئی نذر تو مانی ہوئی نہیں تھی۔ اور حضرت مریم بھی اس دروغگوئی کی ہدایت پر تعمیل نہیں کر سکتی تھی۔ پھر وہ اتنی لمبی بات اشارے سے سمجھا بھی نہیں سکتی تھی۔

(۲)۔ یہ کلام صاحب تحلہ کا ہے جو ہمدردانہ اور قابلِ قدر ضرور ہے مگر قابلِ عمل یہ بھی نہیں۔ اس لحاظ سے تو ہمدردانہ ہے کہ وُہ آج کے دن لوگوں سے عام بات چیت نہ کرے کیونکہ ڈاکٹر اور طبیب بھی منع کرتے ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے بیکار ہے کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں آخر لوگ پوچھیں گے ہی کہ یہ بچہ کیسے پیدا ہُوا؟

(۳)۔ لہٰذا اصل مطلب وہی ٹھیک ہے۔ جو آپ نے بیان فرمایا ہے۔ وہ مطلب کیا ہے جو آپ نے بیان فرمایا ہے؟ وہ ہمیں ص۱۳۹، ۱۴۰ پر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا۔ بالآخر آپ کی عربی تفسیر کی طرف رجوع کیا تو ص۱۷۵ سے آپ کا ٹھیک مطلب یہ ملا کہ:۔

"اور اگر کوئی بات چیت کرے تو اُسے یُوں کہہ دے کہ مَیں نے وفائے نذر کے لیئے خاموشی کا روزہ رکھا ہُوا ہے۔ لہٰذا باتوں سے معذور ہوں"۔

اَب دیکھئے آپکے اس ٹھیک مطلب پر بھی وہ دونوں اعتراض بحال رہتے ہیں:

(۱) دروغ گوئی کا بھی کہ وفائے نذر کا روزہ فی الواقعہ رکھا ہوا نہ تو تھا۔

(۲) اور خاموشی کے روزہ کے باوجود اتنی لمبی بات کہہ دینے کا بھی۔ البتہ آپ نے یہ احتیاط ضرور فرمائی ہے کہ الیوم کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔

آیت ۲۷ و ۲۸ مع اثری تفسیر

(۲۷) فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوا	پھر وہ بچے کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس	پھر یہاں سے روانہ ہو کر اپنے گھر واپس آئی تو اس

يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾	آئیں وہ کہنے لگے مریم! یہ تو تونے بُرا کام کیا	کی گود میں بچہ دیکھ کر قوم نے سوال کیا کہ بڑی مادری عہد کو توڑ کر اس طرح گھریلو زندگی بسر کرنا شریعت کے خلاف ہے۔
(۲۸) يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا	اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ ہی بداطوار آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی۔	تمہارا باپ تو عہد شکن نہیں اور تمہاری ماں نے بھی کبھی ایسے کاموں کو پسند نہیں کیا۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ: اس بات میں عقل پرستوں میں اختلاف واقع ہو گیا کہ حضرت مریم کب بچہ کو اٹھائے ہوئے قوم کے پاس آئیں چنانچہ سرسید تو یہ فرماتے ہیں کہ:

”قرآن مجید سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ایسے وقت میں ہوا۔ جب حضرت عیسیٰ نبی ہو چکے تھے..... ”اٹھا لانے کا لفظ اس مقام پر مجازاً بولا گیا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ گود میں اٹھانا لازم نہیں آتا“

(ع ص ۱۴۴)۔

ایک نئی اُفتاد: سرسید کا یہ اقتباس درج کرنے کے بعد اثری صاحب فرماتے ہیں کہ: ”جس مشکل کے پیش نظر سید صاحب مرحوم نے یہ ترجمہ فرمایا ہے وہ میری راہ میں حائل نہیں“ (حوالہ ایضاً)

اور امام الدین گجراتی نے اپنی کتاب تنقیح فی ولادت المسیح میں حمل کی وسیع لغت پر بحث کرنے کے بعد بالآخر اس آیت کا ترجمہ یوں بیان کیا کہ:

”حضرت مریم حضرت مسیح کو باتوں میں بہلا پھسلا کر یہودیوں کے بزرگوں کے پاس لے آئیں“ (ع ۱۴۶)

اس ترجمہ پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے اثری صاحب فرماتے ہیں کہ جس مشکل کے پیش نظر یہ مطلب بیان کیا گیا ہے وہ میری راہ میں حائل نہیں“ (حوالہ ایضاً)

ان اقتباسات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) ان سب عقل پرستوں کو کوئی ایسی مشکل پیش آگئی ہے جس کی وجہ سے یہ مختلف تاویلات کے سہارے لے رہے ہیں۔

(۲) سرسید نے جو لکھا ہے کہ ”قرآن مجید سے صاف پایا جاتا ہے“ تو یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ اگر فی الواقعہ صاف پایا جاتا۔ تو اثری صاحب اس کو تسلیم کر لیتے۔

(۳) مشکل سب کے سامنے ایک ہے مگر تاویلات سب کی الگ الگ ہیں۔ البتہ اثری صاحب نے جو اس مشکل کا حل یا تاویل پیش فرمائی۔ اس پر انہیں ناز ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ مشکل ہے کیا، جس نے سب کو پریشان کر دیا؟ وہ مشکل دراصل یہ ہے کہ اس سے آگے آیت نمبر ۳۰ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ گود میں بول اٹھے"۔ اور یہ بات ان دوستوں کو کسی صورت گوارا نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا ہر صاحب نے مقدور بھر اس سے فرار کی کوشش کی۔ اب اثری صاحب نے اس کی تاویل پیش کی ہے جو اس مشکل میں ان کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی وہ یہ ہے کہ :۔

تکلّم فی المہد کا اثری مفہوم : " مہد میں کہل ہوسکتا ہے تو اس کے برعکس کہل میں بھی مہد ہوسکتا ہے جیسے کہ میری تفسیر سے ظاہر ہے کہ یُکَلِّمُ النَّاسَ کَہْلاً وَیُعَظِّمُ فِیْ اَحْکَامِ الْمَہْدِ" (ج ۲ صفحہ ۱۲۸)۔

اس لاجواب تاویل کے رموز و مطالب بھی کچھ سمجھے آپ؟ اثری صاحب فرما رہے ہیں کہ مہد میں کہل ہوسکتا ہے یعنی گھر گود یا پنگھوڑے میں بڑھاپا ہوسکتا ہے یا مزید آسان الفاظ میں اگر گود میں یا بچپنے میں بڑھاپے سے متعلق بات ہوسکتی ہے تو کہل میں بھی مہد ہوسکتا ہے یعنی بڑھاپے میں گود یا پنگھوڑا بھی ہوسکتا ہے یا مزید آسان الفاظ میں بڑھاپے میں بھی گویا بچپن سے متعلق یا بچپنے کی بات کی جاسکتی ہے اور یہی ان کی تفسیر سے ظاہر ہے کہ :۔

یُکَلِّمُ النَّاسَ کَہْلاً وَیُعَظِّمُ فِیْ اَحْکَامِ الْمُہْدِ وہ عیسیٰ لوگوں سے بات تو بڑھاپے میں کرے گا مگر وعظ کریگا گود کے احکام کے متعلق

اب خدارا انصاف فرمائیے کہ کچھ مشکل حل ہوئی؟ حضرت عیسیٰ کے بڑھاپے میں کلام کے متعلق تو کسی کو اعتراض ہے ہی نہیں وہ احکام المہد سے متعلق ہو یا دوسرے امور سے متعلق۔ مسئلہ زیر بحث تو یہ ہے کہ کیا انہوں نے گود میں کلام کیا؟ بتلائیے اس بات کا اثری صاحب نے اقرار کیا ہے یا انکار؟ اگر اقرار ہے تو مزید خرافات کا کچھ فائدہ نہیں اور اگر انکار ہے۔ تو صاف کہہ دینا چاہیئے یہ مناظرانہ عیاریاں کسی کو اگر وقتی طور پر پریشان کر بھی دیں تو اس سے اطمینان قلب تو حاصل نہیں ہوتا۔ تکلم فی المہد سے فرار کی جو راہیں آپ نے اختیار کی ہیں۔ اور جو نئے نئے مطالب پیش فرمائے ہیں۔ اس کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر آئے گی۔

شَیْئاً فَرِیًّا کا نیا مطلب : اس آیت کی تفسیر میں آپ نے قالُوْا کے معنی فرمائے ہیں "سوال کیا" اور شَیْئاً فَرِیًّا کے معنی تبلائے ہیں "مادری پدری عہد کو توڑ کر گھریلو زندگی بسر کرنا جو شریعت کے خلاف ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مادری پدری عہد شریعت تھی یا رسم رواج۔ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتے ہیں کہ "یہ بدعت انہوں نے خود بنا لی تھی ہم نے انہیں ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا" (۵۷/۲۷) پھر یہ شریعت کیونکر ہوئی؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت یا اس کے سیاق و سباق میں اس مادری پدری عہد کا کہیں ذکر ہے؟ آخر اس مقام پر اثری صاحب کو اس مادری پدری عہد کی کیا سوجھی؟

یہ تو تفسیر تھی اور یہاں اس عہد کو ذکر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ البتہ کسی دوسرے مقام پر "فریاً" کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فریاً بمعنی قطع و تراش اور توڑ پھوڑ اور اختلاق اور اعجوبہ بے مثال کو کہا جاتا ہے بمطلب یہ ہے کہ (اے مریم!) تیرا یہ بیان کہ میری والدہ ماجدہ (حنہ زوجہ عمران) نے مجھے نذر میں دے کر یوں بھی کہا تھا کہ "خدایا! میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں"۔ تیرا اپنا اختراع ہے اور اس (یعنی اپنی ماں حنہ) پر افترا ہے۔ اس مرحومہ نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا تھا اور کہ تو نے یہ بیان دے کر جو نکاح کیا ہے کہ ماں کی دعا کے مطابق اولاد پیدا کرے تو تو نے سابقہ شریعت کو توڑا پھوڑا ہے۔ اور ایک نئی شریعت تراشی ہے"۔ (ع ص ۱۲۲)

اب دیکھئے اس عبارت میں آپ نے فریاً کے دو معنی بتلائے ہیں:

(۱) فریاً۔ معنی افترا۔ جھوٹ اور بہتان۔ حالانکہ فریاً اور افترا، بالکل الگ الگ لفظ ہیں اور ان کے معنی بھی الگ ہیں جیسا کہ آپ کے بیان ہی سے ظاہر ہے اور یہ افترا یہ تھا کہ جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو یہود نے کہا کہ یہ بچہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ تو مریم کہنے لگی کہ میری ماں نے جب نذر مانی تھی تو یہ بھی کہا تھا کہ اے اللہ! اسے اور اس کی اولاد کو شیطان سے محفوظ رکھنا۔ گویا بالواسطہ میری ماں نے مجھے نکاح اور اولاد پیدا کرنے کی اجازت دی تھی تو یہود کہنے لگے۔ تم جھوٹ کہتی ہو تمہارا یہ اپنی ماں پر افترا یا بہتان ہے۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ولادتِ مسیح کے موقع پر کوئی ایسا مکالمہ ہوا تھا؟ یا اس کا ثبوت قرآن یا حدیث و آثار سے ملتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جس بات کی سمجھ صحابہ کرامؓ کو نہ آئی وہ اثری صاحب کو کہاں سے آگئی؟ اگر قرآن و حدیث میں نہیں تو اسرائیلیات سے ہی اس کا حوالہ پیش کر دیا جانا چاہیئے تھا۔

(۲) اور دوسرا معنی آپ نے توڑ پھوڑ اور تراش تک محدود رکھا ہے۔ البتہ اس کا شریعت سے رابطہ قائم کر دیا ہے یعنی مریم نے سابقہ شریعت کو توڑا اور نئی شریعت تراشی۔ یہاں بھی وہی سوال ہے کہ مجردانہ زندگی رسم و رواج تو تھا مگر شریعت نہ تھی۔ پھر مریم نے کونسی سابقہ شریعت توڑی اور نئی شریعت تراشی تھی؟

اِمْرَأَ سَوْءٍ اور بَغِيًّا کے معنی عہد شکن؟

اس آیت کا تفسیری معنی تو آپ دیکھ چکے کہ: امرء سوء کے معنی عہد شکن ہے اور بغیاً کے معنی ہیں "جو ایسے کاموں کو پسند نہ کرے"۔

اب دیکھئے:۔ تاویلات کے پھندے اور اندازِ فکر میں تبدیلی نے اس عالم دین شخص کو کس قدر تجاہل

عارفانہ پر مجبور کر دیا ہے۔ عہد شکنی کے لیے قرآن کریم میں نقض اور نکث کے الفاظ بارہا استعمال ہوئے ہیں۔ اگر یہاں عہد شکن بتلانا ہی مقصود تھا تو پھر یہاں امرأ سوء اور بغیاً کے الفاظ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ انہیں الفاظ کے معنی دوسرے مقام پر اثری صاحب بھی بدکار ہی کرتے ہیں اور بغاء بھی بدکاری بتلاتے ہیں۔

اب ذرا ان الفاظ کی اثری تشریح بھی ملاحظہ فرما لیجئے (یہود ولادت مسیح کے موقع پر حضرت مریم سے کہہ رہے ہیں)۔

"چونکہ ایسا نکاح دراصل زنا ہے۔ تو کیا تیرے ماں باپ نے اسے جائز رکھا تھا؟ نذر تو ایک معاہدہ ہے جس میں ترکِ نکاح لازم ہے۔ تیرا باپ تو عہد شکن نہیں تھا اور تیری ماں زناکار (مجوزہ زنا) نہیں تھی۔ یہ سب تیرا اپنا افترا ہے جو تو نے کیا ہے"۔ (ص: ۱۲۳)

اثری صاحب کی ایسی تشریحات دیکھ کر کسی کا یہ شعر بہت یاد آنے لگتا ہے ؎

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ٭ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!!

اثری صاحب کو جو عیسیٰ کا باپ ثابت کرنے کا جنون لاحق ہوا تو ایسی تاویلات پیش کیں جن پر انہیں خود بھی اطمینان نہیں ہوتا تو پھر اسے الفاظ کے گورکھ دھندے سے اور بھی پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ اس عبارت میں آپ نے بغیاً کا معنی زناکار تو کر دیا۔ پھر کوئی اور خیال اٹھا تو اسے (مجوزہ زنا) فرما کر پھر اسے پیچیدہ بنا دیا۔

یہ سورۃ مکہ میں ہجرت حبشہ سے پہلے نازل ہوئی۔ مکہ میں کوئی یہودی موجود نہ تھا اب یہ جو آپ ولادت مسیح سے متعلق یہودیوں کے مکالمے حضرت مریم سے کروا رہے ہیں۔ کیا قرآن کے مخاطبین اولین انہیں سمجھے ہوں گے؟ اگر سمجھتے تو یقیناً یہ حدیث و آثار میں مل جاتے۔ بصورت دیگر اسے اثری صاحب کے اختراع اور افتراء کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

شوہر مریم کی بے وفائی: ایک اور بات جو یہاں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ وضع کے وقت اثری صاحب نے شوہر صاحب کو جو دوائی لینے یا دایہ تلاش کرنے بھیجا تھا۔ وہ کدھر گیا؟ آیا وہ وضع حمل کے ساتھ ہی فوت ہو گیا تھا؟ اور اگر زندہ تھا تو اسے ضرور حضرت مریم کے ساتھ واپس آنا چاہیے تھا۔ یا کم از کم اسے سرکاری کام سے فارغ ہو کر خود حضرت مریم کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔ یہ بھی عجب بے وفا قسم کا شوہر تھا کہ وضع حمل کا وقت آیا تو اس وقت بھی غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد جب آپ واپس قوم کے پاس عیسیٰ کو اٹھائے ہوئے آتی ہیں۔ تو پھر غائب ہے اور اعتراضات یہود کا نشانہ بیچاری اکیلی مریم کو بننا پڑتا ہے۔ پھر یہ بات بھی فیصلہ طلب ہے کہ حضرت مریم اپنے میکے گھر واپس آتی ہیں یا اپنے سسرال کے گھر، جو مشرقی جانب واقع تھا۔ دستور

کے مطابق تو انہیں سسرال کے گھر ہی جانا چاہیئے تھا۔ تاہم یہ اثری صاحب کی مرضی پر منحصر ہے کہ انہیں جہاں چاہیں بھیج دیں۔

آیت ۲۹ مع اثری تفسیر

(۲۹) فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ ۔ قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا (۲۹)	تو مریم نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگے ہم اس لڑکے سے جو گود کا بچہ ہے۔ کیسے بات کریں۔	مریم نے اپنے مربی زکریا کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے بات چیت کرو جس نے یہ کام کیا ہے اور وہی اس کا کرتا دھرتا ہے انہوں نے کہا کہ تیرے اس نکاح کا دوسروں پر بہت برا اثر پڑا ہے کہ تجھے دیکھ کر وہ سب بچے جو اپنی ماں کی گود میں منذور ہو چکے ہیں جوان ہو کر تیری طرح نکاح پر تیار ہوں گے تو ہم انہیں کیا جواب دیں گے۔ تو نے تو ہیکل کا سارا نظام ہی درہم برہم کر دیا۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ کا مشارُ الیہ کون؟

اس آیت میں "فاشارت الیہ" کی مزید تشریح اثری صاحب نے یوں فرمائی کہ:

"مشارٌ الیہ اس کے زکریا ہیں کہ انہوں نے ہی نکاح کرایا ہے ان سے ہی بات چیت کریں وہ اچھا جواب دیں گے ...... عیسیٰ اس کے مشارٌ الیہ ہرگز نہیں اور نہ انہوں نے کچھ جواب دیا ہے ...... پیدائش کے وقت تمام انسانوں کے بچے بے علم اور نادان رہتے ہیں اور بامعنی باتوں کے لیے علم کی ضرورت ہے جو بچوں میں نہیں پھر ان سے بات کی توقع کیسے؟ اور پھر وہ قانوناً ذمہ دار اور جوابدہ بھی نہیں۔ اچھا عام خیال کے مطابق بچہ نے جو بول کر بیان دیا ہے اس میں ماں کی صفائی کا کوئی بیان نہیں" (ص ۱۲۹)۔

حضرت زکریا کی خاموشی: ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ حضرت مریم اپنے میکے گھر آئی یا سسرال میں اور نیز یہ کہ کیا اس وقت حضرت زکریا وہاں موجود بھی تھے یا نہیں۔ ہم اثری صاحب کی بات مان لیتے ہیں کہ فاشارت الیہ کے مشارٌ الیہ عیسیٰ نہیں بلکہ زکریا ہیں تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر زکریا نے ان یہود کو کیا جواب دیا؟ کیا یہ عجیب قسم کی ستم ظریفی نہیں ہے کہ حضرت مریم پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے پھر وہ حضرت زکریا کی طرف جواب دینے کیلئے اشارہ بھی کرتی ہیں۔ اس نکاح کے ذمہ دار اور حضرت مریم کے کفیل اور ذمہ دار بھی وہی ہیں مگر خاموش تماشائی بنے کھڑے ہیں۔ کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیتے۔

اصل مشکل: اب وُہ مشکل اثری صاحب کو پیش آ ہی گئی۔ جس سے نپٹنے کے لیے سر سید اور امام دین گجراتی تاویلات اور حیلے سوچ رہے تھے اور وُہ مشکل یہ ہے کہ بچّہ بے علم اور نادان ہوتا ہے۔ اس سے بات کی توقع کیسے؟ خصوصاً جبکہ وہ جواب دہ اور ذمہ دار بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کا بہتر حل اثری صاحب نے یہ سوچا کہ زکریا ہوں نہ ہوں مشارٌ الیہ انہیں بنا دو۔ اور کیفَ نُکلّمُ کے معنی کر لو۔ "ہم کیا جواب دیں گے" کیونکہ "جواب دینا" کے لیئے عربی میں اور کوئی لغت موجود نہیں۔

پھر فرماتے ہیں: "اچھا عام خیال کے مطابق (یعنی جو کچھ قرآن سے ایک صاف ذہن کے آدمی کو واضح ہوتا ہے) بچہ نے جو بول کر بیان دیا ہے۔ اس میں ماں کی صفائی کا کوئی بیان نہیں"

اب یہ آپ کو کون سمجھائے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بولنے کے بعد ان لوگوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا نہ ایسے اعتراض کا بوقت مخاطبت قرآن وحدیث وآثار سے کوئی ثبوت ملتا ہے تو ظاہر ہے کہ ماں کی صفائی از خود ہو گئی اور اعتراضات کا سلسلہ بند ہو گیا۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ جس طرح عیسیٰؑ کا گود میں بول اُٹھنا ایک خرقِ عادت اور معجزانہ بات ہے اسیطرح آپ کی بے پدری پیدائش بھی ایک معجزانہ بات ہے۔

قرآن کی عبارت کی اصلاح: اثری صاحب نے یہاں ایک اور نکتہ بھی بیان فرما دیا کہتے ہیں کہ اگر عیسیٰؑ مشارٌ الیہ ہوتے تو قرآن کی عبارت یوں ہونی چاہیئے تھی کہ کَیْفَ یُکَلِّمُنَا ھُوَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا کہ وُہ بچہ جو گود میں ہے۔ ہمارے اعتراض کا کیسے جواب دے سکتا ہے۔

گویا کلّم کا معنی بہرحال "اعتراض کا جواب دینا" ہی ہے۔ بات کرنا نہیں۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب دیکھئے کہ اثری صاحب کی اس آرزو کے مطابق سورۂ آل عمران میں اسی موقع ولادت کے مقام پر قرآن کے یہ الفاظ ہیں وہ یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا۔ (اثری ترجمہ: وُہ اعتراض کا جواب دے گا گود میں بھی اور بڑھاپے میں بھی) تو کیا اثری صاحب بے اپنے حسب پسند الفاظ کے بعد آپ نے عیسیٰؑ کا گود میں کلام کرنا مان لیا ہے؟ اس تکلّم فی المھد کے سلسلہ میں آپ نے تاویل کا جو کرشمہ دکھایا ہے اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ بیان فرمایا کہ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ سے صرف ایک بچّہ ہی نہیں اس طرح کے کئی بچے جو منذور ہیں۔ وہ مراد ہو سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت عیسیٰؑ منذور تھے؟ آپ کی والدہ مریم منذورہ ضرور تھی لیکن اصل بات تو عیسیٰؑ کی ہو رہی ہے۔ پھر قرآن میں یہ لفظ بھی نہیں کہ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ مُنذراً تو پھر آخر اس سے دوسرے منذور بچے کیسے مراد لیئے جا سکتے ہیں؟ جب کہ اصل محل کلام حضرت عیسیٰؑ ہیں اور وہ بھی منذور نہیں۔

تکلّم فی المھد کے مختلف مطالب: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تکلّم فی المھد کے جو معنی آپ نے بیان فرمائے اس پر اثری صاحب کی اپنی طبیعت بھی مطمئن نہیں۔ لہٰذا اور بھی بہت سے مطالب

ڈھونڈ نکالے ہیں۔ پہلا مطلب تھا ہم کیا جواب دیں گے، دوسرا تھا لوگوں کو بچوں کی تربیت کے اصول سکھلائیگا یعنی بتلائے گا تو بڑا ہو کر (بچپن میں کلام نہیں کرے گا) البتہ بتلائے گا بچوں کی تربیت کے اُصول جو کہ مہد کا ترجمہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے قرآنی الفاظ کی ترتیب گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

اب ان دو مطالب کے علاوہ باقی مطالب بھی بلا تبصرہ ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

مطلب ۳: تکلّم فی المہد کا ایک مطلب یہ بھی ہے "بچّہ زبان حال سے اپنی شکل وصُورت سے بول کر باپ کا پتہ دے" (ع۔ز۔ص ۲۰)

مطلب ۴: ایک مطلب یہ بھی ہے کہ "جو جو بچہ اپنی اپنی ماں کی گود میں منذور رہے اسے جوان ہو کر شرعاً نکاح کی اجازت ہے"۔ (ایضاً، ۱۲) پہلے مطلب میں کلّم کے معنیٰ "جواب دینا" ہے۔ اس مطلب میں کلّم کا معنیٰ "شرعی اجازت" ہے۔

مطلب ۵: "عیسیٰ نے زمین الٰہی پر سکونت کا ٹھیک ٹھیک دستور بتلایا کہ اس میں رہ کر اس طرح پاکیزہ زندگی بسر کرنا شریفوں کا کام ہے" (ب م ص ۳۸۵)

مطلب ۶: عیسیٰ نے لوگوں کو نیک عملوں کی دعوت دی تاکہ ان سے اس کی آخرت بہتر ہو سکے" (ایضاً)

مطلب ۷: عیسیٰ نے لوگوں کو دنیوی سامانوں سے فائدہ اُٹھانا بتایا کہ وہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت کی طرف مائل نہ ہوں" (حوالہ ایضاً)

مطلب ۸: عیسیٰ نے شاندار تمہیدی لیکچروں کی بنیاد ڈالی اور ذی علموں کو اس کی تلقین فرمائی تاکہ مواعظ مؤثر ہو سکیں۔ (حوالہ ایضاً)

مطلب ۹: "عیسیٰ نے ماؤں کو بچوں کی تربیت کے اُصول بتائے اور تربیت کے ڈھنگ سکھائے" (ص ۳۸۶)

تکلّم فی المہد کے اتنے مطالب ہو سکتے ہیں اور اگر نہیں ہو سکتا تو صرف وہ جو ربط آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا یہی قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا طریق ہے؟

آیت نمبر ۲ مع اثری تفسیر

(۳۰) قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۚ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (۳۰)	بچّے نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔	پھر اس کے بعد جب عیسیٰ جوان ہوئے اور اللہ پاک نے انہیں سابقہ کتابوں کا علم عطا فرمایا اور خود ان کو بھی نبوت و حکمت سے سرفراز فرمایا تو انہوں نے قوم میں اعلان فرمایا کہ میں اللہ پاک کا بندہ ہوں خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا جو میری طرف ایسا منسوب کرتا ہے مفتری ہے اور اللہ پاک نے مجھے کتاب انجیل دے کر نبی ٹھہرایا ہے۔

یہودیوں کے اعتراضات کا جواب کس نے دیا؟

اب دیکھئے اثری صاحب کے مطابق عیسیٰؑ کا بیان جوانی کا ہے۔ کیونکہ گود میں تو بچہ بول ہی نہیں سکتا کہ وہ نادان اور بے علم ہوتا ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہود نے جب اعتراضات کی بوچھاڑ کی تو حضرت مریم نے اس (عیسیٰؑ یا زکریا) کی طرف اشارہ کر دیا اور خود خاموش رہیں۔ زکریا نے بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا تو وہاں موجود ہی نہ تھے اور اگر موجود تھے تو بھی خاموش ہی رہے اور عیسیٰؑ بھی اس وقت کچھ نہ بول سکے کہ بچے اور نادان اور بے علم تھے تو آخر یہ ہنگامہ فرو کیسے ہوا؟ کیا یہودی آپ ہی آپ ساری بکواس کرتے رہے اور بالآخر اٹھ کر چلے گئے تھے؟ فافہم!

تلاعب بالقرآن:

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ فاشارت الیہ...... اور قَالَ اِنِّی عَبۡدُاللّٰہِ .... دونوں متصل آیات ہیں۔ اور دوسری آیت میں فاشارت الیہ کی تفعیل ہے۔ لیکن اثری صاحب قاری کے ذہن کو منتشر کرنے اور اسے دھوکہ دینے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ فاشارت الیہ کی تشریح تو ص۱۳۷ پر بیان فرماتے ہیں اور قَالَ اِنِّی عَبۡدُاللّٰہِ .... کی تشریح درمیان میں کئی دوسری بحثیں لانے کے بعد ص۱۴۵ پر درج فرماتے ہیں۔ غور فرمایئے کوئی خدا سے خوف رکھنے والا شخص ایسا کام کر سکتا ہے؟ لیکن اثری صاحب اپنی بات کی پیچ میں آ کر ہر طرح کے ناجائز حربے استعمال کر جاتے ہیں۔ جن کی مثالیں اس کتاب میں جا بجا مذکور ہیں۔ پھر عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق آپ اسے جوانی کا کلام ثابت کرنے کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ایسی مثال موجود ہے کہ جوانی کی بات کو وقت سے پہلے بیان کر دیا گیا ہو جیسے زکریا کو یحییٰؑ کی بشارت کے وقت ساتھ ہی یہ فرمایا یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ۔ مگر یہ کتاب یحییٰؑ کو پیدا ہونے پھر جوان ہونے کے بعد ملی اور کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ (ص۔۱۴۸) ہم مانتے ہیں کہ قرآن کریم میں صرف حضرت یحییٰ ہی کی نہیں اور بھی کئی مثالیں موجود ہوں گی مگر سوال یہ ہے کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ اور تو کسی مقام پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور یہاں اختلاف پیدا ہو گیا؟ وجہ ظاہر ہے کہ عام مسلمان قرآن سے ہدایت پاتے ہیں اور ربط آیات سے جو سمجھ آتی ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں مگر جن لوگوں کے زاویہ نظر میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور ان کے دل ٹیڑھے ہو جاتے ہیں وہ ربط آیات کا سلسلہ منقطع کر کے کج بحثی شروع کر دیتے ہیں۔ وہ قرآن سے ہدایت نہیں لیتے بلکہ اس سے اپنا مطلب کشید کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور یہی وہ مشکل ہے جس نے سرسید، امام الدین گجراتی اور حافظ اثری سب کو ان باتوں پر مجبور کر دیا۔

آیت ۳۱،۳۲ مع اثری تفسیر

(۳۱) وَّجَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ	اور میں جہاں ہوں اور جس حال میں ہوں	اور میں خواہ جہاں بھی ٹھہروں اللہ پاک کا وعدہ ہے

آیت	ترجمہ	تفسیر
وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (۳۱)	مجھے بابرکت بنایا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کا ارشاد فرمایا ہے	کہ میں تجھے برکت عطا کروں گا اور اس نے مجھے نماز و زکوٰۃ کی بھی تاکید فرمائی ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں اس کی پابندی کروں اور دوسروں سے بھی کراؤں۔
(۳۲) وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (۳۲)	اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے اور سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔	اور کہ اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کروں کہ وہ اب تک زندہ ہے اور اسلامی کاموں میں میرا ہاتھ بٹا رہی ہے اور کہ میں کسی کے لیے بھی تند خو اور سخت مزاج نہیں کہ اس نے مجھے ایسا ہی بنایا۔

شوہر مریم کی وفات کب ہوئی؟

اس آیت بَرًّا بِوَالِدَتِي کی تفسیر آپ نے یہ فرمائی کہ عیسیٰ کا باپ تھا تو ضرور مگر آپ کو یتیم چھوڑ کر فوت ہو گیا تھا۔ اس لیے صرف ماں کی فرمانبرداری کا ذکر کیا۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ وضع حمل کے وقت بھی آپ نے شوہر کو گم کر دیا تھا اور یہودیوں کے اعتراضات کے وقت بھی اسے گم کر دیا۔ وہ مرا کب؟ یہ تصریح بھی اب اثری صاحب ہی کی زبانی سنیئے:۔

"اس ضابطہ (پیدائش) سے عیسیٰ علیحدہ نہیں جیسے کہ انجیل میں ہے کہ وہ بارہ برس کے تھے اور اپنے والدین کے ہمراہ ایک سفر میں تھے کہ قافلہ سے بچھڑ گئے ماں باپ نے واپس ہو کر انہیں تلاش کیا تو مل گئے جیسے کہ لوقا باب ۲ میں ہے کہ "اس کی ماں نے کہا۔ بیٹا تو نے کیوں ہم سے ایسا کیا۔ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے؟...... عیسیٰ کی والدہ تو اپنا شوہر اور اس کا باپ بتا رہی ہے اور باپ بیٹا بھی دونوں اُسے تسلیم فرما رہے ہیں مگر صدیوں بعد لوگوں نے انہیں بے پدر بتایا اور آپ کی والدہ کو بے شوہر بتایا۔ کیا خوب ہے۔" (ص ۹۶)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) اثری صاحب عیسیٰ کا باپ ثابت کرنے کے سلسلہ میں قرآن، حدیث و آثار سب کے علی الرغم انجیل پر بھروسہ رکھتے اور اسے قابلِ حجت قرار دیتے ہیں اور جو لوگ انجیل کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا "کیا خوب ہے" کہہ کر مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔

(۲) وضع حمل اور یہودیوں کے اعتراضات کے وقت شوہر صاحب کا گم ہو جانا یا تو انتہا درجہ کی بے وفائی اور سنگدلی تھی یا پھر عیاری تھی۔

(۳) اس اقتباس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم بارہ برس کی عمر تک حضرت عیسیٰ کا باپ زندہ تھا۔ اور بارہ برس کے بعد ہی کسی وقت باپ کی وفات ہوئی ہوگی تو اتنی عمر تک پہنچنے پر انسان یتیم نہیں رہتا۔

یہ اقتباس لوقا باب ۲ آیت ۴۹ سے ماخوذ ہے۔ اب لوقا کے اسی باب اور اس سے پہلی آیت ۴۷، ۴۸

ہے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عیسیٰ کو حکمت اور نبوت مل چکی تھی۔ الفاظ یہ ہیں :۔

"اور تین روز کے بعد ایسا ہوا کہ انہوں نے (ماں باپ نے) اسے (عیسیٰ کو) ہیکل کے اُستادوں کے بیچ میں بیٹھے، ان کی سُنتے اور ان سے سوال کرتے ہوئے پایا۔ اور جتنے اس کی سُن رہے تھے اس کی سمجھ اور اس کے جوابوں سے دنگ تھے"۔ (لوقا باب ۲ آیت ۴۸ - ۴۷)۔

پھر اسی لوقا کی بعض دُوسری روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "حضرت عیسیٰ نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی حکمت و معرفت کا یہ عالم تھا کہ فقیہہ اور فریسی سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب انہوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دُوسرے سرے تک ہل چل مچ گئی۔ فقیہہ اور فریسی ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کم کرنے کے لیئے طرح طرح کے سوال کرتے مگر عیسیٰ انہیں دو لفظوں میں ایسے جواب دیتے کہ انہیں زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہُوا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہتے اور ان کی بادشاہی کے گیت گانے لگے"۔ (ماخوذ از تدبر قرآن ص۲۹۴ ج ۱)۔

اب دیکھئے کہ لوقا کی روایات سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲ برس کی عمر تک آپ کا باپ زندہ تھا وہیں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اس عمر میں نبوت و حکمت بھی مل چکی تھی۔ اب جب باپ ثابت کرنے کا مسئلہ ہو تو اثری صاحب انجیل کے بیان کو تسلیم کر لیتے ہیں اور جب نبوت اور بَرًّا بِوَالِدَتِیْ کا ذکر آئے تو ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ہی اثری صاحب باپ کو مار دیتے ہیں کیا یہ بات افتومنون ببعض الکتٰب وتکفرون ببعض کے مصداق نہیں؟

اب یہ تو واضح ہو گیا کہ اثری صاحب یا ان کے ہمخیال چند دوستوں نے عیسیٰ کے باپ ہونے کا تصور صرف بائیبل سے اخذ کیا ہے لیکن اس تصور میں بہت سے اختلافات ہیں جنہیں ہم ذیل میں واضح کرتے ہیں۔

اثری صاحب اور انجیل کے اختلافات

اثری صاحب اور انکے ہم خیال	بائیبل
(۱) حضرت مریم کے باقاعدہ نکاح کے قائل ہیں اور ہلبت کے بھی کہ یہ نکاح حضرت زکریا نے کیا تھا لیکن اس بات کے ثبوت میں وہ قرآن، حدیث و آثار تو کیا بائیبل سے بھی کوئی روایت پیش نہیں کر سکتے اور محض عام ضابطہ الٰہی کا سہارا لے کر معجزانہ ولادت عیسیٰ کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مریم کا جائز شوہر یوسف نجار	(۱) اناجیل کیمطابق حضرت مریم کی فرشتہ سے مخاطبت سے چھ ماہ پیشتر حضرت مریم کی یوسف نجار سے صرف منگنی ہوئی تھی۔ پھر جب واقعہ مخاطبت پیش آیا اور حضرت مریم حاملہ ہوگئیں تو یوسف کا دل ان سے نفرت کرنے لگا۔ پھر اسے خواب میں فرشتہ نظر آیا جس نے یوسف کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا اور ترغیب دلائی کہ ہونے والا لڑکا چونکہ بڑا ذیشان اور اللہ کا کلمہ ہے لہٰذا اسے [illegible]

ہے۔

(۲) اثری صاحب حضرت عیسیٰ کو یوسف نجار کا جائز بیٹا تسلیم کرتے ہیں اور اُن کا سلسلہ نسب بھی یوسف نجار کے واسطے سے آگے تک لے جاتے ہیں جبکہ قرآن کریم اور اسلامی روایات عیسیٰ کو صرف مریم کا بیٹا قرار دیتے پھر اس سلسلہ کو آل عمران سے ملاکر آدم تک پہنچاتے ہیں جیسا کہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں ولادت مسیح کے ذکر سے پہلے دونوں مقامات پر اس سلسلہ نسب کی تفصیل موجود ہے۔

اثری صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ عام قاعدہ کے مطابق اگر عیسیٰ کا باپ تھا تو سلسلہ نسب باپ کی طرف سے چلنا چاہیئے مگر قرآن نے ماں کی طرف سے چلایا ہے جس نے اثری صاحب کو بہت پریشان کر دیا کبھی کہتے ہیں کہ یوسف غیر اسرائیلی تھا۔ لیکن پھر اس کی خود ہی دوسرے مقام پر تردید بھی کر جاتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ ابنِ مریم نسب نہیں کنیت ہے اور "بلندی شان" کی بنا پر والدہ کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔

(۳) جہاں تک باپ ثابت کرنے کی بات ہے وہ اناجیل سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ خواہ انجیل اسے مُنہ بولا باپ کہے اور آپ اسے حقیقی باپ قرار دیں لیکن جن نازک مرحلوں پر باپ کی شدید ضرورت ہوتی ہے اسے گم کر دیتے ہیں۔ اور "برًّا بوالدتی" کے موقعہ پر بھی اُسے فوت شدہ تسلیم کرتے ہیں۔

گھر لے جانا چاہیئے چنانچہ یوسف وضع عیسیٰ کے بعد اُسے اپنے گھر لے آیا پھر نکاح بھی ہوا اور حضرت مریم کے ہاں مزید اولاد بھی ہوئی لہٰذا اناجیل یوسف کو حضرت عیسیٰ کا منہ بولا باپ اور عیسیٰ کو یوسف کا منہ بولا بیٹا تسلیم کرتی ہیں۔ حقیقی باپ تسلیم نہیں کرتیں۔

(۲) اناجیل حضرت عیسیٰ کو منہ بولا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ان کا نسب یوسف کے واسطے سے آگے چلاتی ہیں لیکن عیسیٰ کو یوسف کا صلبی بیٹا تسلیم نہیں کرتیں پھر عیسیٰ کے باپ کے سلسلہ میں انکے کئی گروہ ہیں مثلاً

(ا) وُہ عیسائی جو حق پرست تھے اور عیسیٰ کو بے پدر مانتے تھے اور انہیں صرف اللہ کا کلمہ اور اس کی طرف سے رُوح قرار دیتے ہیں جیسا کہ نجاشی نے برسرِ دربار اس صحیح عقیدہ کا اظہار کیا۔

(ب) وُہ عیسائی جو عیسیٰ کے بے پدر ہونے کی وجہ سے انہیں ابن اللہ کہنے لگے۔

(ج) وُہ عیسائی جو عیسیٰ کی اس معجزانہ پیدائش کی وجہ سے عیسیٰ اور مریم دونوں کو خدا کا جزو قرار دینے لگے۔ ان کے خیال میں خدائی اللہ، مریم اور عیسیٰ تین حصّوں میں بٹ گئی۔

انکے علاوہ چوتھا فریق یہود کا ہے جنہوں نے ولادت مسیح کے وقت حضرت مریم پر بدزنا کا الزام لگایا۔ پھر جب عیسیٰ نے گود میں ہی کلام شروع کر دیا تو دبک گئے۔ اور آپ کی زندگی میں آپکی وجاہت شان کے پیش نظر اس الزام کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر وفاتِ عیسیٰ کے بعد جب یہودیوں اور عیسائیوں میں چپقلش بڑھی تو اس دشمنی میں پھر سے حضرت مریم پر زنا کا الزام عائد کر دیا۔

(۳) ولادت عیسیٰ کے بعد یوسف نجار کی تادیر زندگی ثابت کرتی ہیں۔ ۱۲ سال کا عرصہ تو کم از کم ہے۔ پھر حضرت مریم کے ہاں یوسف سے چھ اولادیں بھی ہوئیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف ولادت مسیح کے بعد کافی مدت زندہ رہا۔ اور اس وقت بھی زندہ تھا جب حضرت عیسیٰ نبی تھے۔

باب ۵

سورۂ آل عمران کی متعلقہ آیات اور ولادت مسیح

اب ذرا سورۂ آل عمران کی چند آیات کی اثری تفسیر بھی ملاحظہ فرمایئے :۔

آیت ۴۵، ۴۶، ۴۷ مع اثری تفسیر

آیت	ترجمہ	اثری تفسیر
اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾	جب فرشتوں نے کہا اے مریم! خدا تمہیں ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا جو دنیا اور آخرت میں باآبرو اور خدا کے مقربین سے ہوگا	اچھا تو فرشتوں نے یوں بھی پکارا کہ اے مریم! اللہ پاک تجھے اپنے کلام اور الہام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے کہ تیرے لڑکا ہوگا۔ اس کا نام عیسیٰ ٹھہرایا ہے اور لقب مسیح قرار دیا ہے اور کنیت ابن مریم بتائی ہے اور دنیا اور آخرت کے کاموں میں بہت ہوشیار و باوقار ہوگا (بہ ص ۱۶۹)
وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾	اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر دونوں صورتوں میں یکساں لوگوں سے گفتگو کرے گا اور نیکوکاروں میں ہوگا!	اور ادھیڑ عمر میں لیکچر شروع کرے گا اور بچوں کی تربیت کے اصول بتلائے گا اور بڑی قومی اصلاح کرے گا۔
قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾	مریم نے کہا اے میرے پروردگار! میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ فرمایا اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب "کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ارشاد فرماتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتا ہے	اس (مریم) نے عرض کی۔ بچہ کیسے؟ ابھی تک تو مجھے شوہر نے چھوا تک نہیں اور حالات کے لحاظ سے کوئی امید بھی نہیں۔ فرمایا کہ کوئی استحالہ نہیں۔ جب اللہ پاک کا ارادہ ہوتا ہے تو تمام موانع دور ہو کر سب حالات موافق ہوجاتے ہیں (بہ ص ۱۷۰)

ندائے غیب اور بشراً سویًّا:

اب دیکھیے آیت نمبر ۴۵ میں اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ جمع کا صیغہ استعمال فرمایا اور اسی سورہ کی آیت ۴۲ میں بھی جمع کا صیغہ استعمال کیا اور فرمایا :۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ الآیۃ اس کی تفسیر اثری صاحب نے یوں فرمائی کہ "اللہ نے مریمؑ سے خواہ زکریا علیہ السلام کے توسط سے یا کہ خواب میں فرشتوں کی زبانی پیام روانہ فرمایا"۔ (ص ۱۶۸)

گویا اثری صاحب کو فرشتوں کے مریم سے ہمکلام ہونے سے بہرحال انکار ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق یا تو الملٰئکۃ

کا معنی "اللہ پاک" ہے یا پھر اگر فرشتے ہی ہیں تو یہ خواب کی بات ہے، بیداری کی نہیں۔ پھر یہ کلام بواسطہ زکریاؑ ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اس آیت میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جس میں اس بات کا اشارہ تک مل سکے۔ غالباً اثری صاحب کا یہ خیال ہے کہ مریم چونکہ نبیہ نہیں۔ اس لیے فرشتے ان سے کیسے ہمکلام ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات قرآن کریم سے واضح الفاظ کے ساتھ کئی مقامات پر ثابت ہے۔ جس طرح کہ اُمِ موسیٰ بلکہ جانوروں تک کو اللہ تعالیٰ کا وحی کرنا ثابت ہے۔

حضرت مریم کے سامنے فرشتہ کا انسانی شکل اختیار کرنا:

یہ فرشتوں کی ندا ہے جو غیر مرئی ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایسی ندا کو ہاتف غیبی بھی کہتے ہیں اور اس ہاتف غیبی کی ندا کو اثری صاحب نے خود بھی ایک دوسرے مقام پر تسلیم کر لیا ہے۔ مگر یہاں اس مقام پر آپ کو اس لیے انکار ہے کہ آپ تو فرشتوں کی جگہ شوہر صاحب یعنی یوسف نجار کو روانہ فرما رہے ہیں تو اب یہاں اس ندائے غیبی کو کیونکر تسلیم کریں؟ انہی فرشتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ مریم میں روح کا لفظ استعمال کیا اور فرمایا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا (۱۹/۱۷) پھر جب مریم اس ندا کی طرف متوجہ ہوئیں تو اسی مقام پر جہاں سے یہ ندا آ رہی تھی یہ ندا بتدریج ایک تندرست انسان کی شکل میں متشکل ہو گئی۔ گویا روح یا فرشتوں نے ہی انسانی شکل کا روپ دھارا اور وہ حضرت مریم سے اور حضرت مریم ان سے ہمکلام ہوئیں جیسا کہ اسی آیت کے اگلے الفاظ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا سے واضح ہے۔

گویا ابتداءً یہ ندائے غیب تھی جو حضرت مریم کے دیکھتے دیکھتے ایک انسانی شکل اختیار کر گئی یہ تبدیلی ہیئت حضرت مریم کی آنکھوں کے سامنے ہوئی لیکن اثری صاحب کے بھیجے ہوئے "شوہر صاحب" نے حضرت مریم کے سامنے اپنی شکل وصورت یا ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ آپ تمثیل کی بحث میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کے معنی صرف شکل وصورت کے نہیں بلکہ حالت کی تبدیلی بھی ہوتا ہے لیکن بات پھر بھی وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے کہ حضرت مریم کے سامنے اس کی حالت میں کیا تبدیلی ہوئی؟ اگر وہ نامرد یا بیمار یا بے رغبت (ملک یا فرشتہ) تھا پھر بارغبت انسان بن کر (بشراً سویاً ہو کر) حضرت مریم کے رب (مربی۔ زکریاؑ) کے رسول (قاصد) کی حیثیت سے آیا تھا۔ تو یہ تبدیلی تو حضرت مریم کے سامنے آنے سے پہلے ہی اس میں واقع ہو چکی تھی۔ حالانکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیٔ شکل (حالت) حضرت مریم کے سامنے ہوئی تھی۔ لہٰذا اثری صاحب کی یہ توجیہہ اپنی تمام تر تاویلات کے باوجود غلط ہے۔

کلمۃ اللہ کا اثری مفہوم:

قرآن کے الفاظ ہیں: "بکلمۃ منہ" یعنی فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے لیکن اثری صاحب کلمہ کے معنی فرماتے ہیں "کلام اور الہام کے ذریعہ" اس معنی کی تردید یا تغلیط کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں کیونکہ ان کی اپنی تحریر سے اس کی تغلیط ہو جاتی ہے جب وہ حضرت زکریا کا ذکر کرتے ہوئے قرآنی آیت اور اس کا ترجمہ یوں پیش فرماتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا (۳/۳۹)	"اللہ تجھے (اے زکریا) ایک بچہ کی خوشخبری سناتا ہے اور اس کا نام بھی یحییٰ تجویز کرتا ہے اور وُہ کلمہ کی تصدیق کرے گا اور سردار ہوگا اور امر بالمعروف کا پابند ہوگا۔" (ص ۱۶۸)

یہاں اس مقام پر آپ نے کلمہ کا ترجمہ کلام اور الہام کے ذریعہ" نہیں فرمایا۔ البتہ یہاں اللہ کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ شاید اس سے کوئی فائدہ پہنچتا ہو۔

کُنیت اور نسب کا فرق: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اسمه المسيح عيسى ابن مريم۔ یعنی اس "اللہ کی طرف سے "کلمہ" کا نام ہے۔ مسیح عیسیٰ بن مریم۔ لیکن آپ اس نام کے تین حصے فرماتے ہیں (۱) لقب مسیح (۲) نام عیسیٰ" (۳) ابن مریم کنیت" (ص ۶۶)

یعنی" ابن مریم" جو نام کا حصہ اور نسب سے متعلق تھا اسے کنیت بتلا کر فریب دینے کی کوشش فرمائی ہے اور پھر اس کنیت پر بہت سی طویل اور لایعنی بحث کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس بحث کا جائزہ لینے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کنیت اور نسب کا فرق سمجھ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ آیا "ابن مریم" کنیت ہے یا نسب؟

(۱) نسب کے لیئے صرف ابن اور بنت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جبکہ کنیت کے لیئے ان لفظوں کے علاوہ اب اور ام کے لفظ بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے ابولہب، ابوتراب، ابوالحسنات یا اُم کلثوم اور اُم معبد وغیرہ۔

(۲) ابن اور بنت کا استعمال اگر نسب کے لحاظ سے ہو تو والد کا نام ہی مذکور ہوگا جبکہ کنیت میں ابن اور بنت کے الفاظ ایک ادنیٰ سی نسبت کے لیئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں گویا کنیت میں ایک ادنیٰ سی نسبت کا اظہار ہوتا ہے جیسے :-

ا۔ ابوہریرۃ۔ کا یہ معنی (نعوذ باللہ) ہرگز نہیں آپ کسی بلی کے باپ تھے، بلکہ بلیوں سے پیار کی وجہ سے حضور اکرمؐ نے آپ کی یہ کنیت رکھ دی۔ ابوتراب حضرت علیؓ کی کنیت ہے۔ آپ ایک دن مسجد نبوی میں زمین پر لیٹے ہوئے تھے تو حضور اکرمؐ نے آپ کو ابوتراب کہہ دیا تو آپ کی یہ کنیت مشہور ہو گئی۔ ابولہب کا رنگ سُرخ تھا لہٰذا لوگوں میں سے کسی نے ابولہب کہہ دیا تو یہ کنیت مشہور ہو گئی۔ اسی طرح ابوالاعلیٰ ابوالحسنات ابوالوفا اور ابوالکلام میں ایک ادنیٰ سی نسبت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ابن ذات الفطاقین یا ابن بطوطہ کنیت ہے لہٰذا باپوں کے نام نہیں۔

ب۔ لوگ نوزائیدہ بچی کا نام اُم کلثوم رکھ دیتے ہیں حالانکہ یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وُہ شادی کی عمر تک

زندہ بھی رہ گئی یا نہیں اور اگر کسی عورت کو اس کے حقیقی بچے یا بچی کی طرف نسبت کر کے مثلاً اُمّ عائشہ کہہ دیا جائے تو بھی کُنیت ہی رہے گی۔ نسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ نسب والد کی طرف سے چلتا ہے۔

(ج)۔ ابن میں بھی کنیت کے لحاظ سے ایک ادنیٰ سی نسبت کافی ہوتی ہے۔ جیسے ابن السبیل (راستے کا بیٹا) یہ مسافر کی کنیت ہے ابن عشرین سنۃ" بمعنی ۲۰ سال کا۔ ابن بطوطہ بمعنی سیلانی آدمی' ابن الوقت' ابن ابی الدنیا وغیرہ ایسے الفاظ کنیت تو ہیں مگر یہ نسب نہیں۔ نسب یہ اسی وقت ہوگا جب ابن کے بعد اس کے والد یا دادا وغیرہ کا نام مذکور ہو جیسے ابن عبدالمطلب یا ابن حزم جو دادا کی پشت سے ہونا ثابت کرتے ہیں۔

(د) اسی طرح بنت العین آنسو کو کہتے ہیں اور بنت الکرم شراب کو' بنات الارض چھوٹی چھوٹی ندیوں کو کہتے ہیں اور بنات العصر زمانے کی سختیوں کو۔ ان سب الفاظ میں ایک نسبت ضرور ہے مگر فی الواقعہ یہ بیٹی یا بیٹیاں نہیں۔ لہٰذا یہ سب کُنیت ہیں مگر جب بنت کے بعد والد کا نام مذکور ہو تو یہ کنیت نہیں رہے گی بلکہ نسب ہوگا جیسے مریم بنت عمران۔ اس مثال میں چونکہ عمران فی الواقعہ مریمؑ کا باپ تھا لہٰذا یہ کنیت نہیں بلکہ نسب ہوگا۔

(۳)۔ بعض دفعہ کُنیت کے لیئے ادنیٰ نسبت کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ایک انسان خود اپنے لیئے کوئی کنیت پسند کرے یا کوئی شخص اس کے لیئے پسند کرے جیسے کہ مغیرہ بن شعبہؓ کے لیئے رسول اللہؐ نے ابوعیسیٰ کنیت تجویز فرمائی (رع ص۱۱۶) حالانکہ ان کا کوئی لڑکا عیسیٰ نامی نہ تھا۔ اسی طرح عمرو بن ہشام کو مسلمان تو ابُوجہل کہتے تھے مگر کافر ابوالحکم کہتے تھے۔

(۴)۔ اگر ابن کے بعد باپ کا نام آئے تو یہ نسب ہے جیسے ابن عباسؓ۔ ابن عبداللہ اور باپ کا نام نہ ہو تو یہ کنیت ہے نسب نہیں جیسے ابن ذات النطاقین اور ابن بطوطہ۔

(۵)۔ ایک شخص کی کُنیت ایک سے زیادہ بھی ہوسکتی ہیں مگر باپ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے جیسے عطاء بن السائب کی کنیت ابوالسائب بھی ہے ابُویزید بھی' ابُومحمدؐ اور ابوزید بھی خواہ یہ کنیتیں مختلف اوقات میں مختلف مشہور ہوئی ہوں تاہم یہ چاروں کنیتیں ایک ہی عطاء بن السائب کی ہیں [1]

(۶)۔ اللہ نے بعض انبیاء کے نام تو خود تجویز فرمائے ہیں جیسے یحیٰیؑ اور عیسیٰؑ مگر کبھی کسی کی کنیت تجویز نہیں فرمائی۔ لہٰذا عیسیٰ بن مریم نسب ہے۔ کنیت نہیں ہوسکتی۔

ابنِ مریم نسب ہے یا کنیت؟

مُندرجہ بالا تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابنِ مریم کنیت نہیں جیسا کہ اثری صاحب نے یہ تاثر دینا چاہا ہے بلکہ یہ نسب ہے۔ کیونکہ

(۱) حضرت مریم حضرت عیسیٰؑ کی فی الواقع والدہ تھیں لہٰذا یہ نسب ہے کُنیت نہیں یہاں نہ تو یہ بات ہے

---

[1] صحیح مسلم مترجم معہ نووی۔ مقدمہ ص ۱۸ مطبوعہ مکتبہ سعودیہ کراچی

کہ کوئی نسبت ہی نہ ہو نہ یہ کہ کوئی معمولی یا ادنیٰ سی نسبت ہو جیسے کہ کنیت کی صورت میں ہوتا ہے۔

(۲)۔ اللہ نے یہ نسبت ولدیت خود بیان فرمائی ہے اور اس کو نام کے حصّہ کی صورت میں پیش فرمایا ہے۔ جب کہ کسی دوسرے شخص کا نام کے ساتھ ولدیت کا ذکر قرآن میں بیان نہیں کیا گیا۔

(۳)۔ سورۂ مریم اور سورۂ آل عمران میں دونوں مقامات پر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے ذکر سے پہلے ان کا سلسلۂ نسب بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ نسب مختصراً یوں بیان فرماتا ہے۔ عیسیٰ بن مریم بنت عمران آلِ عمران۔ آلِ ابراہیم۔ نوح اور آدم گویا یہ نسب ماں کی وساطت سے حضرت آدم تک ملایا گیا ہے۔ عیسیٰ ابن مریم یعنی پورا نام قرآن میں کم از کم ۲۵ بار آیا ہے۔

سلسلۂ نسب ماں کی طرف سے کیوں؟

پہلا فریب تو اثری صاحب نے یہ دیا کہ ابنِ مریم نسب نہیں بلکہ کنیت ہے۔ حالانکہ اس بات کو آپ خوب سمجھتے تھے اور اس کی دلیل وہ مکالمات ہیں جو آپ نے مکالمہ ۳ اور مکالمہ ۴ کے زیرِ عنوان عیون زمزم کے ص۵۲ اور ص۵۳ پر درج فرمائے ہیں۔ مکالمہ ۳ کا ملخص یہ ہے کہ "ایک شخص یحییٰ بن یعمر خراسان میں حسنؓ اور حسینؓ کو رسول اللہؐ کی اولاد قرار دیتا تھا۔ حجاج حاکم وقت نے اس شخص کو اپنے ہاں بلایا اور اس دعویٰ کا ثبوت طلب کیا تو اُس نے سورۂ انعام کی آیت وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ سے استدلال کیا اور کہا کہ جس طرح عیسیٰ کو والدہ ماجدہ کی نسبت سے ابراہیمؑ کی ذریت میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح حسینؓ بھی فاطمہؓ کی نسبت سے ذریتِ رسول میں شمار ہو سکتے ہیں مکالمہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ حجاج نے اسے درست تسلیم کیا" (ع ص۵۳)

مکالمہ نمبر ۴ کا ملخص یہ ہے کہ "ایک دن رشید (عباسی خلیفہ) نے موسیٰ کاظم بن جعفر صادق کو بلا کر کہا کہ تم اپنے آپ کو ذریتِ رسولؐ خدا کیوں کہتے ہو تم تو بنی علیؓ ہو اور آدمی کا نسب دادا سے ہوتا ہے نہ کہ نانا سے؟ تو موسیٰ کاظم نے بھی قرآن کی آیت پڑھ کر اسی مذکورہ دلیل سے رشید کو قائل کر لیا" (ع ص۵۴)

ان مکالمات سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) ابنِ مریم کنیت نہیں بلکہ نسب ہے جسے موافق و مخالف سب نے تسلیم کیا ہے۔

(۲) عیسیٰؑ کا باپ نہیں تھا اور یہ ایک استثناء کی صورت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کا نسب ماں کے واسطہ سے آلِ ابراہیم تک ملایا ہے۔

(۳) اس ایک استثنائی مثال سے یحییٰ بن یعمر اور موسیٰ کاظم نے فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو ذریتِ رسولؐ میں شامل کر لیا حالانکہ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے: تاہم چونکہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کا نسب ماں کے واسطہ سے آدم تک ملایا ہے لہٰذا حجاج اور رشید کو اس دلیل کے سامنے جھکنا پڑا۔ ان باتوں سے صاف معلوم ہوتا

ہے کہ اثری صاحب یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں کہ ابن مریم نسب سے کینت نہیں۔

روایت اور اس کا معنی بیان کرنے میں اثری صاحب کی دیانت:

اب اثری صاحب کی روایت اور ترجمہ میں دیانت بھی ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں:" مکالمہ ۱۳ میں عیسیٰ کی بابت جو یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ اَلَیسَ عیسٰی مِن ذریۃِ ابرٰھیم وَلَیسَ لَہٗ اَبٌ (اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر عیسیٰ کا باپ نہ تھا تو کیا آپ ابراہیم کی ذریت میں شامل نہ تھے؟) لیکن اثری صاحب اس عربی عبارت کو خود درج فرمانے کے بعد اس کا ترجمہ یُوں کرتے ہیں کہ "اُن کا مطلب یہ ہے کہ آپ باپ کی طرف ابراہیم کی نسل سے ثابت نہیں ہو سکتے کہ آپ کا باپ کوئی غیر اسرائیلی ہے اور اللہ پاک نے آپ (عیسیٰ) کو ان (ابراہیم) کی طرف منسوب فرمایا ہے لہٰذا ماں کی طرف نسبت ہے جو یقینی ہے" (ص ۵۴) یعنی "لَیسَ لَہٗ اَبٌ" کا معنیٰ یہ ہُوا کہ عیسیٰ کا باپ تھا تو ضرور مگر وُہ غیر اسرائیلی تھا اور اس طرح پر نسب آلِ ابراہیم سے مل نہ سکتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کو عیسیٰ کا نسب آلِ ابراہیم سے ملانا ضروری تھا۔ لہٰذا باپ کی طرف نسبت نہیں کی بلکہ ماں کی طرف کر دی جو کہ یقینی ہے۔

ماں کی طرف نسبت کرنے کی اثری وجوہ

پہلی وجہ غیر اسرائیلی باپ: دیکھا آپ نے اثری صاحب کس طرح اپنی بات کی پچ میں آکر عیسیٰ کا باپ ضرور ثابت کرنا چاہتے ہیں خواہ اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر حرف کیوں نہ آجائے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس مقام پر تو آپ عیسیٰ کا باپ غیر اسرائیلی قرار دے رہے ہیں اور عیسیٰ کی نسبت بواسطہ والدہ ملانے کی یہی وجہ بیان فرما رہے ہیں لیکن دُوسرے مقام پر آپ کہتے ہیں کہ یُوسف اسرائیلی تھا۔ وہ بھی مریمؑ کی طرح اسی بیت المقدس کے ہیکل کا منذور تھا اور یہ کہ وُہ مریم کا چچیرا بھائی تھا لہٰذا حضرت زکریا نے اس سے مریم کا نکاح کیا تھا۔ (ص ۵۷ اور ص ۱۰۸)

گویا ماں کی طرف نسبت کرنے کی ایک وجہ تو آپ نے یہ بتلائی کہ یُوسف غیر اسرائیلی تھا اور اس کا ابراہیم سے نسب ملنا مشکوک تھا (اور مکالمات کے جانبین کے لئے بھی قابلِ تسلیم نہ تھا) لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کی نسبت ماں کی طرف کر کے سلسلہ نسب آدم تک پہنچایا ہے۔ اب دُوسری وجہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

دُوسری وجہ بلندی شان: فرماتے ہیں کہ "اس مکالمہ (یعنی مکالمہ ۱۳ اور ۱۴) کا موضوع عیسیٰ اور حسنینؓ کی بے پدری نہ تھا کہ ان ہر سہ کا اپنا اپنا باپ ہے۔ کوئی بھی بے پدر پیدا نہیں ہُوا بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جیسے حسنین کا باپ ہے ویسے ہی حضرت عیسیٰ کا باپ ہے۔ ہاں ہر سہ کی نسبت

ماں کی طرف صرف بلندیٔ شان کی وجہ سے ہے" مکالمہ صرف اس بات پر ہوا تھا کہ والدہ کی طرف نسبت درست ہے یا نہیں؟" (ص ۵۵)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

(۱) اثری صاحب بہرحال یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابن مریم کنیت نہیں بلکہ نسب ہے۔ اگر یہ کنیت ہوتی تو کسی مکالمہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی۔ کیونکہ کنیت سے، احتجاج نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے آپ نے جو ماں کی نسبت سے کنیت کی ایک طویل فہرست جو عیون زمزم کے صفحہ ۹۶ پر جھپیتا فرمائی ہے وہ بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ فھو المراد۔

(۲) ماں کی طرف عیسیٰ کی نسبت کی دوسری وجہ بلندیٔ شان ہے یعنی چونکہ حضرت مریمؑ شوہر صاحب یوسف نجار سے شان میں بلند تھیں۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یوسف کا نام لینا گوارا نہیں فرمایا۔ بالفاظ دیگر اگر وہ مریم سے بلند شان والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ نسب پیش کرتے ہوئے مریم کی بجائے یوسف کا ذکر کرتے۔

یہ اللہ تعالیٰ پر دوسرا اتہام ہوا کہ اس نے بھی صحیح نسب اس لیئے بیان نہیں کیا کہ یوسف مریم سے کم تر درجہ کا انسان تھا اس لیئے اگرچہ وہ باپ تھا، اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو چھوڑ کر اس کو عیسیٰ کا باپ قرار دے دینے کے لیئے کیسے اس کا نام لے سکتے تھے۔ لہٰذا اس کی ماں کا نام لے کر نسب اسی طرف سے بیان فرما دیا۔ کیا "مُن حرامی تے حُجتاں ڈھیر" کی اس سے واضح مثال اور کہیں مل سکے گی؟ چنانچہ اپنی اس دوسری توجیہہ کی مزید وضاحت صفحہ ۶۴ پر یوں فرماتے ہیں (آپ پہلے ایک مرفوع حدیث طبرانی اور مستدرک حاکم[۱] سے بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ "عورت زادے اپنے اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں مگر ہاں فاطمہ کی اولاد میری طرف منسوب ہے جس کی وجہ مزید شرف وجلال ہے) پھر اس پر سوال اٹھاتے ہیں کہ "جب یہ بات ہے تو پھر ابن مریم کی بجائے ابن یوسف کیوں کنیت نہیں ہوئی؟ (ص: ۶۴)

پہلی بات تو یہ ہے کہ حافظ صاحب اپنی عبارت میں یہ پتہ چلنے ہی نہیں دیتے کہ کسی مرفوع حدیث میں رسول اللہ کے اصل الفاظ کیا ہیں۔ مثلاً "جس کی وجہ مزید شرف وجلال ہے۔ رسول اللہ کا کلام نہیں۔ لیکن آپ اسے اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ یہ بھی رسول اللہ کا ہی کلام سمجھا جائے اور یہ آپ کی ماشاء اللہ عادت مستمرہ ہے پھر جس انداز سے کسی آیت یا حدیث کا اپنی زبان میں مطلب پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی آپ سابقہ بیانات میں دیکھ چکے ہیں۔ اب جس چیز کی طرف ہم قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ حدیث میں آپ کے بیان کردہ الفاظ میں بھی بات نسب کی ہو رہی ہے لیکن آپ نے سوال اٹھانے تک نسب کو کنیت میں تو غیر شعوری طور

[۱] طبرانی اور مستدرک حاکم دونوں کے حوالہ جات درج نہیں کہ تحقیق ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں اگر صحیح ہوتی تو یحییٰ بن یعمر اسے حجاج کے سامنے اور موسیٰ کاظم اسے رشید عباسی کے سامنے ضرور پیش فرماتے (ملاحظہ ہو مکالمہ ۲ اور ۳ جو پہلے مذکور ہو چکے) +

پر ہی تبدیل کر لیا۔ اب اس سوال کا اثری جواب بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

ابن یوسف کیوں نہیں؟

"مکرّر عرض ہے کہ مریم کی جگہ اگر لڑکا پیدا ہوتا (یعنی عمران کا بیٹا بھی) جیسے کہ اس کی والدہ کا خیال تھا تو بھی قرآن مجید نے اسے مریمؑ سے کمتر ہی رکھنا تو پھر دوسرا کوئی (یعنی شوہر) اس سے کیسے بالا ہو سکتا ہے؟..... علیؓ کیا کم ہے مگر فاطمہ اس سے بہرحال بالاتر ہے۔ اس لیے اس کی اولاد بنی فاطمہ کہلائی۔ لہٰذا عیسیٰ مزید شرف و اعزاز کی وجہ سے ابن مریم مشہور ہوئے"۔ (ص ۶۳)

اثری دلیل کی کمزوریاں:

اس جواب میں آپ بہت سی باتیں عقل و نقل کے خلاف بیان کر گئے ہیں:۔

(۱) حضرت حسن اور حسین سے جو روایات مروی ہیں۔ ان سب میں حسن ابن علی اور حسین ابن علی مذکور ہے۔ حسن ابن فاطمہ مذکور نہیں۔

(۲) کنیت کا تعلق ہمیشہ اپنی پسند سے ہوتا ہے، عزّ و شرف سے نہیں ہوتا۔ محمّد بن حنفیہ حضرت علیؓ کے فرزند تھے۔ محمّد نام باپ کا نام علیؓ بن ابی طالب ماں کا نام حنفیہ۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ بہرحال عزّ و شرف میں حنفیہ سے برتر تھے۔ لیکن اس کے باوجود محمّد بن علی نے اپنے آپ کو ماں کی طرف نسبت دی (نیز دیکھئے (ص ۶۹ نمبر ۱۱ اور اس کی ذیلی تشریح) محمد بن حنفیہ نسب نہیں بلکہ کنیت ہے۔ نسب کی بات ہو گی تو محمد بن علی ہی کہا جائے گا۔

(۳) بنو فاطمہ کہلانے کی خواہش اس دَور کی پیداوار ہے جب خلافت کے جھگڑے شروع ہوئے اور بحثوں کا دروازہ کھلا۔ جیسا کہ اُوپر بیان کردہ مکالمہ ۳ اور ۱۲ سے ظاہر ہے۔ یہ بنو فاطمہ اپنے آپ کو فاطمہ کے واسطہ سے رسول اللہ کی ذریّت قرار دے کر اپنا حق خلافت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کا محاسبہ بھی وقت کے حاکموں نے کیا۔ گو وقت کے حاکم عیسیٰ کی مثال کے پیشِ نظر جو کہ عام ضابطہ الٰہی سے ایک استثناء کی صُورت ہے ــــ لاجواب ہو گئے مگر انہوں نے دل سے مُدعیوں کا حق تسلیم نہیں کیا اسلیئے کہ عام قانون الٰہی یہی ہے کہ نسب باپ سے ہوتا ہے۔ اور حسنینؓ کا باپ موجود تھا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے جب کبھی نسب کا ذکر کیا ہے تو باپوں سے کیا ہے اور اس کا حکم بھی یہی ہے کہ اُدْعُوهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۳۳/۵ انہیں ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارا کرو۔ خدا کے نزدیک یہی بات درست ہے اور اگر تمہیں ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں) پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم کہہ کر خود ہی اقسط بات کا خلاف کیسے کر سکتے تھے اور فان لم تعلموا تو عام انسانوں کے لیئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تو بہرحال ہر بات کا علم ہے اگر کوئی عیسیٰ کا باپ تھا تو اللہ سے بڑھ کر اسے کون جان سکتا ہے؟ لیکن سارا سلسلہ نسب بیان کرنے کے

بعد اللہ تعالیٰ کا عیسیٰ بن مریم ہی کہنا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان کا فی الواقع کوئی باپ نہ تھا یہاں شرف و اعزاز جیسے حیلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۵) عیسیٰؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہتے ہیں (ع ص۸) باپ جیسا بھی ہو وہ بہرحال بیٹے کے لیئے قابل احترام ہے اور اسی سے اس کا عزّ و شرف ہے تو عیسیٰؑ نے کیوں اپنے والد کا نام نہ بتایا یا اپنے آپ کو اس نام سے کیوں منسوب نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت مریم بھی اپنے زوج کا تذکرہ تک گوارا نہیں کرتیں اور کوئی مبشر کہہ دیتی ہیں (ع ص۱۰۹) اب بات یوں ہوئی کہ نہ تو اللہ کو حضرت عیسیٰ کے باپ کا علم تھا، نہ حضرت عیسیٰ کو نیز حضرت مریم نے شوہر کو شوہر سمجھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اب اگر علم ہوا تو اثری صاحب اور ان کے ہمنوا لوں کو جو ضابطہ الٰہی کے ٹھیکیدار اور اللہ تعالیٰ کو اپنے ضابطہ کا پابند بنانے کے لیئے مستعد ہو رہے ہیں۔ ان کے علم کا ماخذ اگر ہے تو انجیل جو یوسف کو منہ بولا باپ ہی تسلیم کرتی ہے۔ حقیقی باپ وہ بھی تسلیم نہیں کرتی لیکن اثری صاحب کا ان اناجیل پر اتنا پختہ یقین ہے کہ آپ فرماتے ہیں۔

قرآن کے مقابلہ میں اناجیل کو ترجیح: "لیکن جسے (یعنی اثری صاحب اور آپ کے ہمخیال لوگوں کو) اس (عیسیٰ) کے باپ کا نسب نامہ ٹھیک طور پر معلوم ہے اور اسے اس پر اعتماد ہے تو وہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کی بنا پر اسے باپ کی طرف سے ہی ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرے گا جیسے کہ وہ ماں کی طرف منسوب کرتا ہے۔" (ع ص۵۶)

اب دیکھیئے اس اقتباس میں "ظاہری الفاظ کی بنا پر" کے بجائے اس کا مطلب "ظاہری الفاظ کے علی الرغم یا ظاہری الفاظ کی پرواہ کرتے ہوئے" کر لیجئے تو اثری صاحب کے اس اقتباس کی پیچیدگی تب دور ہوتی ہے۔ یعنی جن لوگوں کو عیسیٰ کے باپ ہونے پر اعتماد ہے وہ قرآن کریم کے ظاہری الفاظ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کو باپ کی طرف سے بھی ابراہیمؑ کی طرف منسوب کریں گے جیسے وہ ماں کی طرف سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ ہے ان لوگوں کا قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا طریق۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:۔

وجیہہ کا مفہوم: "معلوم نہیں عیسیٰؑ کی بابت کیونکر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اس کا کوئی باپ نہیں۔ حالانکہ ان کے ماں باپ دونوں کا پتہ حسب نسب تک معلوم ہے۔" (ص۱۲۱)

اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم کو عیسیٰ کی بشارت دی تو ساتھ ہی فرمادیا کہ وہ دنیا میں وجیہہ ہوگا۔ وجیہہ بمعنی سرداری شان والا جس کے آگے کوئی شخص غلط بات کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ حضرت مریم کو اس لیئے بشارت دی گئی کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اگر عیسیٰ کی پیدائش بے پدر محض خدا کی قدرت کاملہ

سے ہوئی تو لوگ ان پر اعتراض کر کے تنگ کریں گے بلکہ یہ بتلا دیا کہ ایسی بات کرنے کی کوئی جرأت ہی نہ کر سکیگا۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ لوگوں نے آپ کی پیدائش کے موقعہ پر حضرت مریم پر اعتراض کیا تو ان کے اشارہ کرنے پر حضرت عیسیٰؑ نے فوراً بول کر انہیں خاموش کر دیا۔ پھر آپ کی زندگی پھر آپ کا ایسا دبدبہ رہا کہ کسی یہودی کو کوئی غلط بات آپ سے کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ بڑے بڑے فقیہہ و فریسی اور عالم آپ کی گفتگو سے دنگ رہ جاتے تھے آپ کو بہت سے معجزات بھی عطا ہوئے تھے۔ آپ تقریریں اور تبلیغ بھی کرتے رہے۔ اور اسی تبلیغ میں ساری زندگی سیاحت میں گزار دی جس کی وجہ سے مسیح آپ کا لقب ہوا لیکن آپ کے باپ کی بابت کسی کو سوال تک کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

وجیہ کا لفظ قرآن میں دوسرے مقام پر حضرت موسیٰؑ کے لیئے استعمال ہوا ہے اور وہ بھی انہی معنوں میں ہوا ہے۔ بنی اسرائیل موسیٰؑ کی پیٹھ پیچھے آپس میں ایسی باتیں کرتے تھے جن سے موسیٰؑ کو تکلیف پہنچی تھی بات یہ تھی کہ موسیٰؑ لوگوں کے سامنے کبھی ننگے نہ نہاتے۔ جب کہ بنی اسرائیل اسے معیوب نہیں سمجھتے تھے تو وہ آپس میں باتیں بنانے لگے کہ موسیٰ کے بدن میں ضرور کوئی عیب ہے جو کسی کے سامنے ننگا نہانے سے احتراز کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ بات حضرت موسیٰ کے منہ پر کہنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی باتوں اور اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایک موقعہ ایسا پیدا کر دیا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے ننگے بدن کو دیکھ لیا جو کہ بالکل بے داغ اور بے عیب تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۳۳/۶۹	اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو ان لوگوں کے اعتراضات سے بری کر دیا۔ اور وہ اللہ کے ہاں وجیہہ تھا۔

وجیہ کا یہ مفہوم تو قرآن سے معلوم ہوا اب اثری مفہوم بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

وجیہہ کا اثری مفہوم: "زانیہ اور ولد الحرام کبھی اپنا چہرہ دنیا کو نہیں دکھا سکتے۔ مگر اللہ پاک نے عیسیٰؑ کو وجیہہ فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا چہرہ دکھاتا رہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پر ایسا کوئی الزام نہیں۔ آپ نے ساری زندگی میں کبھی یہ بیان نہیں فرمایا کہ میں بے پدر پیدا ہوا ہوں اور نہ ہی آپ کی والدہ نے کبھی بیان فرمایا کہ میں نے اسے بے شوہر جنا ہوا ہے؟" (ص ۱۱۴) "جس کی بے پدری پیدائش ہوتی ہے وہ اس طرح عام پبلک میں وعظ نہیں کر سکتا کہ شاید کوئی مخالف بول پڑے تو اسے کیا جواب دیا جائیگا؟" (ص ۱۱۶)

گویا اثری صاحب کے نزدیک پیدائش کے لیئے باپ کا ہونا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیدائش نا ممکنات سے ہے۔ خواہ یہ باپ جائز ہو یا ناجائز۔ اور یہی یہودی ذہنیت تھی۔ البتہ یہودیوں اور اثری صاحب اور اُن کے ہم خیالوں میں فرق صرف یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ چونکہ جائز باپ کوئی نہیں۔ اس لیئے

عیسیٰ (نعوذ باللہ) ولدالحرام ہے۔ اور اثری صاحب یہ کہتے ہیں کہ چونکہ آپ ولدالحرام نہیں۔ اسلیئے جائز باپ یا مریم کا شوہر ضروری ہے۔ خدا کی قدرت کاملہ کی بنا پر بے پدری پیدائش کے دونوں ایک جیسے منکر ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے۔ کفار مکہ یہ کہتے تھے کہ چونکہ محمدؐ بشر ہے لہٰذا نبی نہیں ہو سکتا اور آج کا مسلمان یہ کہتا ہے کہ چونکہ محمدؐ نبی ہیں لہٰذا بشر نہیں ہو سکتے۔ راہ مستقیم پر نہ وہ لوگ ہیں، نہ یہ۔

اثری دلیل کی کمزوریاں: اب سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش عام ضابطۂ الٰہی کے مطابق ہی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ کو حضرت مریم کی صفائی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اور عیسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کا مشترکہ بیان اتنی تفصیل کے ساتھ قرآن کریم میں جابجا پیش کرنے کا کیا فائدہ تھا؟ کیا کسی دوسرے نبی کی پیدائش بھی اس تفصیل سے مذکور ہوئی ہے جس میں اسکی ماں کی بھی اتنی تفصیل بیان کی گئی ہو؟

رہی یہ بات کہ کوئی ولدالحرام یا بے پدر انسان اپنا چہرہ دنیا کو نہیں دکھلا سکتا تو یہ بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ ہر موردِ الزام شخص اپنا چہرہ دنیا کو نہیں دکھلا سکتا۔ پھر اس الزام کی بھی دو صورتیں ہیں اگر یہ الزام درست ہو تو واقعی کوئی شخص چہرہ نہیں دکھلاتا لیکن اگر یہ الزام ہی غلط ہو تو وہ بلا جھجک اپنا چہرہ دنیا کو دکھلا سکتا ہے کیونکہ اس میں فی الحقیقت کوئی الزام کی بات نہیں ہوتی۔ کیا جب بنی اسرائیل نے موسیٰ پر الزام لگایا تو وہ لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے؟ وجیہا کا یہی مفہوم ہے کہ وہ بے عیب اور لوگوں کے الزامات سے پاک تھے اور کسی کو ان دونوں (موسیٰ اور عیسیٰ) کے منہ پر کوئی بات کہنے یا اعتراض کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔ اور یہ حقیقت اثری صاحب کے اپنے بیان سے بھی ثابت ہے۔

حضرت عیسیٰ کو لوگوں کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "میں بے پدر پیدا ہوں" جبکہ کسی نے یہ سوال ہی نہ کیا ہو یا کسی کو یہ بات پوچھنے یا کہنے کی جرأت ہی نہ ہوئی ہو۔ البتہ اس حقیقت کو عیسیٰ خود ضرور سمجھتے تھے اسی لیئے وہ اپنے آپ کو ابن آدم کہتے تھے (ع ص ۷) ابن یوسف کبھی نہیں کہا اور حضرت مریم کو ایسا بیان دینے کی اس لیئے ضرورت نہ تھی کہ وہ فاشارت الیہ کہہ کر خود کوئی بیان دینے سے سبکدوش ہو چکی تھیں۔ اب صورت واقعہ یوں ہوئی کہ:-

(۱) حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت یہود نے مریمؑ پر زنا کا الزام لگایا تو مریمؑ نے عیسیٰ کی طرف اشارہ کر دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کا گود میں کلام کرنا ایسا اعجاز تھا جس نے یہود کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ ان کی پیدائش بھی معجزانہ طور پر ہوئی ہے۔ اور مریم زنا سے بری ہے۔ لہٰذا وہ خاموش ہو کر چلے گئے۔

(۲) حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے وفات تک کسی یہودی کو یہ الزام لگانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ کیونکہ آپ

بے عیب بھی تھے اور وجیہہ بھی۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ کو ایسا بیان از خود دینے کی ضرورت ہی نہ تھی پھر آپ سے کچھ ایسے معجزات بھی صادر ہوتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں آپ کا دبدبہ اور ہیبت بیٹھ گئی تھی۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد یہودنے عیسائیوں سے مخاصمت کی بنا پر حضرت عیسیٰ اور مریم کو پھر سے ملعون کر دیا جس کی وجہ سے اللہ نے انہیں ملعون قرار دیا۔ اور قرآن میں تفصیلی بیان دے کر واضح کیا کہ آپ کی پیدائش معجزانہ طریق پر ہوئی تھی۔

تکلم فی المہد، مس بشر: یہ دونوں بحثیں سورۂ مریم کی بحث میں پہلے تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ لہٰذا یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یفعل اور یخلق کا مطلب ایک ہے: اثری صاحب فرماتے ہیں:۔
”آل عمران میں زکریا کی بابت کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ وارد ہوا ہے اور عیسیٰؑ کی بابت بھی کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ وارد ہوا ہے۔ اور دونوں کا مطلب ایک ہے“ (ص ۹۲)

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قبلہ حافظ صاحب فعل اور خلق کے درمیان فرق کرنے سے قاصر ہوں مگر ”دیوانہ بکار خویش ہوشیار“ والا معاملہ بن گیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰ کی پیدائش کی ابتدائی جزئیات ہی موافق نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ان دونوں کاموں یعنی یفعل اور یخلق کا مطلب ”ایک“ کیسے ہوگیا؟ حضرت زکریا یہ کہتے ہیں کہ ”میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو اولاد کیسے ہوگی؟“ گویا زوجین تو موجود ہیں۔ اگرچہ ان میں اب وہ قوت وطاقت نہیں رہی جو پیدائش کے لیئے درکار ہے تو اللہ نے حضرت زکریا کے استعجاب کو دُور کرنے کے لیئے فرمایا کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ۔

مگر حضرت مریم کا معاملہ بالکل علیحدہ نوعیت کا ہے۔ وہاں سرے سے زوجین میں سے ایک فرد[1] ہی موجود نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ۔

گویا حضرت زکریا کے معاملہ میں عادتِ عامہ کو عادتِ خاصہ میں تبدیل کرنا مقصود تھا کہ بُوڑھے اور بانجھ لوگوں کے ہاں اولاد پیدا ہونے کا صرف ایک یہی حضرت یحییٰ کی پیدائش کا واقعہ نہیں۔ ایسے واقعات کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں لہٰذا یفعل کا لفظ استعمال ہوا۔ پھر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا واقعہ ایسا ہے جس کی دوسری کوئی مثال ونظیر موجود نہیں۔ نہ یہ عادت عامہ سے متعلق ہے نہ خاصہ سے بلکہ یہ اللہ کی قدرت سے متعلق ہے۔ لہٰذا یَخۡلُقُ کا لفظ استعمال فرمایا۔

فعل اور خلق کا لغوی فرق: اب اگر لغوی لحاظ سے دیکھا جائے تو فعل اور خلق میں دو نمایاں فرق ہیں (۱) فعل میں فاعل کے ارادہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ قرآن میں فرشتوں

---

[1] اثری صاحب نے دوسرا فرد جو فرض کر لیا ہے وہ ان کا اپنا ذہن ہے جس کا قرآن وحدیث یا آثار میں کوئی ثبوت نہیں۔ علاوہ ازیں اثری صاحب کہتے ہیں کہ حضرت مریم [illegible] کی شکایت کی ہے یہ نہیں کہا میرا نکاح نہیں ہوا۔ اسی ”شکایت“ ”مس بشر اور بشر بمعنی خاوند“ پر ہم پہلے تفصیل سے بحث کر کے اس کا رد پیش کر چکے ہیں۔

کے متعلق وارد ہے کہ "یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" جو کچھ وہ حکم دیئے جاتے ہیں وہی کچھ کرتے ہیں اور یہ تو واضح ہے کہ فرشتوں میں ارادہ واختیار نامی کوئی چیز موجود نہیں لیکن خلق میں ارادہ ضروری ہوتا ہے۔

(۲) فعل کا لفظ صرف عام کاموں سے متعلق ہے مثلاً کسی انسان کا کھانا کھانا۔ جس میں اس کے ارادہ کو بھی دخل ہوتا ہے لیکن خلق کا لفظ صرف اس صورت میں استعمال ہوگا جب اس میں ایجاد واختراع کا مفہوم بھی پایا جائے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیسیوں مقامات پر خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ہی فرمایا کہیں ایک بار بھی فَعَلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ نہیں فرمایا۔ اگر ان دونوں لفظوں کا مطلب "ایک" ہے۔ تو ایک آدھ بار فعل کا لفظ استعمال ہو جانے میں آخر کیا حرج تھا؟

زکریاؑ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے یفعل کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ اس طرح کی اور بھی کافی مثالیں دنیا میں موجود ہیں اور عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق اس لیے خلق کا لفظ استعمال فرمایا کہ اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

خلق عیسیٰؑ: اب ہم اثری صاحب کے مطابق یہ فرض کر لیتے ہیں کہ حضرت مریم کے پاس فرشتے نہیں بلکہ ایک بشر بصورت فرشتہ آیا تھا۔ اور وہ بشر شوہر صاحب تھے اور حضرت مریمؑ نے اس سے بطور استعجاب نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) اس بشر سے بطور شکایت عدم مس کا ذکر کیا تھا۔ اب یہ شوہر اس روٹھی ہوئی بیوی کو منا کر اپنے گھر لے جاتا ہے تو اس میں تخلیق کی کیا بات ہوئی؟ جبکہ قرآن کے یہ الفاظ تو اسی مخاطبت کے ساتھ ملحق ہیں تو کیا روٹھی ہوئی بیوی کو منا کر ساتھ لے جانا کوئی ایسا نادر الوقوع کارنامہ ہے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائیں۔ کَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ؟

اور اگر یہ سمجھا جائے کہ شوہر صاحب مریم کو اپنے گھر لے گئے۔ پھر مس کیا پھر پیدائش ہوئی تو یہ پیدائش تو عام ضابطۂ الٰہی کے مطابق ہوئی اسے بطور خاص بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

سورہ آل عمران کی آیات از ۵۹ تا ۶۱

اب ہم سورۂ آل عمران کی چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں۔ جن کی اثری صاحب نے باقاعدہ تفسیر پیش نہیں فرمائی۔ (لہٰذا ان کا تفسیری ترجمہ پیش کرنے سے قاصر ہیں)۔ البتہ ان آیات کے بعض موضوعات کو متفرق طور پر زیر بحث لائے اور وہ اس طرح کہ کسی لفظ پر جہاں چاہا بحث شروع کر دی اور جتنی بار چاہا کر لی۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ (۳/ ۵۹-۶۱)

عیسیٰ کی مثال خدا کے ہاں آدم جیسی ہے جسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا پھر فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (یہ بات) تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں جب کہ تمہارے پاس "علم" آ چکا ہے تو ان سے کہہ دو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم بھی اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ پھر دونوں فریق (خلوص سے) دعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

ان آیات سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:۔

(۱) حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بارے میں کچھ لوگوں نے رسول اللہ سے جھگڑا کیا تھا۔

(۲) اس جھگڑے کے دوران آپ کے پاس علم (خدا کی طرف سے وحی) آیا۔ اور یہ "العلم" سب سے پہلی آیت اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی ...... الآیۃ میں مذکور ہے۔

(۳) اس "علم" کے آنے کے بعد تمہارے لیئے (یعنی آپؐ اور جملہ مسلمانوں کے لیئے) کسی قسم کا شک کرنے کی گنجائش نہیں۔

(۴) اس "علم" کے بعد بھی جو لوگ جھگڑا نہ چھوڑیں تو ان کا علاج صرف دعوتِ مباہلہ ہے جس کا طریق اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے۔

مثیلِ آدم: گویا ان آیات میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات "العلم" ہے یعنی حضرت عیسیٰ پیدائش کے لحاظ سے مثیلِ آدم تھے۔ اب ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ سنہ ۱۰ھ میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ میں حضور اکرمؐ کے پاس آیا اور پیدائش عیسیٰ کے متعلق مناظرہ بھی کیا اور جھگڑا بھی۔ اس مناظرہ کا اثری صاحب نے عنوان "زمزم" میں کئی مقامات پر ذکر کر کے اور حسبِ عادت غلط مطلب پیش کر کے فریب دہی کی کوشش کی ہے اور درمنثور کے حوالہ سے روایات پیش فرمائی ہیں لہٰذا ہم درمنثور ہی کے حوالہ سے چند روایات مکمل متن معہ ترجمہ پیش کرتے ہیں تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آ جائیں ہمارے سامنے اس وقت درمنثور ج ۲ (سورۂ آلِ عمران) مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت پڑی ہے۔ اس کا حوالہ صفحہ اور سطر تک ساتھ ساتھ درج کر رہے ہیں۔

دُرِ منثور کی روایات مع ترجمہ:

(۱) ص ۳۷ سطر ۲۵ تا ۲۷ (دُرِ منثور ج ۳)

اخرج عبد بن حمید و ابن جریر عن قتادۃ قال ذُکِرَ لَنَا اَنَّ سَیِّدَیْ اھل نجران و اُسْقُفَیْھِمُ السید و العاقب لقیا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسألاہ عن عیسٰی فقالا: کُلُّ آدمیٍّ لَهٗ اَبٌ فما شان عیسٰی لا اَبَ لَهٗ؟ فانزل اللہ فیہ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ: الآیۃ

(۱) عبد بن حمید اور ابن جریر قتادہ سے نقل کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا کہ ہمیں بتلایا گیا کہ اہل نجران کے دو سردار اور ان کے اسقف جو سید اور عاقب کہلاتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کو ملے اور حضرت عیسٰی کے متعلق سوال کیا کہ، ہر آدمی کا باپ ہوتا ہے اور عیسٰی کا باپ نہ تھا تو ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں یہ آیت نازل فرمائی۔ ان مثل عیسٰی عند اللہ .... الخ

(۲) ص ۳۸ سطر ۱ تا ۴

اخرج ابن سعد و عبد بن حمید عن الازرق بن قیس قال: جاء اسقف نجران والعاقب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فعرض علیھما الاسلام۔ فقالا: قد کنا مسلمین قبلک فقال رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کذبتما مُنِعَ الاسلام منکما ثلاث قولکما: اتخذ اللہ ولدًا وسجودکما للصلیب واکلکما لحم الخنزیر: قالا فمَنْ اَبُو عیسٰی؟ فلم یدر ما یقولُ فانزل اللہ اِنَّ مثل عیسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدم .... الآیۃ

(۲) ابن سعد اور عبد بن حمید نے ارزق بن قیس سے روایت کیا۔ اس نے کہا: نجران کے اسقف اور عاقب رسول اکرمؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے ان پر اسلام پیش کیا۔ وہ کہنے لگے: ہم تو پہلے ہی مسلمان ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "تم جھوٹ کہتے ہو۔ تمہاری تین باتیں تمہیں اسلام سے باز رکھتی ہیں۔ تم اللہ کی اولاد بتلاتے ہو صلیب کو سجدہ کرتے ہو اور سؤر کا گوشت کھاتے ہو۔" وہ کہنے لگے "اچھا بتلاؤ عیسٰی کا باپ کون تھا؟" آپ نہیں جانتے تھے کہ کیا جواب دیں تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان مثل عیسٰی عند اللہ..... ......

(۳) ص ۳۸ سطر ۱۱ تا ۱۳

اخرج ابن جریر عن عبد اللہ بن حرث انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لَیْتَ بَیْنِیْ وَ بین اَھْلِ نجران حجابًا فلا اَراھُم وَلا یَروْنِیْ مِنْ شِدَّۃِ مَا کانُوْا یُمَارُوْنَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

(۳) ابن جریر عبد اللہ بن حرث سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا "کاش میرے اور اہلِ نجران کے درمیان کوئی حجاب ہوتا۔ نہ میں انہیں دیکھتا نہ وہ مجھے دیکھتے؟" کیونکہ وہ بڑی سختی سے آپؐ سے جھگڑا کر رہے تھے۔

(۴) ص ۳۷/۳۸ سطر ۳۲ تا ۱

اخرج ابن جریر و ابن المنذر عن ابن جریج قال بلغنا ان نصاری نجران قدم وفدھم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیھم السید والعاقب و ھما یومئذ سیدا اھل نجران فقالوا "یا محمد! لم تشتم صاحبنا؟ قال من صاحبکم؟ قالوا: عیسیٰ بن مریم تزعم انہ عبد" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "اجل انہ عبداللہ وکلمتہ القاھا الی مریم و روح منہ" فغضبوا وقالوا: ان کنت صادقاً فارنا عبدا یحیی الموتی ویبرئ الاکمہ ویخلق من الطین کھیئۃ الطیر فینفخ فیہ الایۃ لکنہ اللہ؟ فسکت حتی اتاہ جبریل فقال یا محمد لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح بن مریم الایۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انھم سئلونی ان اخبرھم بمثل عیسیٰ؟ قال جبریل۔ مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔ فلما اصبحوا عادوا فقرأ علیھم الایات۔

(۴) ابن جریر اور ابن المنذر نے ابن جریج سے روایت کیا۔ اس نے کہا ہمیں یہ خبر ملی کہ نجران کے عیسائی جن میں ان کے سید اور عاقب بھی تھے جو ان دنوں نجران کے سردار تھے، نبیؐ کے پاس تیار ہو کر (وفد کی شکل میں) آئے اور کہنے لگے "اے محمدؐ! تو ہمارے صاحب کو گالی کیوں دیتا ہے؟" آپؐ نے پوچھا "تمہارا صاحب کون ہے؟" کہنے لگے عیسیٰ ابن مریم جسے تو عبد سمجھتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں! میں اسے اللہ کا بندہ سمجھتا ہوں۔ وہ اللہ کا کلمہ اور اس کی طرف سے رُوح تھے جسے اللہ نے مریم کی طرف ڈالا"۔ اس جواب پر وہ بپھر گئے اور کہنے لگے "اگر تم سچے ہو تو کوئی ایسا بندہ دکھلاؤ جو مردوں کو زندہ کرتا، کوڑھی اور اندھے کو تندرست کرتا ہو مٹی سے پرندہ بنا کر اور اس میں پھونک مار کر حقیقی پرندہ بنا دیتا ہو۔ ایسا شخص اللہ ہی ہو سکتا ہے"۔ اس بات پر آپ چپ ہو گئے حتیٰ کہ جبریل آئے اور کہا "اے محمد! لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اِنَّ اللّٰہَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ الآیۃ ......

پھر آپ نے جبریلؑ سے کہا "نصاریٰ مجھ سے عیسیٰ کی مثال پوچھتے ہیں تو جبریل نے کہا: ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔ پھر جب صبح ہوئی تو آپ نے نصاریٰ کے سامنے یہ آیات پڑھیں۔

مناظرہ میں عیسوی دلائل:

ان روایات سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:۔

(۱) نجران کے اسقف (علماء) آپ سے مناظرہ کے لیئے پوری تیار کر کے آئے تھے۔ ان کا اندازِ گفتگو کرخت تھا اور بزعم خود آپ کو مات دینے آئے تھے۔

(۲)۔ ان کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ عیسیٰ بن مریم کے متعلق تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ ان کا باپ نہ تھا۔ پھر اس میں چند ایسی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جو خرقِ عادت ہیں پھر آخر اسے کیوں نہ ابن اللہ یا اللہ سمجھا جائے۔

(۳) اور اگر تم یہ بات ماننے کو تیار نہیں تو پھر بتلاؤ کہ عیسیٰ کا اور کون مثیل ہو سکتا ہے؟ نیز یہ کہ اگر عیسیٰ ابن اللہ نہیں تو اس کا باپ کون تھا؟" گویا ان عیسائیوں کے خیال میں دو باتیں مل کر عیسیٰؑ کو خدا بنانے کی وجہ تھیں؛

(۱) بے پدری پیدائش (۲) معجزاتِ عیسوی

وجہ مماثلت: ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ "العلم" نازل فرمایا جس سے درج ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) عیسیٰؑ، آدمؑ کے مثیل ہیں۔ گویا اصل آدمؑ ہیں اور اس کی مثال عیسیٰؑ ہیں۔

(۲) خَلَقَ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں وجہ مماثلت یا "قدرِ مشترک" ان کی پیدائش ہے۔

(۳) دونوں کی پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم میں کُنْ فَیَکُوْن کے الفاظ آئے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان دونوں کی پیدائش عام ضابطہ پیدائش کے مطابق نہ تھی۔

پھر اسی العلم کو بنیاد قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے عیسیٰؑ کے متعلق دعویٰ خدائی کو رد کر دیا اور یہ تو واضح ہے کہ بحث کی بنیاد کوئی ایسا اصول ہی ہو سکتا ہے جو فریقین میں مُسلّم ہو اور وہ صرف بے پدر پیدائش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا کہ اگر بے پدر ہونے سے کوئی خدا ہو سکتا ہے تو عیسیٰ کے بجائے آدم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ ان کے باپ کے علاوہ ان کی ماں بھی نہ تھی۔ رہی معجزات کی بات تو یہ عیسیٰؑ کی کوئی انفرادی خصوصیت نہیں۔ بہت سے انبیاء کو معجزات عطا ہوئے ہیں نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ العلم کی تنزیل کے بعد کسی قسم کا شک کرنا مسلمان کا کام نہیں اور اگر پھر بھی کوئی ہٹ دھرم کج بحثی پر اُتر آتا ہے تو اس کا علاج صرف مباہلہ ہے۔

اثری وجوہ مماثلت: اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس مناظرہ اور ان آیات کا ذکر اثری صاحب نے کن کن مقامات پر کیا ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کیے ہیں۔ عیون زمزم کے ص۳ پر ایک سوال درج فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کو آدمؑ کا مثیل ٹھہرایا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ....الخ جیسے وُہ بے پدر ہے ویسے ہی یہ بھی بلا باپ پیدا ہوا ہے" پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"آیت کریمہ میں تو اس کا کوئی ذکر نہیں کہ تمثیل بے پدری میں دی گئی ہے اور یہ مناسب بھی نہیں کہ آدمؑ کسی کا بھی ولد نہیں اور عیسیٰؑ کو اعتراف ہے کہ میں ولد ہوں" (ص۳)

"گویا اس آیت کے لفظ خلق اور اس کے شانِ نزول کے متعلق جو روایات اُوپر درج کی گئی ہیں انہیں تو سامنے سے اوجھل کر دیا اور ایک عقلی دلیل پیش کر دی کہ آدمؑ کسی کے ولد نہیں۔ اور عیسیٰؑ ولد ہیں۔ اور ولد کیلئے ماں باپ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ وہی بے کار دلیل ہے جس کا ذکر ہم کسی دُوسرے مقام پر کر چکے ہیں۔ یہ دلیل شائد نیچر پرستوں کے کام تو آسکے مگر مسلمانوں کے لیے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جاری وساری قدرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ خوارق عادت امور سے منطقی نتیجہ اخذ کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ چنانچہ اثری صاحب خود فرماتے ہیں "کہ ازرُوئے

حدیث صحیحہ ہر آدم کی بیٹی کو لازماً حیض آتا ہے اور حوؑا کو بھی حیض آیا ہے لیکن وہ آدم کی دلیدہ نہیں۔ ایسے مواقع ذی علموں کے لیئے باعث مزلت نہ ہوں" (ب ص۴۷)

اب دیکھیئے اس مثال میں آدم کی پیدائش مسلمہ طور پر خرقِ عادت ہے اور حضرت عیسیٰ کی مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق۔ پھر ان خرقِ عادت اُمور میں ولدکی نسبت پیدا کرنے کیلئے نتیجہ اخذ کرنا کبھی درست نہیں ہوگا۔ اس مقام پر اثری صاحب نے ذی علموں کی مزلت کا کچھ خیال نہیں فرمایا۔

اب اثری صاحب نے اس تمثیل میں جو وجوہ مماثلت تلاش فرمائی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) پہلی وجہ عدم خدائی: پھر اسی ص۴ پر فرماتے ہیں: ۱ (عیسیٰ) کی نسبت اللہ پاک نے فرمایا نفخنا فیہ من روحنا اور ۲ (آدم) کی نسبت فرمایا ونفخت فیہ من روحی ۔لہٰذا اگر ۱ (عیسیٰ) خدا ہے تو ۲ (آدم) بھی خدا ٹھہرا اور اگر ۲ (آدم) خدا نہیں تو ۱ (عیسیٰ) بھی خدا نہیں بلکہ عام انسانوں کے لیئے ارشاد ہے وَ نفخ فیہ من روحِہٖ تو کیا سب خدا ہی نظر آرہے ہیں؟ کیا خوب ہے"۔

اب دیکھیئے اس آیت اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی میں یا اس کے شانِ نزول کی روایات میں نفخ رُوح کا ذکر تک نہیں ۔بہرحال آپ نے یہ ذکر چھیڑ کر یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ اگر آدم خدا نہ تھا تو عیسیٰ بھی خدا نہیں بلکہ کوئی انسان خُدا نہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ تشریح عدم مثلیت کی مثال ہوسکتی ہے ۔مثلیت کی نہیں ہوسکتی۔ جبکہ اللہ مثلیت کی مُثبت مثال پیش فرما رہے ہیں۔ عدم مثلیت کی نہیں نیز خلق کا لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ مثال دونوں کے بن باپ پیدا ہونے کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہے اور اسی بنیاد پر دونوں کے خدا ہونے کی نفی ہوتی ہے لیکن اثری صاحب اصل بنیاد کو تو تسلیم نہیں کرتے اور سارا زور اس کے نتیجہ پر صرف کر رہے ہیں۔ اگر اثری صاحب کے مطابق عیسیٰ کا باپ تسلیم کر لیا جائے تو نصاریٰ کے مباہلہ کی ساری عمارت از خود ہی دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عیسائی اگر عیسیٰ کی فطری پیدائش کے قائل تھے تو یہاں لینے کیا آئے تھے اور مناظرہ کیا چاہتے تھے؟ مگر اثری صاحب تو مماثلت کی بجائے عدم مماثلت کی توجیہہ بیان کرکے ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ عیسیٰ کی بے پدری پیدائش سے بھی انکار اور ان کے معجزات سے بھی انکار کہ عیسائیوں کے نزدیک عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کی ایک وجہ بھی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے معجزات کی کہیں نفی نہیں فرمائی بلکہ دو مقامات پر برملا ان معجزات کا اقرار کیا ہے۔

(۲) دُوسری وجہ ترابی ہونا: اس وجہ "مماثلت" نے اثری صاحب کو بہت پریشان کر دیا ہے۔ چنانچہ عیون زمزم ص۹۱ پر جواب ۲ کے تحت ایک نئی وجہ مماثلت دریافت کی ہے فرماتے ہیں :۔

اِس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ[1] (یعنی آدمؑ اور عیسیٰؑ) ترابی خاکی مخلوق ہے۔ ناری[2] یا نوری[3] نہیں۔ [1] (خاکی مخلوق) کثیف ہے اور [2] (یعنی ناری مخلوق) لطیف ہے اور [3] (یعنی نوری مخلوق) بہت ہی لطیف ہے۔ اور اللہ پاک اس سے بھی کہیں زیادہ لطیف و بلا کیف ہے تو جب [3] (یعنی نوری مخلوق) بھی اس (خدا) کی مثل نہیں تو [1] (یعنی خاکی مخلوق) کیسے اس کی مثال ہو۔" (ص ۹۱)

اِس جواب میں آپ نے خاکی، نوری، ناری اور کثیف لطیف کا فلسفہ بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ خاکی مخلوق خدا نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ آدمؑ و عیسیٰؑ دونوں خاکی یا ترابی ہیں لہٰذا خدا نہیں ہو سکتے۔ گویا آدمؑ و عیسیٰؑ میں وجہ مماثلت یا قدرِ مشترک صرف ترابی ہونا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ترابی ہونے میں تو سب انسان ہی آدمؑ کے مثیل ہیں۔ اس میں عیسیٰؑ کی خصوصیت کیا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ صرف انہیں ہی آدمؑ کا مثیل قرار دے رہے ہیں۔

(۳)۔ تیسری وجہ نُدرت: پھر اسی صفحہ پر جواب [3] میں آپ دبی زبان سے کچھ بے پدری کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ یہ ممکن ہے لیکن پھر بھی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جن ذی علموں نے پدری مماثلت پر اسے محمول فرمایا ہے ان کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ یہ مماثلت ناقصہ ہے تامہ نہیں تو پھر ندرت میں بھی مماثلت ہو سکتی ہے۔ بے پدری لازم نہیں۔" (ص ۹۱)

اب یہ اثری صاحب کو کون بتائے کہ مَثَل کا لفظ صرف کسی ایک قدرِ مشترک کے لیئے آتا ہے جیسے کمثل الحمار یا کمثل الکلب میں صرف ان لوگوں کی ایک آدھ صفت گدھے یا کتے جیسی بیان کی گئی ہے یہ نہیں کہ وہ لوگ اور کتا یا گدھا ہر پہلو سے ایک جیسے ہی تھے۔ کمثل آدم میں یہ قدرِ مشترک بے پدر ہونا ہے جیسا کہ لفظ خلق سے ظاہر ہے جو اثری صاحب کو کسی صورت گوارا نہیں۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اس مماثلت کے لیئے کوئی اور پہلو "تلاش کیا جائے مثلاً یہ مماثلت "نُدرت" میں بھی ہو سکتی ہے۔ چنداں ضروری نہیں کہ اس مماثلت کے لیئے بے پدری کا پہلو ہی سامنے رکھا جائے (اگرچہ یہ بھی ممکن ہے)

نُدرت کا پہلو تو آپ نے تلاش کر لیا لیکن اس لفظ ندرت کی تشریح نہیں فرمائی۔ ہمارے خیال میں نُدرت سے مراد نادر الوقوع ہونا ہے کہ جیسے آدمؑ نادر الوقوع ہیں کہ ان کا ماں باپ دونوں نہیں۔ اسی طرح عیسیٰؑ کی پیدائش نادر الوقوع ہے کہ ان میں کم از کم باپ کا وجود نہیں۔ خلقت کے لیئے عام ضابطہ تو یہی ہے کہ وہ زوجین سے پیدا ہوں۔ ان میں کچھ نُدرت نہیں۔ البتہ آدمؑ اور عیسیٰؑ دونوں میں نُدرت ہے۔ نُدرت

کی تشریح یہ ہمارے اپنے خیال کے مطابق ہے۔ ممکن ہے اثری صاحب "ندرت میں مماثلت" کے معنی کچھ اور لیتے ہوں۔

عیسائی مناظرہ اور رسول اللہؐ پر اتہامات

اسی مناظرہ کے متعلق اثری صاحب عیون زمزم ص۲۱ پر لکھتے ہیں:۔

مسجدِ نبوی میں عیسائیوں سے رسول اللہؐ کا جو مناظرہ ہوا وہ دُرِّ منثور میں ابن جریر اور ابن ابی حاتم سے منقول ہے۔ اس میں آپ نے اس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا۔ لَا یَکُونُ وَلَدٌ اِلَّا هُوَ یُشْبِهُ اَبَاهُ۔ ہر بچہ اپنی شکل وصورت اور دیگر کاموں میں اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی شکل وصورت خدا کی سی ہے تو وہ اس کا باپ ہے اور اگر اس کی شکل انسان کی سی ہے تو اس کا باپ انسان ہے۔ اس جوابی تقریر میں رسول اللہؐ نے عیسیٰؑ کا باپ تسلیم فرمایا ہے بلکہ عیسائیت کے خلاف اسے بطور ثبوت پیش فرمایا ہے"

پہلا اتہام: اب دیکھئے اس اقتباس میں اثری صاحب نے دُرِّ منثور میں سے منقول عبارت لَا یَکُونُ وَلَدٌ اِلَّا هُوَ یُشْبِهُ اَبَاهُ کا حوالہ جلد نمبر یا صفحہ نمبر نہیں دیا۔ اس مناظرہ کا ذکر قرآنِ کریم میں صرف سورۂ آل عمران کی آیات ۵۹ تا ۶۱ میں مذکور ہے۔ دُرِّ منثور کی ج ۲ صفحہ ۳۷ سطر ۲۲ سے لے کر ص ۴۰ سطر ۹ تک اس سے متعلق روایات درج ہیں (مطبوعہ دار المعرفۃ۔ بیروت) ان سب روایات کو بنظرِ غائر دیکھا لیکن ہمیں یہ الفاظ کہیں نہیں مل سکے جو اثری صاحب نے درج فرمائے ہیں لہٰذا یہ آپ کا رسول اللہؐ پر ایک بہت بڑا اتہام ہے کہ آپ نے یہ بات عیسائیوں کے سامنے کہی تھی۔

دوسرا اتہام: پھر اس غلط بنیاد پر آپ نے رسول اللہؐ کی زبانی عیسیٰؑ کا باپ تسلیم ہی نہیں کروایا بلکہ اسے بطور حجت عیسائیوں کے سامنے رسول اللہؐ کی زبانی پیش بھی کروایا ہے۔ یہ دوسرا اتہام ہوا۔

تیسرا اتہام: پھر اسی عیون زمزم کے ص۲۲ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ وہی دلیل ہے جسے رسول اللہؐ نے عیسائیوں کے بالمقابل پیش فرمایا کہ عیسیٰؑ اپنے باپ یوسف سے مشابہ تھا۔ لہٰذا وہ اس کا بیٹا ہے، خدا کا بیٹا نہیں کہ اس کے مجانس ومشابہ نہیں" (یہ بغیر کسی سوال کے اثری صاحب کا جواب ۲ کے تحت "نظیر" میں درج ہے)۔

اس عبارت میں اثری صاحب نے رسول اللہ کی زبانی صرف باپ تسلیم ہی نہیں کروایا بلکہ اس کے باپ کا نام بھی رسول اللہ ہی کی زبانی بتلا دیا ہے۔

چوتھا اتہام: عیون زمزم کے صفحہ ۲۲ پر فرماتے ہیں:-
"پھر آپ نے اس مناظرہ میں یہ فرمایا کہ اِنَّ عِیسٰی حملتہٗ اُمُّہٗ کما تحمل المرأۃ ثم وضعتہ کما تضع المرأۃ"۔ پھر اس کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں: "مریمؑ کو اسی طرح پر جائز حمل ہُوا جس طرح کہ دیگر عورتوں کو جائز حمل ہوا کرتا ہے۔

ہم اثری صاحب سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ اس ترجمہ میں لفظ جائز کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے؟ یہی لفظ تو متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس کا آپ نے بلا وجہ اضافہ کرکے رسول اللہؐ کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۴۱ پر اس بہتان کو صحیح طور پر رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"نیز رسول اللہؐ نے عیسائی مناظرہ میں مریم کے حمل کو جائز حمل ٹھہرایا ہے اور عیسیٰؑ کو اپنے باپ کے مشابہ بتایا ہے جو کہ آپ کی شان کے لائق ہے۔" (ص ۴۱)

پانچواں اتہام: پھر ایک آیت "وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ" درج فرماکر اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: "اگرچہ وضع اور حمل اُنثیٰ کا کام ہے۔ مگر یہ بھی بغیر ذکر ممکن نہیں، اسی طرح پہ مریمؑ کا حمل اور وضع اور رضع بھی بغیر شوہر ممکن نہیں۔" (ص ۲۲)

اس ترجمہ میں اثری صاحب نے "مگر یہ بھی بغیر ذکر ممکن نہیں" کے الفاظ اپنی طرف سے داخل کیے۔ پھر اس بنیاد پر مریمؑ کا شوہر ثابت کیا۔ پھر اسے اس انداز میں پیش کیا ہے۔ گویا یہ بھی نبوی دلیل ہے۔" (حوالہ ایضاً)

پھر فرماتے ہیں:-
"ان ۱، ۲، ۳ نبوی مناظرانہ جوابات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ نے عیسیٰؑ کا صحیح باپ تسلیم فرماکر عیسائیوں کا ناطقہ بند فرمایا ہے۔ یہ ہرسہ جوابات معالم اور دیگر تفاسیر میں بھی موجود ہیں۔" (ع ص: ۲۳)

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر ان جوابات سے عیسائیوں کا ناطقہ فی الواقعہ بند ہوگیا تھا اور ناطقہ بند کرنے والے یہی جوابات تھے جو آپ نے بزبان نبوی پیش فرمائے ہیں تو پھر مباہلہ تک نوبت کیوں پہنچ گئی تھی؟ اسی ناطقہ کی بندش کے متعلق آپ صفحہ ۲۲ پہ فرماتے ہیں:-
"پھر آپؐ نے اس مناظرہ میں فرمایا فَاِنَّ رَبَّنَا صَوَّرَ عِیسٰی فی الرحم کیف شاء" اور نتیجہ پیش کیا ہے کہ "عیسیٰؑ بھی اپنی تخلیق میں دوسروں کے ساتھ شامل ہے۔ کوئی خصوصیت نہیں۔"........" اس نبوی دلیل کا عیسائی نہ تو کوئی جواب دے سکے نہ اس کا انکار کرسکے۔"
ہم تو یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ یہ نبوی دلیل ہے کیا جس کے سامنے نصاریٰ لاجواب ہوگئے؟ یہ تو عیسائی بھی مانتے ہیں کہ رحم مادر میں عیسیٰ کی ایسے ہی تخلیق ہوئی جیسے عام ضابطہ الٰہی ہے اس پر انہیں اعتراض ہی کیا تھا

لہ: اس آیت کا ترجمہ یہ ہے اگر کوئی مادہ جو حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی ہے تو اس کا اللہ کو علم ہوتا ہے)

کہ انہوں نے اس نبوی دلیل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ (یہ جواب ص۲ ہے)

اب دیکھئے اصل مسئلہ ہی یہ ہے کہ اثری صاحب حضرت مریمؑ کا شوہر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی سے متعلقہ حوالے گول کر جاتے ہیں۔

آخر یہ معالم اور دیگر کتب تفاسیر کے حوالے کیوں پیش نہیں فرماتے؟ اتنی کتب تفاسیر اور معالم کے حوالوں کے بجائے صرف ایک ہی حوالہ رقم فرما دیجئے۔ اگر صحیح ہو تو ہمیں صرف ایک حوالہ ہی کافی ہے ورنہ انہیں برملا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ یہ سب کچھ رسول اکرمؐ کی ذات پر بہتان باندھا گیا ہے۔

اثری صاحب کی ہٹ دھرمی: آپ ص۹۰ پر ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ "بعض روایات میں آیا ہے کہ آیہ" ان مثل عیسیٰ عند اللہ .... کا نزول نجرانی عیسائیوں کے مناظرہ کے وقت ہوا ہے اور کہ آپ نے اس مناظرہ میں آیت تلاوت بھی فرمائی ہے۔ جس سے بے پدری کا اعتراف معلوم ہوتا ہے" پھر اس سوال کا جواب یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

جواب۱: یوں تو ساری سورت ہی اس موقع پر نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور مناظرہ میں اس آیت کی تلاوت ثابت نہیں۔ اور نہ اس کا کوئی ثبوت کہ آپؐ نے بے پدری کا اعتراف کیا تھا؟...... "اگر نبوی خیال میں یہ آیت بے پدری کا ثبوت ہوتا تو آپ اسے ولادت مسیح کی آیات کریمات میں درج فرماتے"۔ (ص ۹۰)

جواب۲: اگر آیات ولادت میں بھی اس کا اندراج ہو جاتا تو بھی بے پدری پر دال نہ ہوتا۔ بلکہ یہ ظاہر ہوتا کہ وہ ترابی، خاکی مخلوق ہے"۔ (ایضاً)

اس سوال و جواب سے درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:۔

(۱) اثری صاحب کا یہ قول کہ رسول اللہ نے مناظرہ میں یہ آیت اِنَّ مثل عیسیٰ ..... تلاوت نہیں فرمائی تھی۔ سفید جھوٹ ہے۔ اسی مضمون کے ابتدا میں ہم نے درمنثور سے جو چار روایات درج کی ہیں۔ ان میں سے پہلی دو میں یہی وضاحت ہے کہ عیسائیوں نے عیسیٰؑ کے باپ کے متعلق پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی اور چوتھی روایت میں یہ وضاحت ہے کہ دوسرے دن صبح آپ نے یہ آیت عیسائیوں کے سامنے تلاوت فرمائی۔

(۲) آپ کا یہ قول اِنَّ مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم۔ میں مماثلت بے پدری میں نہیں۔ یہ بھی سفید جھوٹ ہے جیسا کہ لفظ خلق اور روایت ۱ اور روایت ۲ سے ثابت ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت کی تفسیر میں تفسیر ابن عباس میں یہی بات بالوضاحت درج ہے اس تفسیر میں تین بار یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں کہ عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے جیسا کہ آدمؑ بغیر باپ پیدا ہوئے تھے۔ یہ تفسیر ہم نے کسی دوسرے مقام پہ درج بھی کر دی ہے تاہم اس کا حوالہ یہ ہے۔ (درمنثور ج ۲ ص ۱۲۹ حاشیہ پہ مطبوعہ دارالمعرفت۔ بیروت)

(۳) یہ آیت قرآن میں خواہ کہیں بھی درج ہوتی اثری صاحب یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں کہ یہ مماثلت بے پدری میں ہے۔ اب اگر کوئی صاحب "میں نہ مانوں" پر ہی اُتر آئیں تو ایسے شخص کے لیے سب دلائل بے کار ہو جاتے ہیں

چھٹا اتہام نبوی گرامی نامہ: اثری صاحب تاریخ طبری سے اس خط کا کچھ حصہ نقل فرماتے ہیں جو رسول اللہ نے شاہِ حبش کو بھیجا تھا۔ ہم عیون زمزم کے ص۲۳ سے اس خط کی عربی عبارت مع ترجمہ پھر اثری ترجمہ درج کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپ عوام الناس کو دھوکا دینے میں کس قدر مشاق ہیں لکھتے ہیں:

"جو کہ شاہِ حبش کی طرف رسول اللہ نے روانہ فرمایا وہ تاریخ طبری میں یوں مروی ہے کہ:

عیسیٰ ابن مریم روح اللہ و کلمتہ اَلْقَاھا الی مریم البتول الطیبۃِ الحصینۃ فحملت بعیسیٰ فخلقہ اللہ من رُوحِہٖ ونفخِہٖ کما خلق آدمَ بیدہٖ و نفخِہٖ

عیسیٰ بن مریم روح اللہ اور اللہ کا کلمہ تھے جسے اللہ نے مریم کی طرف ڈالا جو بتول (لذات دنیا سے الگ رہنے والی) پاک سیرت اور محصنہ فرج تھی وہ اس کلمہ کی وجہ سے عیسیٰ کے حمل سے حاملہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو اپنے رُوح اور نفخ سے پیدا فرمایا جیسے آدم کو اپنے ہاتھ سے اور نفخ سے پیدا فرمایا۔

اَب اثری ترجمہ و تشریح ملاحظہ فرمائیے جسے آپ نے رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا ہے:۔

"مریم نے اپنے زمانہ کی ہر ایک عورت سے جو رسم و رواج اور تبتل کی پابند تھی ممتاز ہو کر نکاح کیا۔ پھر اللہ پاک کے فضل و کرم سے اسے عیسیٰ کا حمل ٹھہرا۔ اور اللہ پاک نے اپنی پیدا کی ہوئی رُوح ڈال کر اُسے زندہ کیا جیسے کہ آدمؑ میں اپنی پیدا کی ہوئی رُوح ڈالکر اسے زندہ کیا تھا۔

"لہٰذا ان دونوں میں کوئی بھی خدا یا خدا کا بیٹا نہیں۔ پھر آپ نے یہی تقریر عیسائی مناظرہ میں فرمائی جیسے کہ معالم وغیرہ میں ہے:" (ص ۲۳)

دیکھا آپ نے اثری صاحب نے طبری کی روایت — جس کا ایک ایک لفظ حضرت عیسیٰ کے بے پدر ہونے کی تائید کر رہا ہے — کے ترجمہ میں از خود یہ اضافہ کر دیا کہ "مریم نے رسم و رواج اور تبتل سے ممتاز ہو کر نکاح کر لیا" یہ بات جہاں مریمؑ پر ایک بہت بڑا اتہام ہے۔ وہاں رسول اللہؐ پر بھی ہے کہ انہوں نے شاہِ حبش کو ایسا خط لکھا جس کے معنی یہ ہیں جو اثری صاحب بتلا رہے ہیں۔

اثری صاحب کو مریمؑ کا نکاح ثابت کرنے کا اتنا شوق ہے کہ وہ بلا جواز ایسے الفاظ کا از خود اضافہ فرما لیتے ہیں۔ آخر وہ کیوں ایسا حوالہ پیش نہیں فرماتے جس میں ان کے نکاح کا ذکر ہو؟ یہ حوالہ اگر

انہیں قرآن یا حدیث سے نہیں ملتا تو تفسیر یا تاریخ سے ہی پیش کر دیں۔ یہ بھی نہیں تو اناجیل سے ہی پیش کر دیں۔ جس میں ان کے نکاح کا ذکر ہو۔ اگر بے جواز اضافے وہ ہزار بار بھی کر لیں تو اس سے آپ کا کردار تو سامنے آ سکتا ہے۔ نفس مسئلہ کے حل میں کیا روشنی پڑ سکتی ہے؟

اور یہ تو غالباً اثری صاحب کی عادت سی ہو گئی ہے کہ جہاں کہیں آدم و عیسیٰ کی مماثلت بے پدری کا ذکر آتا ہے تو وہ فوراً اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ مماثلت نہیں بلکہ عدم مماثلت یا مماثلت کی نفی کا ذکر ہے کہ جیسے عیسیٰ خدا نہ تھے آدم بھی خدا نہ تھے۔ پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ آپ کے اس اندازِ فکر سے قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت اور اللہ تعالیٰ کے اظہار بیان کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے پھر اپنے نظریات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرنے میں کچھ باک نہیں سمجھتے۔ پھر ساتھ ہی یہ دعوٰے بھی ہے کہ "میں نے جو کچھ بیان کیا ہے امانت اور دیانت کے ساتھ ٹھیک بیان کیا ہے"۔ (ص ۱۶۴ زیر عنوان "بالآخر")

سورۂ انبیاء اور سورۂ تحریم

احصانِ فرج اور نفخہ روح: سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) وَالَّتِيٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱/۹۱)

اور اس عورت (مریم) کو بھی (یاد کرو) جس نے اپنی عفت کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور ان کو اور ان کے بیٹے کو اہل عالم کے لیئے نشانی بنا دیا۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ۔ (۶۶/۱۲)

اور (دوسری مثال اللہ تعالیٰ نے) عمران کی بیٹی مریم کی (بیان کی) جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور وہ اپنے پروردگار کے کلام اور اس کی کتابوں کو برحق سمجھتی تھی اور فرمانبرداروں میں سے تھی۔

اب دیکھئے ان دونوں مقامات پر جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کے احصان فرج کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی نفخ روح کا ذکر بھی کر دیا۔ جس سے مقصود صرف یہ ہے کہ حضرت مریم نے شادی نہ ہونے کے باوجود بھی

اپنی عفت کو محفوظ رکھا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں رُوح پھونکی تو ولادتِ عیسیٰؑ ظہور میں آئی۔

اثری صاحب کی چالاکی: اب اثری صاحب کی چالاکی یہ ہے کہ وہ احصان فرج اور نفخہ رُوح کو ایک مقام پر کبھی زیرِ بحث نہیں لاتے بلکہ احصان فرج کی الگ بحث کرتے ہیں اور وہ بھی کئی مقامات پر بکھری ہوئی ہے اسی طرح نفخہ رُوح کی بحث الگ پیش کر دیتے ہیں اس سے انہیں یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ احصان فرج کا ایک معنیٰ شادی کرنا بھی ہے اور نفخہ رُوح کا ذکر جہاں آدمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں آتا ہے تو عام پیدائش کے متعلق بھی آتا ہے کہ حمل ٹھہرنے کے چار ماہ بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عورت کے رحم میں رُوح پھونکی جاتی ہے۔ اس طرح الگ الگ مطلب پیش کرنے سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی اعجازی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اگرچہ آیت کے ربط کا ستیاناس ہو جاتا ہے مگر آپ کا تو دراصل مقصود ہی یہی ہے اگر انہیں اکٹھا بیان کیا جائے تو چونکہ یہ دونوں الفاظ اکٹھے اور کسی عورت کے لیے نہیں آئے۔ لہٰذا انہیں سے حضرت عیسیٰ کی اعجازی حیثیت ثابت ہوتی ہے۔

احصان فرج کا معنی صرف شادی: آپ فرماتے ہیں کہ "احصانِ فرج "ترکِ شادی پر دال نہیں بلکہ نکاح کے ذریعہ سفاح سے احتراز ہے"۔ (ص۲)

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ احصان فرج کا معنی صرف اپنی ناموس کی حفاظت کرنا ہے جو شادی کے بغیر بھی ممکن ہے (البتہ شادی بھی اس کا ایک ذریعہ ہے) جیسا کہ قرآن میں ہے۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا (۲۴/۳۳) — اپنی چھوکریوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ اگر وہ بچنا یا اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہیں

اور احصان کا ایک معنیٰ لونڈیوں کا آزاد ہونا بھی ہے اور محصنٰت بمعنی آزاد عورتیں[1] ہی ہے نہ کہ شادی شدہ عورتیں (۴/۲۵) ہم سردست یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اثری صاحب خود ہی سورہ تحریم کی مذکورہ آیت کا ایک دوسرے مقام پر ترجمہ کرتے ہیں تو احصان فرج کا ترجمہ "ناموس کی حفاظت" کر کے "نکاح کے ذریعہ سفاح سے احتراز" کی قید کی تردید فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ بیان المختار ص۳۵ زیرِ عنوان ازالہ اوہام سُورہ تحریم کی مذکورہ آیت کا ترجمہ یوں پیش فرماتے ہیں۔

"اور مریم عمران کی بیٹی کا حال بیان کیا جاتا ہے جس نے اپنی ناموس کو محفوظ رکھا سو ہم نے اس میں اپنی رُوح پھونک دی اور اس نے اپنے پروردگار کے پیغاموں اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداروں سے تھی"۔

اس مقام پر اوہام کا ازالہ فرما رہے تھے تو ترجمہ یُوں کر دیا پھر جب اپنی ہٹ دھرمی پر آتے ہیں تو

---

[1] عیون زمزم کے ۹۳ صفحہ پر آپ نے محصنٰت کا ترجمہ آزاد عورتیں ہی لکھا ہے۔

بہتان طرازی سے بھی نہیں چوکتے جیسا کہ درمنثور کے حوالہ سے عنوان زمزم کے ص پر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

امیر معاویہ پر بہتان طرازی:

"قیصر روم نے امیر معاویہ کو خط لکھا کہ مجھے بتایا جائے کہ مردوں سے کون اور عورتوں سے کون بزرگ ہو گزرا ہے تو امیر معاویہ نے جواباً لکھا کہ مردوں میں سے حضرت آدمؑ جنہیں اللہ پاک نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور سکھایا پڑھایا اور عورتوں میں سے مریمؑ ہے جس نے احصنت فرجھا۔ اپنی عفت کے لیئے شادی کی تھی۔"

دیکھا آپ نے اس اقتباس میں صرف دو لفظ عربی ہیں باقی سب اثری صاحب کے ہیں پھر درمنثور عربی زبان میں ہے اس میں "اپنی عفت کے لیئے شادی کی تھی" کے الفاظ ہونا ناممکن ہے۔ یہ اثری صاحب کا اپنا ذہنی ترجمہ ہے جسے آپ نے حضرت معاویہ کی طرف بلا تکلف منسوب کر دیا ہے۔

احصان فرج کا معنی شادی ہی ہے اس کی دلیل:

آپ ص ۸۰ پر احصان فرج کے معنی شادی کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ

"سورۂ انبیاء اور سورۂ تحریم میں والتی احصنت فرجھا وارد ہوا ہے تو اس کا بھی تو یہی مطلب ہوا کہ مریمؑ نے شادی کی تھی اور ایسے ہی فاطمہؓ کے متعلق احصنت فرجھا وارد ہوا ہے اور اس نے شادی کی تھی۔"

گویا دلیل کی صورت یہ بنی کہ چونکہ حدیث میں فاطمہؓ کے لیئے احصنت فرجھا کے لفظ بھی آئے ہیں اور اس نے شادی بھی کی تھی اور یہی لفظ حضرت مریمؑ کے لیئے آئے ہیں لہٰذا اس نے بھی ضرور شادی کی تھی۔" یہ دلیل جس قدر کمزور اور بودی ہے اس پر ہم پہلے ہی تبصرہ کر چکے ہیں۔

نفخ روح اور اصل مبحث سے گریز:

آپ فنفخنا فیہ من روحنا کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ اللہ پاک نے سورۂ انبیاء میں فنفخنا فیھا من روحنا (۲۱/۹۱) فرما کر عورت میں نفخہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اور سورۂ تحریم میں فنفخنا فیہ من روحنا (۶۶/۱۲) فرما کر فرج میں نفخہ کا ذکر فرمایا ہے جو ٹھیک ہے اور مطابق واقعہ ہے کہ محل دخول وخروج ہے اور یہ کام جو شخص بھی جائز طور پر کرتا ہے اسی کا نام شوہر ہے۔" (ص ۸۰)

اب دیکھیئے کہ اصل سوال یہ ہے کہ فنفخنا فیہ من روحنا کا مطلب کیا ہے یہ نہیں کہ شوہر کی کیا تعریف ہے؟ جس کا آپ نے جواب پیش کر دیا ہے۔ بھلا فرج کے محل دخول وخروج ہونے سے کس کمبخت کو انکار ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو یہ فرماتے ہیں کہ "ہم نے مریم کے فرج میں پھونکا" تو کیا یہ نفخہ شوہر کے نطفہ کا قائمقام تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تھا تو اس اضافی نفخہ کا فائدہ کیا تھا؟

پھر آگے چل کر ایک اور لایعنی پہلو پر سوال اٹھایا ہے کہ "نفخہ اور پیدائش منہ کی طرف سے تو ٹھیک نہیں

قرآن میں مخاض دردزہ کا ذکر آیا جو کہ فرج میں ہُوا کرتا ہے۔" (ایضاً ص ۸)

اس سوال پر غور فرمائیے کہ یہ کیا سوال ہے؟ اس عبارت کو اگر سوال قرار دینا ہی ہے تو اس عبارت کا پہلا حصّہ سوال ہے اور دُوسرا حصّہ جواب۔ سوال یہ بنتا ہے کہ "آیا نفخ اور پیدائش مُنہ کی طرف سے ٹھیک ہے"؟ اور اس کا جواب یہ بنتا ہے کہ "ٹھیک نہیں کیونکہ قرآن میں مخاض یا دردِ زہ کا ذکر آیا ہے جو فرج میں ہوا کرتا ہے"۔

چلیئے! ہم اسے سوال ہی فرض کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے جواب میں اثری صاحب نے اور بھی کئی پہلوؤں کا ذکر چھیڑ دیا ہے لہٰذا ہم پورا جواب نقل کرتے ہیں:۔

"ہمارے ذی علموں کے خیال کے مطابق تو مخاض پتھروں کو بھی ہُوا کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ناقہ پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے صالحؑ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے جبکہ اللہ پاک کے ضابطہ سے اس کی قدرت کو الگ کر لیا گیا تو پھر کسی ضابطہ کی کیا ضرورت ہے"؟

"مرزا قادیانی نے تو درختوں کے پتوں کے ساتھ بھی پھلوں کی طرح عیسیٰ پیدا کر دیئے ہیں جیسا کہ مواہب الرحمٰن میں ہے کہ نؤمن بانّہٗ اِنْ یشآءَ یخلق من ورق الاشجار کمثل عیسیٰ" (ایضاً ص ۹)

اس جواب میں آپ نے اپنا عقیدہ تو بیان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیدا کردہ نظام کے خلاف نہیں کر سکتا لہٰذا ناقۃ اللہ کی پیدائش کا قصّہ بھی غلط ہے اور اگر کوئی شخص اللہ کی قدرت کی یہ انتہا بتلائے کہ وہ درختوں کے پتوں سے بھی عیسیٰ کی طرح پیدا کر سکتا ہے تو آپ اسے لغو قرار دیتے ہیں مگر اصل سوال وہیں کا وہیں رہا کہ "فنفخنا فیھا من رُوحنا" کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سوال کا جواب اس ساری بحث میں کہیں آیا ہے؟

حدیث نفخ رُوح سے فرار کی راہیں:

اس ضمن میں آپ حدیث کی چار پانچ کتابوں کے حوالہ سے ابی بن کعبؓ سے ایک حدیث درج فرماتے ہیں:۔ (ص ۷)

وکان رُوح عیسیٰ من تلک الارواح التی اخذ عھدھا فی زمن آدم فارسلہ اللہ الی مریم فی صورۃ فتمثل لھا بشراً سویا قال اُبی فدخل من فیھا	عیسیٰ کی رُوح ان ارواح سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے زمانہ میں عہد لیا تھا (عہد الست) پھر اُس رُوح کو مریم کی طرف ایک تندرست انسان کی صورت میں بھیجا تو جو روح اس انسان میں تھی وہ مریم میں داخل ہو گئی۔

یہ روایت درج کرنے کے بعد اثری صاحب نے مشکوٰۃ سے بحوالہ مسند احمد درج ذیل حدیث بھی تحریر فرمائی ہے:

عیسیٰ ابن مریم من تلک الارواح فارسلہٗ الی مریم نحدث عن اُبی انّہٗ دخل من فیھا۔	عیسیٰ بن مریم کی ہی یہ رُوح تھی جسے اللہ نے مریم کی طرف بھیجا۔ حضرت ابی بن کعبؓ سے بیان کیا گیا کہ وہ رُوح مریم میں داخل ہو گئی۔

چونکہ یہ حدیث بہت سی کتابوں میں مذکور ہے اور اپنے مطلب میں صاف ہے اس رکاوٹ کو دُور کرنے کیلئے آپ نے اس پر جو نقد و نظر فرمایا وہ مع جوابات درج ذیل ہے۔

(۱) "یہ حدیث موقوف ہے"۔ (یعنی ابی بن کعبؓ کا قول ہے جو اگرچہ "اثر" ہے تاہم اثری صاحب کے نزدیک قابلِ اعتراض ضرور ہے)۔

(۲) "ابی بن کعبؓ تواریخ کتب سابقہ سے بھی نقل فرماتے ہیں"۔ ہمارے خیال میں اگر بیان قرآن و حدیث کے خلاف نہ ہو تو اس کا بیان کرنا چنداں قابلِ اعتراض نہیں ہوتا اور اثری صاحب کا اپنا یہ حال ہے کہ بائیبل سے ایسے بیان پیش کرتے ہیں اور قابلِ حجت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ قرآن و سنت کے صریح خلاف ہیں تو پھر انہیں یہ کہنے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔

(۳) "ضروری نہیں کہ زیر بحث الفاظ سب کتابوں میں درج ہوں"۔ پھر تو آپ کو یہ روایت درج ہی نہ کرنا چاہیئے تھا یا پھر اس کی وضاحت کر دینا چاہیئے تھا۔

(۴) "مُحْدَثٌ کا فاعل معلوم نہیں اور نہ یہ کہ وہ مقولہ کس کا ہے" حالانکہ اُوپر آپ خود درج کر آئے ہیں کہ یہ قول ابی بن کعبؓ کا ہے۔

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے کہ اگر آخری لفظ مَنْ فِيهَا کی بجائے مِنْ فِيهَا ہو تو منہ اور معدہ محل غذا تو ہے محل حمل نہیں"۔ اس اعتراض کا جائزہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

باب ۶

ولادتِ عیسیٰؑ اور حدیث و آثار

اثری صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ :۔

اثری صاحب کا دعویٰ: "نہ تو قرآن نے واضح الفاظ میں یہ صراحت کی ہے کہ عیسیٰ کا باپ نہیں تھا نہ رسول اللہؐ نے ایسا فرمایا نہ صحابہ کرام نے تو پھر خواہ مخواہ ایسے لفظوں کے استعمال کی کیا ضرورت ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہوں" (ع۔ز۔ص ۵۰)

چاہیئے تو یہ تھا کہ جب اثری صاحب عام مسلمانوں کے ایک متفقہ عقیدہ کے خلاف ایک داعیہ لے کر اُٹھے ہیں تو آپ قرآن یا حدیث سے کوئی ایسا واضح جملہ پیش فرما دیتے کہ مریم کا نکاح ہُوا تھا اور اُن کا یہ شوہر عیسیٰؑ کا باپ تھا اور وُہ فلاں تھا۔ آپ نے تقریباً دوصد صفحات پر مشتمل کتاب لکھ دی مگر یہ کام تو کر نہ سکے اُلٹا مسلمانوں پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ قرآن و حدیث اور صحابہ کرام کے قول نہ ہونے کے باوجود مسلمان اس عقیدہ کو اپنائے ہوئے ہیں ؎ چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے ہمارے اطمینان کے لیئے یہ بات کافی ہے کہ اثری صاحب نے خود بھی عیون زمزم میں متعدد بار اعتراف فرمایا ہے کہ قرآن نے عیسیٰ کی پیدائش کا ذکر اس انداز سے اور اس تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ بے پدر پیدا ہوئے تھے مثلاً عیون وزمزم کے صنہ۵ پر فرماتے ہیں :۔

سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں اللہ پاک نے عیسیٰ کا حال مفصّل طور پر بیان فرمایا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وُہ بے پدر پیدا ہوئے ہیں ان کے باپ کا کہیں ذکر نہیں ہے" (ص ۵۰)

اس حقیقت کو آپ نے ایک سوال کی شکل دی ہے اور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ

"اتنی تفصیل کے باوجود یہ تو پھر بھی کہیں نہیں فرمایا کہ وُہ بے پدر پیدا ہوا ہے جس کے لیئے عربی میں الفاظ وَلِدَ من غیر والدٍ یا وَلِدَ من غیر اَبٍ یا لَیْسَ لَهٗ اَبٌ وغیرہ ہونے چاہئیں تھے (حوالہ ایضاً)

اصل اعتراض: گویا اثری صاحب بھی یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا انداز بیان ایسا ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے والد نہیں تھے تو اب جو لوگ قرآن سے ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے لیئے تو قرآن کریم کا یہ انداز بیان ہی کافی ہے اور جو لوگ قرآن کو پہلے سے کوئی باطل

نظریہ قائم کرکے قرآن کو دیکھتے ہیں۔ انہیں بھی قرآن گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ چونکہ اتنی تفصیل کے باوجود بھی قرآن میں وَلِدَ من غیر اب یا لیس لہٗ ابٌ جیسے الفاظ موجود نہیں۔ لہٰذا عیسیٰؑ کا باپ بنا لینے کی گنجائش موجود ہے اور اسی گنجائش نے اثری صاحب کو قرآن کی اس "ساری تفصیل" کی دوراز کار تاویلات پر اکسایا اثری صاحب کے اس اعتراض کا جواب البتہ ہمارے ذمہ ہے کہ اتنی تفصیل کے باوجود ایسے ایسے الفاظ قرآن میں کیوں نہیں آئے۔

قرآن کا طرزِ بیان: (۱) قرآن کریم کا اندازِ بیان فصاحت وبلاغت میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ فصاحت وبلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی بات طرزِ بیان سے واضح طور پر معلوم ہو جائے تو پھر اس کی مزید تفصیل پیش کرنا ایک طرف تو فصاحت وبلاغت کا ایک نقص سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف مخاطب کی کور ذوقی پر دلالت کرتا ہے اور یہ کوئی اہل عرب اور عربی زبان کا ہی خاصہ نہیں بلکہ دنیا کے تمام اہل علم جو کچھ بھی فصاحت وبلاغت کا ذوق رکھتے ہیں اس طرح کی مزید تفصیل سے اجتناب بھی کرتے ہیں اور اسے معیوب بھی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ایسا طرزِ بیان اختیار کرنے کے بعد قرآن نے "ایسی مزید تفصیل" کو معیوب سمجھ کر عمداً ترک کیا ہے عقلمند کو تو اشارہ بھی کافی ہوتا ہے تو کیا قرآن کریم کے مخاطب نعوذ باللہ ایسے ہی بدھو تھے کہ ان کو ایسے طرز بیان کے بعد جس سے صاف طور پر یہ واضح ہو رہا ہے کہ عیسیٰ کے باپ نہیں تھے، مزید تفصیلی الفاظ کی ضرورت باقی رہ جائے؟

(۲) اثری صاحب نے پدر ہونے کے لیئے عربی الفاظ کی جو لسٹ مرتب فرمائی ہے یہ عربی الفاظ تو ضرور ہیں۔ مگر فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے اس قدر فروتر ہیں کہ ایسے الفاظ کی قرآن کریم جیسی فصیح وبلیغ کتاب میں گنجائش نہ تھی۔ مخمل کے کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند لگانا بھلا کیسے گوارا ہوتا ہے؟

(۳)۔ البتہ یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ اگر عیسیٰ کا کوئی باپ ہوتا تو قرآن کریم کو ایسی تفصیلات دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس صورت میں یہ بھی ایک عام واقعہ ہوتا اور اگر بغرض تسلیم ضرورت پیش آئی تھی تو قرآن کریم میں عیسیٰ بن مریم کی جگہ عیسیٰ بن یوسف آنے میں آخر کیا حرج تھا؟ بلکہ عیسیٰ بن مریم کا بار بار تکرار نہ ہوتا صرف دوسرے انبیاء کی طرح صرف نام ہی مذکور ہوتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ ان کا بھی باپ ہے جیسے دوسروں کا ہوتا ہے

رسول اللہؐ کا بیان: دوسرا سہارا جو اثری صاحب نے لیا ہے وہ یہ ہے کہ "پھر اس کے بعد رسول اللہ نے بھی کبھی یہ لفظ ارشاد نہیں فرمایا نہ صحابہ کرام نے"۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ مناظرہ ۱۰ھ کے آواخر میں پیش آیا تھا (فتوح البلدان ص ۱۰۸ نیز زاد المعاد لابن قیم ج ۳ ص ۱۲۳) اور ۱۱ھ کے اوائل میں رسول اللہؐ کی وفات ہو گئی۔ اس وقت مدینہ کے اطراف وجوانب سے کلی طور پر یہود جلا وطن کیئے جا چکے تھے مشرکین بھی یا تو

اسلام لا چکے تھے یا انہیں جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ عیسائی مناظرہ اور مباہلہ میں شکست کھا کر جزیہ کا معاہدہ کر کے واپس چلے گئے تھے۔ اب باقی صرف مسلمان تھے جو عیسیٰؑ کو قرآن کریم کے ارشادات کے مطابق بے پدر اور رُوح اللہ اور کلمۃ اللہ مانتے تھے تو پھر آپ کس سے کہتے کہ "عیسیٰ کے باپ نہیں تھے"۔ لہٰذا حالات کے تقاضے کے مطابق اس بارے میں کسی مرفوع حدیث یا حضور اکرمؐ کے قول کا ثابت ہونا ہمارے خیال میں ناممکن الوقوع ہے۔ ہاں صحابہ کے اقوال یا موقوف احادیث تو ایسی بہت سی احادیث مل جاتی ہیں جن میں حضرت عیسیٰؑ کے بے پدر پیدا ہونے کا ذکر ہے: تاہم اس وقت ہم انہی احادیث کا ذکر کریں گے جو اثری صاحب نے خود بھی درج فرمائی ہیں تاکہ ان پر اثری صاحب کا تبصرہ اور جواب الجواب بھی پیش کیا جا سکے۔

احادیث سے عیسیٰؑ کی بے پدری کے ثبوت

حدیث ۱۔ متعلقہ بے پدر پیدائش: آپ خود ہی عیون زمزم کے صفحہ ۴۹ پر عون المعبود شرح ابوداؤد سے مندرجہ ذیل حدیث نقل کرتے ہیں:۔

هل جاء التصريح فى الحديث بان عيسىٰ بن مريم عليه السلام تولد من غير اب ؟ قلت نعم ! اخرج عبد بن حُمَيْد الكشى فى مسنده عن عبيد الله بن موسىٰ قال نا اسرائيل عن ابى اسحٰق عن ابى بردة بن ابى موسىٰ عن ابيه قال:۔

کیا حدیث میں یہ تصریح موجود ہے کہ عیسیٰ بن مریم بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ میں نے کہا ہاں۔ عبد بن حمید الکشی نے اپنی مسند میں عبید اللہ بن موسیٰ سے انہوں نے اسرائیل سے انہوں نے ابو اسحٰق سے انہوں نے ابو بردہ بن ابی موسیٰ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ:۔

اَمَرَنَا رسول الله صلى الله عليه وسلم الى ارض النجاشى فذكر الحديث وقال النجاشى لجعفر : ما يقول صاحبك فى ابن مريم ؟ قَالَ يقولُ فيه قول عزّ وجلّ هُوَ رُوحُ الله وكلمته اخرجه من العذراء البتول لَمْ يقربها بَشَرٌ۔

ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے ملک میں جانے کا حکم دیا۔ پھر حدیث بیان کی اور کہا۔ نجاشی نے جعفرؓ سے پوچھا، تمہارا پیغمبر ابن مریم کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ جعفرؓ نے کہا: "وہ پیغمبر وہی کچھ کہتا ہے جو اللہ عزّ و جلّ نے فرمایا کہ عیسیٰ رُوح اللہ اور اس کا کلمہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بتول عذرا سے پیدا کیا اور کوئی بشر ان کے نزدیک نہ گیا تھا۔"

قال فتناول النجاشى عودًا من الارض وقال

راوی کہتا ہے کہ پھر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اُٹھایا

یامعشر القسیسین والرہبان ما یزید ھولاء علی ما یقولون فی ابن مریم وبمن جئتم من عندہ فانا اشھد انہ رسول اللہ.... اسناد صحیح"

اور کہا: "اے عالموں اور راہبوں کے گروہ! جو کچھ یہ یہ لوگ (مسلمان) کہتے ہیں اسکے مقابلہ میں جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اس تنکا کے برابر بھی زیادہ نہیں۔ سو میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے" اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں۔

اب اس حدیث سے اثری صاحب نے جو سلوک فرمایا وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

حدیث سے اعراض: (۱) اس حدیث کا ترجمہ نہیں بلکہ آخر میں اپنے مطلب کے چند الفاظ "کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن مریم کو بتول اور عذرا کا بیٹا تسلیم فرمایا ہے" لکھ دیئے ہیں۔ پھر یہ بے کار بحث شروع کر دی ہے کہ ضروری نہیں جو عورت عذرا اور بتول ہو وہ بے شوہر بھی ہو۔ حضرت فاطمہؓ بتول بھی تھیں اور ان کا شوہر بھی تھا۔

(۲) اس مسئلہ میں جو اصل فیصلہ کن الفاظ تھے یعنی "لم یقربھا بشر۔ کوئی بشر مریم کے نزدیک تک نہ گیا" کا نہ ترجمہ لکھا ہے نہ ہی اسے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ پھر ساتھ ہی ساتھ آپ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ "جو کچھ میں نے بیان کیا ہے۔ دیانت اور امانت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک بیان کیا ہے" (عیون زمزم صہ ۱۶۴ زیر عنوان "بالآخر")

غور فرمایئے یہ الفاظ لم یقربھا بشر جعفر بن طیار جیسے جلیل القدر صحابی کے ہیں جو رسول اللہ کے حکم سے وہاں گئے تھے۔

(۳) محدث کہتا ہے کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں مگر آپ اس کی اسناد سے کیڑے نکالتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اس کا راوی ملا (عبید اللہ بن موسیٰ) شیعہ ہے جیسے کہ تقریب میں ہے تو یہ حدیث صحیح کیسے ہوئی؟ اور جو کچھ اس میں بیان ہے اس میں بے پدری کی کوئی تصریح نہیں" (ایضاً صہ ۵)

حدیث پر تنقید: اس اقتباس کا دوسرا حصہ کہ "بے پدری کی کوئی تصریح نہیں" جیسا سفید آدر دیدہ دانستہ جھوٹ ہے۔ اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں اگر یہ حدیث صحیح نہیں تو لم یقربھا بشر کے الفاظ نظر انداز کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ البتہ عبید اللہ بن موسیٰ کے شیعہ ہونے اور اس بنا پر حدیث کے ناقابلِ قبول ہونے کی بابت بھی سن لیجئے:۔

ا۔ تقریب میں یہ لفظ قطعاً نہیں کہ وہ شیعہ تھا بلکہ الفاظ میں "یَتَشَیَّعُ" یعنی شیعیت کی طرف مائل تھا۔ تقریب کے پورے الفاظ یہ ہیں:

وثقہ ابن حجر وکان یَتَشَیَّعُ وَکَانَ فِی اِسْرَآئِیلَ

ابن حجرؒ نے اسے ثقہ قرار دیا ہے وہ شیعیت کی طرف مائل

اَثْبَتُ مِنْ اَبِیْ نُعَیْمٍ۔ | تھا۔ اسرائیل میں تھا اور ابونعیم سے بھی زیادہ قابل اعتماد تھا۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا راوی جس کی عدالت و ثقاہت میں کچھ کلام نہ ہو تو کیا محض شیعیت کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے اس کی روایت ناقابل قبول سمجھی جاسکتی ہے بالخصوص جب کہ اس روائیت کا تعلق شیعیت کے مخصوص عقائد سے بھی نہ ہو؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے چنانچہ حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں عبید اللہ بن موسیٰ کو ناقابل مواخذہ سمجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا۔ ابن جریر پر شیعیت کا الزام ہے۔ حالانکہ ان کی تفسیر اور تاریخ اہل سنت کے مراجع و مصادر میں شمار ہوتی ہیں اور خود اثری صاحب نے ان سے بہت سی روایات درج فرما کر استدلال کیا ہے۔

(ب) تذھیب تھذیب میں ہے کہ عبید اللہ بن موسیٰ سے صحاح ستہ کے تمام محدثین نے روایت کو قبول کر کے روایت کی ہے حتیٰ کہ امام بخاری نے بھی ان سے روایت کی ہے۔

(ج) الجرح والتعدیل میں ہے کہ ابن معین اور عجلی جیسے جرح و تعدیل کے نقادوں نے عبید اللہ بن موسیٰ کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(د) ابوداؤد اس کو شیعہ سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے اس سے روایت بھی کی ہے۔

لیکن اثری صاحب عبید اللہ بن موسیٰ کو شیعہ قرار دے کر حدیث کو ہی مردود اس لیئے قرار دے رہے ہیں کہ اس میں لم یقربھا بشر کے الفاظ آئے ہیں۔

حدیث نمبر ۲: دوسری حدیث جسے آپ نے درج فرما کر اپنی تحقیق و تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ لکھتے ہیں: مستدرک حاکم جلد ۳ میں نیز درمنثور ج ۲ میں بحوالہ دلائل بیہقی سلمان فارسی کا بیان ہے کہ:

و ذکر مولد عیسی بن مریم علیہ السلام وانّہ وُلِدَ بغیر ذکر..... (الحدیث (ع ص ۵۱)	اور سلمان فارسی نے عیسیٰ بن مریم کی پیدائش کا ذکر کیا تو کہا کہ بیشک وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے ..... الیٰ آخرہ

(۱) آپ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "عیسیٰ کی پیدائش میں باپ کا کوئی تعلق نہیں"۔ گویا وُلِدَ بغیر ذکر کا ترجمہ یہ ذومعنی فقرہ ہے اگر "کوئی باپ نہیں" کہتے تو معاملہ صاف ہو جاتا تھا لیکن "باپ کا کوئی تعلق نہیں" یہ چند الفاظ بڑھا کر اصل معاملہ کو پیچیدہ کر دینا آپ کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

(۲) اس حدیث پر آپ کو یہ اعتراض ہے کہ امام ذہبی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ آپ کی تحقیق و تنقید کا انداز ہم پوری تفصیل سے پیش کر چکے ہیں لہٰذا 'آزمودہ را آزمودن جہل است' کے مصداق ہم اس اعتراض کو

درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ کہ مشتے نمونہ از خروارے پہلے ہی دیکھ چکے ہیں لہٰذا آپ کی اس تحقیق پر وقت ضائع کرنا چنداں مفید ثابت نہ ہوگا۔

حضرت سلمان فارسیؓ پر اعتراض: (۳) سلمان فارسی جلیل القدر صحابی ہیں مگر چونکہ انہوں نے عیسیٰؑ کو بے پدر کہا ہے لہٰذا وہ بھی اثری صاحب کی تنقید سے بچ نہیں سکے۔ ان کے متعلق فرماتے ہیں ۔۔۔ کہ "سلمان فارسیؓ اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے۔ (چلیئے ایک مسئلہ تو حل ہوا کہ عیسائی بھی آپ کو بے پدر تسلیم کرتے ہیں) پھر یہ کہ سلمان فارسیؓ نے کسی دوسرے عیسائی سے جو اس کا فاعل ہے (؟) یہ بات بیان کی ہے۔" (ع ص۵۱)

اب سوال یہ ہے کہ صحابہؓ تو سب کے سب اسلام لانے سے پہلے یا مشرک تھے یا عیسائی تھے یا یہودی تھے اگر وہ اسلام لانے کے بعد بھی دوسرے فاعلوں (؟) کے بیان ہی دیتے رہے تو ان کا اسلام کیا ہوا؟

سلمانؓ پر یہ تنقید فرمانے کے بعد لکھتے ہیں "نجاشی کے پاس جعفر طیار اور دیگر صحابہ کرام پہنچے اور اسے سورۂ مریم پڑھ کر سنائی جسے سن کر وہ بہت خوش ہوا مگر عیسیٰؑ کو بے پدر نہیں بتایا۔" (ایضاً ص ۵۱)

اور جس طرح "بے پدر نہیں بتایا" اس کی وضاحت ہم نے پہلی حدیث میں پیش کر دی ہے کہ الفاظ کا ترجمہ ہی چھوڑ دیا جائے، مہمل طریق پر بیان کر دیا جائے تو یہ مسئلہ از خود آسانی سے حل ہو جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی پدری پیدائش ثابت ہو جاتی ہے۔

حدیث نمبر۳: عیون زمزم ص۴۶ پر مکالمہ ۱۰ کے تحت آپ لکھتے ہیں کہ (۱) درمنثور سے بروایت عبداللہ بن عباس (۲) خصائص کبریٰ بحوالہ بیہقی، موسیٰ بن عقبہؓ سے اور (۳) دلائل النبوۃ میں ابونعیم اور عروہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ جعفر طیار نے نجاشی کے پوچھنے پر یہ جواب دیا کہ "وہ عیسیٰ اللہ پاک کا بندہ ہے اور اس کا رسول ہے اور کلمہ ہے اور روح ہے اور کہ اس کی ماں پاکیزہ ہے 'عذرا ہے' بتول ہے اور مستدرک حاکم میں یوں زائد بھی ہے کہ لَمْ يَقْرَبْهَا بَشَرٌ اور درمنثور بحوالہ بیہقی عبداللہ بن مسعود سے یوں مروی ہے کہ لَمْ يَمْسَسْهَا بَشَرٌ جیسے کہ قرآن مجید میں ہے۔" (ص ۴۶)

اب دیکھیئے کہ اس اقتباس میں اثری صاحب نے یہ الفاظ درج بھی فرمائے ہیں "لم یقربھا بشر۔ یعنی مریمؑ کے کوئی بشر قریب نہیں گیا تھا اور نیز لَمْ يَمْسَسْهَا بَشَرٌ یعنی حضرت مریم سے کسی بشر نے مس نہیں کیا تھا۔ یہی وہ الفاظ ہیں جو حضرت مریمؑ کو بے شوہر اور حضرت عیسیٰ کو بلا پدر ثابت کرتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ آپ نے اس روایت کی تشریح میں پورے اڑھائی صفحے سیاہ کر دیئے ہیں مگر ان الفاظ کو یوں نظر انداز کیا ہے جیسے یہ الفاظ بالکل بے معنی اور قابل پس انداز ہیں آپ نے اس تشریح میں اپنا سارا زور اس بحث

پر صرف کر دیا ہے کہ عذرا اور بتول ہونا نکاح کو مانع نہیں جیسا کہ حضرت فاطمہؓ کے متعلق بھی وارد ہے کہ وہ عذرا اور بتول تھیں مگر اس کے باوجود انہوں نے نکاح کیا تھا۔

آپ کی یہ تشریح اس لحاظ سے بے کار ہے کہ یہ بات تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ تبتل نکاح کا مانع نہیں پھر اس کی اتنی طویل تشریح کی ضرورت ہی کیا تھی اور جس چیز کی ضرورت تھی اس کا آپ نے ذکر تک نہیں کیا۔

حدیث نمبر۴: اثری صاحب مکالمہ ۳ میں درمنثور میں ابوحرب سے درج ذیل روایت نقل کرتے ہیں:۔ اَلَیْسَ عیسیٰ من ذریۃ ابراھیم ولَیْسَ لَہٗ اَبٌ (ترجمہ: کیا عیسیٰؑ ابراہیمؑ کی ذریّت سے نہ تھے جب کہ ان کا باپ بھی نہ تھا) لیکن آپ اس کا مطلب یُوں بیان فرماتے ہیں کہ: "اُن کا مطلب یہ ہے کہ آپ باپ کی طرف سے ابراہیمؑ کی نسل سے نہیں ثابت ہو سکتے کہ آپ کا باپ کوئی غیر اسرائیلی ہے اور اللہ پاک نے ان کو (عیسیٰ کو) ان کی (ابراہیم کی) طرف منسوب فرمایا ہے لہٰذا وہ ماں کی طرف سے نسبت ہے جو کہ یقینی ہے۔" (ص ۵۴)

اَب دیکھئے اس "مطلب" میں آپ نے:۔

(۱) حضرت عیسیٰ کا باپ ثابت کر دیا ہے حالانکہ عربی الفاظ لَیْسَ لَہٗ اَبٌ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان کا باپ نہ تھا اور جو فی الواقع آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو درکار ہیں۔

(۲) اس مقام پر آپ باپ کو غیر اسرائیلی قرار دے رہے ہیں جبکہ دیگر بہت سے مقامات پر آپ اسے (یوسف کو) اسرائیلی قرار دیتے اور باپ کی طرف سے بھی نسب کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ص۵۸ پر فرماتے ہیں کہ "میرے علم میں وہ (حضرت عیسیٰؑ) ماں باپ دونوں کی طرف سے اور کہ دوسروں کے خیال میں وہ صرف ماں کی طرف سے اسرائیلی ہیں۔" (ص ۵۸)

(۳) باپ کی طرف سے غیر اسرائیلی ہونا ہی وہ سبب ہے کہ اللہ نے انہیں ماں کی طرف منسوب کر دیا۔ خدا کو اس کا علم تھا مگر چونکہ اللہ عیسیٰ کا نسب اسرائیل کے ذریعے آدم تک ملانا چاہتا تھا لہٰذا یوسف کو عیسیٰؑ کا باپ بتلانا مناسب نہ سمجھا۔

حدیث نمبر۵: اثری صاحب نے عیون زمزم کے ص۸۷ پر ایک سوال اُٹھایا پھر اس کا جواب بھی دیا ہے یہ پُورے کا پُورا سوال وجواب ہم یہاں درج کرتے ہیں تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آجائیں

"امام بیہقی نے اور حافظ ابن کثیر نے جب صاف طور پر تحریر فرما دیا ہے کہ عیسیٰؑ بے پدر پیدا ہوئے ہیں تو پھر کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے بلکہ امام سیوطی نے الکنز المدفون فی الفلک المشحون (ص ۶۰) میں فرمایا ہے:۔

فَاِنَّ عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام لَا اَبَ لَہٗ واعتقاد ھٰذا | بیشک عیسیٰؑ کا کوئی باپ نہ تھا اور یہ اعتقاد واجب ہے'

وَاجبٌ فاذا تكرر ذكره منسوبا الى الام استشعرت القلوب ما يجب عليها اعتقاده من نفي الاب وتنزيه الام الطاهرة عن مقالة اليهود لعنهم الله	جب عیسیٰ کا ذکر بار بار ماں کی طرف منسوب ہو کر آیا ہے تو خود بخود دلوں میں اس بات کا وجوب سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کا کوئی باپ نہ تھا اور اس سے یہود کے قول، اللہ ان پر لعنت کرے، سے عیسیٰ کی پاک سیرت ماں کی صفائی بھی ہو جاتی ہے۔

اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے:۔

"جس دلیل و ثبوت کی بنا پر بے پدر ماننا ضروری بتایا گیا ہے اس کی کمزوری میں مدلل دے کر بیان کر آیا ہوں" اور "غیر نبیوں کا بیان خواہ وہ کثرت سے ہوں کسی بات کو واجب نہیں ٹھہرا سکتے۔" قرآن وحدیث سے ثبوت کی ضرورت ہے۔" (ایضاً ص۸۸)

اب دیکھئے اس جواب میں آپ نے دو نکتے بیان فرمائے ہیں؛

(۱) دلیل کی کمزوری (۲) غیر نبی کی بات پر عدم اعتماد اور قرآن وحدیث سے ثبوت کی ضرورت۔

(۱)۔ جہاں تک دلیل کی کمزوری کا تعلق ہے وُہ یہ ہے کہ ابن مریم کنیت ہے نسب نہیں اور کنیت ماں کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ اسے حافظ صاحب کی عیاری کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے جبکہ روایت میں منسوبًا الی الأمّ کے لفظ موجود ہیں یعنی یہ کنیت نہیں بلکہ نسب ہے اور دُوسرے مقامات پر حافظ صاحب نے خود بھی ابن مریم کو نسب تسلیم کیا ہے (مثلاً مکالمہ ۳ اور ۱۲ ص ۵۲، ۵۳) جیسے کہ ہم اس موضوع پر پہلے بحث پیش کر چکے ہیں۔

(۲) "غیر نبیوں کا بیان خواہ وُہ کثرت سے ہوں۔ کسی بات کو واجب نہیں ٹھہرا سکتا۔ قرآن وحدیث سے ثبوت کی ضرورت ہے۔"

اَب دیکھئے قرآن کے راوی بھی غیر نبی ہیں اور حدیث کے راوی بھی غیر نبی ہیں۔ صحابہ بھی غیر نبی اور مفسرین بھی غیر نبی۔ خواہ وُہ ابن عباس جیسے جلیل القدر صحابی ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر اعتبار کس بات کا؟ پھر قرآن وحدیث کی جو درگت آپ بناتے ہیں ان کی بھی بہت سی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔ قرآن کی من مانی تاویل آپ کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ رہی حدیث تو اس سے انکار کے لیئے آپ کو اتنا بھی کافی ہے کہ اس حدیث کا رفع ثابت نہیں لہٰذا صحیح کیسے ہوئی یعنی تابعین کا قول تو درکنار آپ کسی صحابی کا قول بھی موقوف کہہ کر رد کر دیتے ہیں تو پھر کون سے قرآن وحدیث سے آپ کو ثبوت کی ضرورت ہے؟ ان سب باتوں کے باوجود آپ ماشاء اللہ اہل حدیث بھی پکے ہیں اور آپ کی اثریت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

صحابہ کرامؓ اور ولادت عیسیٰؑ

اب ہم چند جلیل القدر صحابہ کے ارشادات پیش کریں گے جو مسئلہ زیر بحث پر نص کا حکم رکھتے ہیں اور جن کو تسلیم کرنا اثری ہونے کا لازمی جزو ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ: ابن عباسؓ وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کے لیئے رسول اللہؐ نے فہم قرآن کی دعا فرمائی۔ یہی قرآن کے سب سے پہلے مفسر ہیں۔ ان کی تفسیر نہایت مختصر اور جامع ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور فرقہ میں مقبول ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اثری صاحب کو ان کی تفسیر نظر نہ آئی ہو مگر چونکہ اس تفسیر میں اثری صاحب کو اپنے نظریہ کے لیئے کوئی گنجائش نظر نہ آئی۔ لہٰذا اسے درخورِ اعتناء نہ سمجھتے ہوئے درج نہیں فرمایا۔ ابن عباسؓ "انّ مَثَلَ عیسٰی" کی تفسیر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

ان مثل عیسٰی مثل تخلق عیسٰی عند اللہ بلا اب کمثل ادم خلقہ من تراب بلا اب وام ثم قال لہ یعیسٰی کن فیکون ولدًا بلا اب الحق ھو خبرا لحق من ربک ان عیسٰی لم یکن اللہ ولا ولدہ ولا شریکہ فلا تکن من الممترین من الشاکین فیما بینت لک من تخلیق عیسٰی بلا اب۔ (درمنثور کا حاشیہ ج ۲ ص ۱۲۹ مطبوعہ دار المعرفت۔ بیروت)۔

بیشک مثال عیسٰی کی یعنی ان کی پیدائش کی مثال اللہ کے نزدیک بغیر باپ کے ایسی ہے جیسا کہ آدمؑ کی۔ آدمؑ کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا بغیر ماں باپ کے پھر اسے کہا کہ ہوجا وہ ہوگیا۔ ایسے ہی عیسٰی کو بھی کہا گیا کہ بغیر باپ کے ہوجا وہ ہوگیا۔ یہ خبر بالکل حق اور سچ ہے۔ عیسٰی نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے تھے اور نہ اس کے شریک تھے۔ یہیں آپ کو جو ان کی بغیر باپ کے تخلیق اور پیدائش کا بیان کیا گیا ہے۔ اس میں شک کرنے والوں میں نہ ہو جایئے۔

اب دیکھیئے اس تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عیسٰی کی پیدائش کے متعلق دو دفعہ بلا اب کہا ہے تو کیا یہ کچھ اثری صاحب کی تسلی کو کافی نہیں۔

حضرت عمرؓ: اثری صاحب ابوداؤد، مستدرک حاکم، سنن بیہقی، کنز العمال چار کتابوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو محض اس لیئے مارا کہ اس نے اپنی کنیت ابوعیسٰی رکھی تھی اور کہا کہ

ھَل لِعیسٰی من اب (ص ۱۱۶) کیا عیسٰی کا کوئی باپ تھا؟ (بقول اثری صاحب کیا تم عیسٰی کا باپ ٹھہرانا چاہتے ہو) اس پر مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ ابوعیسٰی کنیت تو حضورؐ نے خود میری رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنی اجتہادی

غلطی کو تسلیم کر لیا۔ اب اثری صاحب نے سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ ابوعیسیٰ کنیت رکھنا جائز ہے مگر اصل مسئلہ تو وہیں کا وہیں رہا۔ کہ کنیت میں تو ادنیٰ سی نسبت بھی لبا اوقات نہیں پائی جاتی۔ ثابت کرنے کی بات تو یہ تھی کہ کیا حضرت عمرؓ نے اپنی اصل دلیل کو "عیسیٰ کا باپ نہیں تھا" سے بھی رجوع کیا تھا یا نہیں؟ بلکہ اس روایت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس عقیدہ میں اس قدر سخت تھے کہ اس کی طرف کنیت کی نسبت بھی گوارا نہ فرمائی اور اپنے بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

دیگر صحابہ کرامؓ: طوالت سے بچنے کی خاطر اب ہم ان صحابہ کے صرف نام پیش کرتے ہیں جو عیسیٰ کی بے پدری پیدائش کے قائل تھے اور جن کا ذکر اثری صاحب نے خود ہی اپنی پیش کردہ روایات میں کر دیا ہے:۔

(۳) جعفر طیارؓ جنھوں نے مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر ہجرت حبشہ کے دوران نجاشی شاہ حبش سے گفتگو کی۔ (۴) ابوموسیٰؓ (۵) حضرت سلمان فارسیؓ (ص۵۱) (۶) موسیٰ بن عقبہؓ (ص۵۱) (۷) عروہ بن زبیرؓ (ع ص۵۱)۔ (۸) عبداللہ بن مسعودؓ (ع ص۱۴)۔ (۹) حضرت ابی بن کعبؓ (ع ص۲۲)

یہ ان پاکبازوں کا گروہ ہے جنھوں نے رسول اللہؐ سے تربیت حاصل کی اور انہیں سے قرآن سیکھا۔ اور اگرچہ قرآن میں یہ بات صریح طور پر مذکور نہیں تاہم انھوں نے یہی سمجھا کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

اور تابعین میں سے (امام) جعفر صادقؒ کا ذکر آپ نے ص۵۱ پر فرمایا ہے کہ ان سے ابوبصیر نے پوچھا کہ اللہ پاک نے سب کو ماں باپ سے پیدا فرمایا ہے تو عیسیٰ کو بے پدر کیوں پیدا کیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ "اللہ کو اپنی قدرت کا اظہار مقصود تھا۔" جس کا جواب اثری صاحب نے یوں دیا کہ "یہ موصوف (عیسیٰؑ) پر اتہام ہے۔ زوجین سے پیدائش میں اللہ پاک کی بہت بڑی شاندار قدرت کا اظہار ہے۔ بے پدر پیدائش میں عورت اور بچہ کے لیئے بڑی خفّت ہے۔" (ص ۵۱)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ جب زاویہ نگاہ بدل جائے تو قدریں کیسے بدل جاتی ہیں۔ انسان کی زوجین یا والدین کے ذریعے سے پیدائش ایسی عام بات ہو گئی ہے کہ قرآن کے بار بار اس طرف توجہ دلانے کے باوجود انسان نہ اپنی پیدائش میں غور کرتا اور نہ اسے عجوبہ سمجھتا ہے۔ اب اسی عام بات اور روزمرّہ کی عادت میں اثری صاحب کو خدا کی قدرت کاملہ نظر آنے لگی ہے اور عیسیٰ کی بے پدری پیدائش جسے صرف مسلمان ہی نہیں دنیا کی آبادی کا کثیر حصہ خدا کی قدرت کاملہ کا اظہار سمجھتا ہے۔ اس چیز میں اثری صاحب کو حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ دونوں کی خفّت نظر آنے لگی۔

علاوہ ازیں مندرجہ بالا حدیث و آثار میں مذکور صحابہ کے بعد دُوسرے منبر پہ راوی تابعین ہی ہیں جو سب عیسٰی کی بے پدر پیدائش کے قائل تھے اور انہیں صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال و ارشادات کو تسلیم کرنے سے ہی انسان اثری کہلا سکتا ہے حالانکہ یہ سب "غیر نبی" تھے۔

پھر انہی جعفر صادق کے بیٹے موسیٰ کاظم ہیں۔ جنہوں نے رشید عباسی کے سامنے ذریت رسول کہلانے کی وجہ ہی یہ پیش کی تھی کہ چونکہ عیسٰی کا باپ نہیں تھا۔ لہٰذا ان کی نسل ماں کے واسطہ سے ابراہیمؑ تک اللہ تعالیٰ نے ملا دی۔ اس واقعہ سے خلیفہ رشید پر حجّت یہ قائم کی کہ ماں کی طرف سے سلسلہ نسب جب قرآن کی رُو سے قائم ہو سکتا ہے تو آپ ہمیں کیسے روک سکتے ہیں۔ اور رشید نے اس حجّت[1] کو تسلیم کیا (ص ۵۵ مکالمہ ۶)۔

اب ہم ان بزرگ مفسّرین شارحین حدیث اور علماءِ کرام کا ذکر کریں گے جو علم اور دیانت میں مسلّم ہیں اور جن کا تذکرہ اثری صاحب نے کیا ہے کہ وہ عیسٰی کی بے پدری پیدائش کے قائل تھے۔ ان کے اقوال و ارشادات اگرچہ حجّت کا درجہ نہیں رکھتے تاہم رہبری کا کام ضرور دے سکتے ہیں۔

(ا): کتب احادیث اور ان کے شارحین :-

(۱)۔ امام بیہقی (سنن) (ص ۲۳-۸۸)۔ (۲) مستدرک حاکم (ص ۴۶)۔ (۳) عون المعبود (ابوداؤد کے شارح (ص ۴۹)۔ (۴) حافظ اشرف الحق شارح ترمذی (تحفۃ الاحوذی) (ص ۱۲)

(ب)۔ مفسّرین (۱) عبداللہ بن عباسؓ (ص ۵۱) (تفسیر ابن عباس)۔ (۲) جلال الدّین سیوطی صاحب درمنثور (بہت مقامات پر)۔ (۳) تفسیر ابن کثیر (ابن کثیر) (ص ۲۳-۸۸)۔ (۴) ترجمان القرآن (نواب صدیق حسن خاں (ص ۵۴)۔ (۵) سیّد رشید رضا صاحب۔ تفسیر (المنار) جو عیسٰی کا باپ تسلیم کرنیوالوں کو کافر کہتے ہیں (ص ۸۲)۔ (۶) مولانا مودودی صاحب تفہیم القرآن (ص ۵۵)۔ (۷) ابوالکلام آزاد صاحب ترجمان القرآن (۸) محمد حسین بٹالوی۔ یہ مفسّر نہیں (ص ۱۶۳)۔ (۹) علّامہ عنایت اللہ مشرقی (ص ۸۴)۔ (۱۰) صاحب لغت ناموس (ص ۴۸)

اب ہم چند ان مشہور ہستیوں کا ذکر کریں گے جنہیں مسلمانوں کی اکثریت گمراہ سمجھتی ہے۔ یہ لوگ بھی اس مسئلہ عقیدہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اور ان کا ذکر بھی اثری صاحب نے عیون زمزم میں کیا ہے۔

(۱) علی حائری شیعہ۔ ان کی تفسیر لوامع التنزیل ہے (ص ۵۱، ص ۱۵۳ کا حاشیہ)۔ (۲) مرزا غلام احمد قادیانی (ص ۲، ۲۴، ۱۵۷)۔ (۳)۔ عبداللہ چکڑالوی (ص ۱۶۹)

---

[1] یہ معاملہ کا ایک پہلو تھا اور اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ قرآن نے عیسٰی کا سلسلہ نسب ماں کے واسطے سے اس لیے ابراہیم سے ملایا ہے کہ عیسٰی کا باپ نہ تھا لیکن حسین کا باپ تو موجود تھا اگر رشید کو یہ پہلو بر وقت سوجھ جاتا تو شاید موسیٰ کاظم کا جواب نہ بنتے کیونکہ قرآن نے اصلاً یہی بتلایا ہے کہ نسب باپ سے چلتا ہے۔

اثری صاحب کا اعتراف حقیقت

عیسیٰ کی بے پدری پیدائش پر اجماع اُمت: آپ نے عیون زمزم کے آخر میں اپنی عربی تفسیر پیش فرمائی جس کا متعلقہ حصہ ہم ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں اس تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ عیسائیوں کے خیال کے مطابق عیسیٰ بے پدر پیدا ہوئے تھے اور عام طور پر مسلمانوں کا خیال بھی یہی ہے۔ شیعہ سُنّی دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ بے پدر پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ سُنیوں کی تمام جماعتوں میں یہ بات مسلّم ہے۔ عبداللہ چکڑالوی بھی اسے بے پدر مانتے تھے مگر خواجہ احمد دین اور مولوی اسلم جے راجپوری نے اور ان کے ہم خیالوں نے اس کا انکار کر دیا مرزا غلام احمد قادیانی اسے بے پدر مانتے تھے اور ان کے ارادتمندوں نورالدین اور محمد علی نے انکار کیا۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی نے اسے بے پدر بتایا ہے ان سب سے پہلے بہاء اللہ ایرانی نے انکار کیا ہے۔ پھر اس کے بعد سرسید مرحوم نے انکار کیا"

"ان میں بعض تو صاف طور پر حدیث کے منکر ہیں بعض نیم قائل ہیں۔ بعض پوری طرح سے قائل ہیں مگر حدیث اپنے اپنے یہاں کی مسلّم ہے دوسروں کی نہیں اور میں بفضلہ تعالیٰ اہل حدیث ہوں۔ حدیث نبوی کو شرعی حجت مانتا ہوں اور محدثین عظام اور ائمہ کرام کا احترام کرتا ہوں اور اُن کی خدمات کا اعتراف کرتا ہوں مگر ان کی بات حجت نہیں اور قرآن و حدیث کے خلاف قابلِ قبول نہیں۔ خلاف خواہ انفرادی ہے یا کہ جمہوری ہے۔ دونوں صورتوں میں مقبول نہیں۔" (ص۱۸۱)

آپ کے اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

عیسیٰ کی بے پدری پیدائش کے منکرین: (۱) حضرت عیسیٰ کی بے پدری پیدائش کا انکار سب سے پہلے بہاءاللہ ایرانی (فرقہ بہائی کے لیڈر۔ یہ فرقہ شیعہ مذہب کا ایک غالی فرقہ) ہے۔ دُوسرے نمبر پر سرسید مرحوم نے کیا (جس پر اس کی نیچریت کی بنا پر امت مسلمہ نے متفقہ طور کفر کا فتویٰ صادر کیا) تیسرے نمبر پر خواجہ احمد دین اور اسلم جے راج پوری نے کیا (یہ دونوں مشہور منکر حدیث ہیں) اسلم جیراج پوری کے انوار سے ہی آج ادارہ طلوع اسلام منور ہو رہا ہے)۔ چوتھے نمبر پر مولوی نورالدین اور محمد علی نے انکار کیا (یہ دونوں مرزائی ہیں)۔ یہ کل ۷ اشخاص ہیں اور متفقہ طور پر یہ اشخاص گمراہ فرقوں کے بانی یا لیڈر ہیں۔

حافظ صاحب یہاں پانچواں نمبر چھوڑ گئے وہ امام الدین گجراتی کا ہے۔ یہ بھی مشہور منکر حدیث ہے اس نے کتاب التنقیح فی ولادت المسیح لکھی جس میں عیسیٰ کو بے پدر ثابت کرنے کی کوشش کی مگر اسے اپنی تحریر پر

اطمینان نہ تھا۔ لہٰذا اس نے آرزو کی کہ کاش کوئی مجتہد زمان پیدا ہو اور اس مسئلہ کو دلائل سے ثابت کرے۔ اثری صاحب نے امام الدین گجراتی کی اس طلب پر لبیک کہا۔ مجتہد زمان بننے کی آرزو انہیں اس میدان خارزار میں لے آئی اور آپ نے کتاب ہذا عیون زمزم تصنیف کر ڈالی۔ (دیکھئے ع ص ۱۶۲ زیر عنوان طلب واجاب) یہ کل آٹھ اشخاص ہو گئے ان میں ایک بھی ایسا نہیں جسے مسلمانوں کی اکثریت گمراہ یا کافر نہ سمجھتی ہو۔

(۲)۔ مثل مشہور ہے کہ "چوہدری صاحب بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر پرنالہ وہیں رہے گا"۔ یہی معاملہ اثری صاحب کا ہے۔ آپ محدثین عظام، مفسرین، ائمہ کرام کا احترام بھی کرتے ہیں اور ان کی خدمات کے بھی معترف ہیں مگر اپنا پرنالہ وہیں رکھتے ہیں جہاں پر چاہتے ہیں۔ اس بیان میں آپ نے صحابہ کرام اور تابعین عظام کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ وہ بھی اس معاملہ میں برابر کے شریک ہیں کیونکہ یہ قابل احترام ہستیاں بھی عیسیٰ کی بے پدری پیدائش کی قائل تھیں اور اس پہلو سے بھی وہ شریک ہیں کہ اثری صاحب بات ان کی بھی نہیں مانتے۔

(۳)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کا نام غیر شعوری طور پر آپ کے زبان وقلم سے نکل جاتا ہے کیونکہ قرآن وحدیث جو ہمارے پاس موجود ہے وہ تو انہیں صحابہ کرام اور تابعین کی وساطت سے ہمیں ملا ہے۔ اور جو کچھ صحابہؓ نے قرآن سے سمجھا وہی ذہن آگے اُمت کو منتقل کیا اب اگر صحابہ کرام کے ارشادات کو ہی "غیر نبیوں کا بیان ناقابل حجت ہے" کہہ کر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر آخر منکرین حدیث کا اور زیادہ کیا قصور ہے؟ البتہ یہ فرق ضرور رہ جاتا ہے کہ منکرین حدیث صحابہ کے اقوال وارشادات کو ناقابل اعتماد قرار دے کر صرف قرآن سے کھیلتے ہیں اور اثری صاحب اقوال صحابہ کو ناقابل اعتماد قرار دے کر قرآن وحدیث دونوں سے کھیلتے ہیں۔

اثری صاحب کی تضاد بیانی: مندرجہ بالا بیان تو اعتراف کا تھا۔ اب انکار کی بات سنیئے: عیون زمزم کے ص ۸۳ پر فرماتے ہیں:۔

"عیسیٰ کا باپ تو یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں ہر سہ نے تسلیم کیا ہے۔ موصوف کے باپ کا تو کوئی بھی منکر نہیں جیسے کہ ہمارے دوستوں کا خیال ہے کہ یہودیوں نے ان کا ناجائز باپ ٹھہرایا ہے اور عیسائیوں نے ان کا باپ اللہ پاک ٹھہرایا ہے اور قاضی بیضاوی نے رُوح القدس کو ان کا باپ ٹھہرایا ہے...... یہ سب کچھ ہوا مگر جائز نکاح نہیں ہونے دیا کہ یہ کفر ہے۔ کیا خوب ہے۔" (ص ۸۳)

اس بیان میں چونکہ ہر سہ فریق حضرت عیسیٰ کے باپ کا ذکر کرتے ہیں۔ خواہ کوئی ناجائز باپ سمجھے یا اللہ کو بمنزلہ باپ سمجھے، یا باپ کے بجائے رُوح کا نفخہ باپ کا قائمقام قرار دے۔ سب کے اعتقاد میں چونکہ باپ کا لفظ تو آ جاتا ہے لہٰذا ثابت ہُوا کہ ہر سہ فریق عیسیٰ کا باپ مانتے ہیں اور بے پدری پیدائش کے قائل نہیں۔ یہ ہے اثری صاحب کا کسی بات کو ثابت کرنے کا طریقہ۔ پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ میں خود دُوسرے مقام پر کیا بیان دے چکا ہوں

اجماع اور اس کی حقیقت

کتاب عیونِ زمزم کے آخر میں اثری صاحب نے درج بالا عنوان کے تحت بہت سے ائمہ کرام کے اقوال نقل کیے ہیں جن کا ملخص یہ ہے :۔

(۱) کسی امر پر اجماع ہونا ناممکنات سے ہے (۲) اگر اجماع ہو بھی جائے تو بھی یہ قابلِ حجت نہیں (۳) فروعی مسائل میں اختلاف کرنے میں کوئی حرج نہیں (۴) بعض ائمہ کے شاگردوں نے بھی اپنے اُستادوں سے اختلاف کیا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس سے یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ اگر میں نے اس مسئلہ ولادتِ عیسیٰؑ میں تمام امت کے مسلّمہ عقیدہ کے علی الرغم اختلاف کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ فروعی مسئلہ ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔

ان سب باتوں کے جواب میں ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ :۔

(۱) اثری صاحب نے جن بے شمار آئمہ کرام کے حوالے دیئے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو عیسیٰؑ کی بے پدری پیدائش کا منکر ہو۔ یا اس نے اس مسئلہ میں تھوڑا بہت ہی اختلاف کیا ہو؟ اگر اختلاف نہیں تو یہ مسئلہ فروعی کیسے ہوا؟

(۲) انہیں آئمہ کرامؒ نے "مسئلہ ولادت عیسیٰؑ" کے متعلق نصوص شرعیہ (قرآن و حدیث) کے مطابق اقرار کیا کہ عیسیٰ بے پدر پیدا ہوئے اور اسی قرآن و حدیث کا نام لے کر آپ فرماتے ہیں کہ نصوص شرعیہ سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ کس کے فہم کا قصور سمجھا جائے ؟

(۳) اس مسئلہ میں اختلاف کرنے والے جن چھ اشخاص کے نام اثری صاحب نے گنوائے ہیں۔ وہ تمام اُمتِ مسلمہ کے نزدیک گمراہ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں تو کیا آپ بھی امام الدین گجراتی سمیت اسی گروپ میں شامل ہونا چاہتے ہیں ؟

(۴) اگر اجماع کی وہی حقیقت ہے جو آپ بیان فرما رہے ہیں۔ تو پھر آپ کو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہی وہ اجماع کی قوت ہے جس سے مجبور ہو کر کسی نے "مجتہد زمان" کے پیدا ہونے کی آرزو کی تھی اور کسی نے اس پر لبیک کہا۔

ایک متفق علیہ اور مرفوع حدیث کے ساتھ اثری صاحب کی دیانت کا ایک نادر نمونہ

تکلّم فی المھد سے متعلق تحریف کی بدترین مثال !!

بُخاری اور مُسلم دونوں میں (متفق علیہ) ایک مرفوع حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا :۔

"مہد میں تین آدمیوں کے علاوہ کسی نے بات نہیں کی۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام دُوسرے جریج راہب اور تیسرے بنی اسرائیل سے ایک بچہ، جس کی ماں نے ایک سنہری پوشاک والے مرد کو دیکھ کر کہا تھا کہ الٰہی میرا بچہ ایسا کر دیجیو تو بچہ جو دودھ پی رہا تھا۔ فوراً چھاتی کو چھوڑ کر بول اُٹھا۔ الٰہی مجھے ایسا نہ کرنا .... الحدیث"۔

اس حدیث میں رسُولِ اکرمؐ نے عیسیٰ بن مریم کے گود میں کلام کرنے کی تفصیل نہیں بتلائی کہ وہ قرآن کریم میں کافی مقامات پہ آچکی ہے البتہ راہب جریج کی اور تیسرے اسرائیلی بچہ کے کلام کی پُوری تفصیل بتلادی ہے اب اس حدیث کو اثری صاحب نے دو مقامات پر (ص ۲۰ اور ۱۲۹) پر چھیڑا ہے۔ بحث تکلم فی المہد کی چل رہی ہے لیکن آپ اس حدیث میں عیسیٰ بن مریم کا نام لینا گوارا نہیں کرتے اور نہ ہی تیسرے کا ذکر گوارا کیا ہے۔ دونوں مقامات پر صرف راہب جریج کا ذکر کیا ہے تاکہ تکلم فی المہد جیسے خرق عادت امر کو تائید مزید حاصل نہ ہو پھر اس راہب جریج کے قصہ سے بھی جس طرح اصل بحث سے گریز فرمایا ہے وہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ ص ۲۰ پر فرماتے ہیں :۔

"صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ جریج اسرائیلی نے اپنے گرجا کے پاس کسی چرواہے کو کسی جوان غیر شادی شدہ لڑکی سے زنا کرتے ہوئے دیکھ لیا اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ پھر جب اسے حمل ٹھہر گیا تو عزیزوں کے دریافت کرنے پر اس نے جریج کا نام بتایا۔ بس پھر کیا تھا۔ اسے مارا پیٹا اور اس کا گرجا گرا یا۔ جس پر اُس نے وضو کیا اور نماز ادا کی اور اللہ پاک سے دُعا کی کہ وُہ اس کا دامن پاک فرمائے تو اسے خواب میں ایک صفائی کا نقشہ بتایا گیا اس کی تفصیل یُوں ہے کہ جب بچہ پیدا ہُوا تو اس نے چرواہے کو بُلاکر بچہ سے پُوچھا تو اس نے (بزبان حال شکل و صورت سے جو اس کے مشابہ تھی) بول کر بتایا کہ یہ میرا باپ ہے۔ تب انہوں نے اس کا پیچھا چھوڑا مگر کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ اسے قدرت خدا کے بھروسہ پر عیسیٰؑ کی طرح بے پدر ٹھہرایا جائے"۔ (ع ص ۲۰)

اب ہم صحیح مسلم (کتاب البرّ والصلۃ باب تقدیم برّ الوالدین .....) سے متعلقہ حدیث پُوری نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین پر یہ واضح ہوجائے کہ آپ حدیث کو نقل کرنے میں کس قدر دیانتداری سے کام لیتے ہیں :۔

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے	عن ابی ھریرۃ عن النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم

قال: لم يتكلم في المهد الا ثلاثة: عيسىٰ
ابن مريم عليه السلام وصاحب جريج وكان
جريج رجلاً عابداً فاتخذ صومعة فكان
فيها فاتته امه وهو يصلي فقالت يا جريج فقال يارب امي
وصلاتي فاقبل على صلاته فانصرفت۔
فلما كان من الغد اتته ......
وهو يصلي فقالت يا جريج: فقال يا ربّ
امي وصلاتي فاقبل على صلاته. فقالت
اللهم لا تمته حتى ينظر الى المومسات
فتذاكر بنو اسرائيل جريجاً وعبادته و
كانت امراة بغي يتمثل بحسنها فقالت:
إن شئتم لأفتننه لكم قالت فتعرضت
له فلم يلتفت اليها فاتت راعياً كان
يأوي الى صومعته فامكنته من نفسها
فوقع عليها فحملت. فلما ولدت قالت
هو من جريج. فاتوه فاستنزلوه و
هدموا صومعته وجعلوا يضربونه فقال
ما شانكم؟ قالوا: زنيت بهذا البغي
فولدت منك. فقال: اين الصبي؟ فجاءوا
به. فقال: دعوني حتى اصلي فلما انصرف
اتى الصبي فطعن في بطنه قال: يا غلام
من ابوك؟ قال: فلان الراعي. قال فاقبلوا
على جريج يقبلونه وقالوا: نبني لك صومعتك
من ذهب. قال لا اعيدوها من طين
كما كانت ففعلوا...   (الحديث)

(مسلم، کتاب البر والصلۃ باب تقدیم بر الوالدین ....)

فرمایا: تین بچوں کے سوا کسی نے مہد میں کلام نہیں کیا عیسیٰ بن مریم اور
صاحب جریج، اور جریج ایک عابد آدمی تھا جس نے ایک عبادت خانہ
بنایا اس میں وہ رہتا تھا۔ ایک دن اسکی ماں آئی تو وہ نماز پڑھ رہا تھا
ماں نے کہا اے جریج اس نے (دل میں) کہا اے رب ایک طرف
میری ماں ہے اور ایک طرف نماز آخر وہ نماز پڑھتا رہا۔
حتیٰ کہ اس کی ماں واپس چلی گئی۔
دوسرے دن پھر اس کی ماں آئی تو وہ نماز پڑھ رہا تھا
اب اس کی ماں نے پکارا اے جریج۔ جریج (دل میں)
کہنے لگا یا اللہ ایک طرف میری ماں ہے اور ایک طرف
میری نماز ہے۔ آخر وہ اپنی نماز میں ہی لگا رہا۔ ماں نے
اب اس کے حق میں بددعا کی: یا اللہ اس کو مت مار یو
جب تک کہ وہ کسبی چھنال (بدکار) عورت کا منہ نہ دیکھے
پھر بنی اسرائیل نے جریج اور اس کی عبادت کا چرچا
شروع کیا۔ ان میں ایک بدکار عورت تھی جس کی مثال
یعنی خوبصورتی میں زبان زد تھی۔ وہ کہنے لگی اگر تم چاہتے
ہو تو میں اسے پھنساؤں۔ پھر اس عورت نے اپنے آپ
کو جریج پر پیش کیا لیکن وہ متوجہ نہ ہوا۔ اب وہ
ایک چرواہے کے پاس آئی جو اس کے گرجا کے پاس
ٹھہرا کرتا تھا اور اسے اپنے سے صحبت کرنے کی اجازت
دی چنانچہ چرواہے نے اس سے صحبت کی جس سے وہ
حاملہ ہوگئی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو کہنے لگی کہ یہ جریج کا
ہے اب لوگوں نے جریج کو گرجا سے اترنے کا مطالبہ
کرکے اتار لیا۔ اس کا عبادت خانہ ڈھا دیا اور اسے پیٹنے
لگے۔ جریج نے پوچھا "کوئی بات تو بتلاؤ؟" کہنے لگے،
"تو نے اس فاحشہ سے زنا کیا اور اب تو اس کے بچہ بھی پیدا
ہو چکا۔" جریج نے کہا: "بچہ کہاں ہے؟" لوگ وہ بچہ لے آئے

تو جریج نے کہا "ذرا ٹھہرو، میں نماز پڑھ لوں۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو کر آیا تو
بچے کے پاس آ کر اس کے پیٹ میں کچوکا دیا اور کہا: "اے لڑکے! تیرا باپ کون ہے؟
بچہ بول اٹھا کہ "فلاں چرواہا ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ اب تو لوگ جریج کی طرف دوڑے
اور اسے چومنے چاٹنے لگے اور کہنے لگے: "ہم تیری عبادت گاہ سونے کی بنا دیتے ہیں"
جریج نے کہا: "نہیں بلکہ مٹی کی ویسی ہی بنا دو جیسے پہلے تھی۔ چنانچہ انہوں نے
بنا دی........ الحدیث۔

اب دیکھئے کہ (۱) رسول اللہؐ تو یہ بتلاتے ہیں کہ جریج کی بدنامی کا اصل سبب ماں کی بددعا تھی کہ اس نے ماں کی پکار کی پرواہ تک نہ کی اور عبادت میں لگا رہا۔ اور اس کا ظاہری سبب یہ بنا کہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ جریج کے مستجاب الدعوات ہونے سے حسد کرنے لگے۔ ایک فاحشہ حسین عورت جریج کو بدنام کرنے کی سازش میں شریک ہوئی۔ جب جریج نے اس فاحشہ کو دھتکار دیا تو اس نے ایک چرواہے سے صحبت کروا کر بچہ کو جریج کے نام سے منسوب کر دیا لیکن حافظ صاحب کا یہ بیان ہے کہ "جریج نے کسی چرواہے کو کسی جوان غیر شادی شدہ لڑکی سے زنا کرتے دیکھا لیا اور کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔" (ص ۲۰)

غور فرمائیے حدیث میں یہ الفاظ کہ وہ عورت (۱) فاحشہ تھی جس کا حسن ضرب المثل تھا (۲) اس نے جریج کو بدنام کرنے کا ذمہ اٹھایا (۳) اس نے خود کو جریج پر پیش کیا اور جب جریج نے دھتکار دیا تو اس نے اپنے آپ کو چرواہے کے سپرد کیا۔ لیکن حافظ صاحب قبلہ اسے ایک اتفاقی امر قرار دے رہے ہیں۔

(۲) پھر حدیث سے یہ بھی واضح ہے کہ جریج کو اس وقت تک کسی بات کا علم نہ تھا جب تک لوگوں نے اسے مارنا پیٹنا شروع نہیں کیا کیونکہ جریج ان سے مارنے کی وجہ پوچھتے ہیں لیکن حافظ صاحب کہتے ہیں کہ اس زنا کے واقعہ کو جریج نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مگر دل میں چھپائے رکھا اور کسی کو بتلایا نہیں آخر تحریف اور جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے پھر رسول اللہ پر، جس کی سزا جہنم ہے۔

(۳) رسول اللہؐ تو یہ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں نے مارنے کی وجہ بتلائی تو جریج نے ان سے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو کر واپس آیا تو لڑکے کو طلب کر کے اس کو پیٹ پر کچوکا دیا اور پوچھا بتا تیرا باپ کون ہے؟ لیکن اثری صاحب فرماتے ہیں کہ: جریج نے نماز ادا کی اور اللہ پاک سے دعا کی کہ اس کا دامن پاک فرمائے تو اسے خواب میں ایک صفائی کا نقشہ پیش کیا گیا" اب سوال یہ ہے کہ جریج کو اس وقت سونے کا موقعہ کب ملا تھا جس میں وہ خواب دیکھتا۔ جبکہ مشتعل ہجوم پاس کھڑا تھا؟

(۴) رسول اللہؐ تو فرماتے ہیں کہ جب جریج نے بچہ سے پوچھا کہ بتا تیرا باپ کون ہے؟ تو وہ بول اٹھا

"فلاں چرواہا ہے" لیکن اثری صاحب فرماتے ہیں کہ جریج نے چرواہے کو بلا کر بچہ سے دریافت کیا۔ تو اس بچہ نے (بزبانِ حال، شکل وصورت سے جو اس کے مشابہ تھی) بول کر بتایا کہ یہ میرا باپ ہے"۔ (ص ۲۰)

اس ایک سطر کے اقتباس میں اثری صاحب نے تین باتیں خلاف حدیث ارشاد فرمائی ہیں۔(۱) جریج کا چرواہے کو بلانا (۲) بچے کا زبان سے نہیں بلکہ زبانِ حال سے ظاہر کرنا اور خود خاموش رہنا (۳) "یہ میرا باپ ہے" جبکہ بچہ نے کہا تھا کہ "فلاں چرواہا"۔ "یہ میرا باپ ہے" آخر کون سے الفاظ حدیث کا ترجمہ ہے؟

اب جا کر یہ راز کھلتا ہے کہ حافظ صاحب نے رسول اللہ کے بیان کے خلاف کیوں اپنا بیان تراشا ہے اور کیوں چرواہے کو بلا کر پاس لا کھڑا کیا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ صرف عیسیٰؑ کے تکلم فی المھد کے ہی منکر نہیں۔ بلکہ اس واقعہ کو بھی جو تکلّم فی المھد کی تائید کرتا ہے۔ عیسیٰؑ کے واقعہ کی طرح بگاڑ کر اپنی تائید میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ بچہ زبانِ حال سے چرواہے کو اپنا باپ ثابت کر رہا ہے۔ اسی طرح عیسیٰؑ بھی مہد میں بزبانِ حال ہی بولے تھے۔ اتنی تحریف ہی آپ نے غالباً کافی سمجھ لی ہے کہ اگلے بچے کے واقعہ کی تحریف کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

(۵) پھر آگے چل کر اپنا تبصرہ نقل فرماتے ہیں کہ جب بچّہ نے بزبانِ حال بول کر بتلایا کہ یہ میرا باپ ہے تب انہوں نے پیچھا چھوڑا۔ "مگر یہ کسی کو بھی خیال نہیں آیا کہ اسے قدرتِ خدا کے بھروسہ پر عیسیٰؑ کی طرح بے پدر ٹھہرایا جائے"۔ (ص ۲۰)

اصل مبحث سے فرار: غور فرمایا آپ نے کہ قبلہ حافظ صاحب نے اصل مبحث سے فرار کے کس طرح پینترا بدلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

جریج کے واقعہ میں ـــــ اور ـــــ عیسیٰؑ کے واقعہ میں

جریج کے واقعہ میں	عیسیٰؑ کے واقعہ میں
(۱) جننے والی عورت موردِ الزام نہیں وہ پہلے ہی ایک بدنام زمانہ فاحشہ عورت ہے۔	(۱) جننے والی عورت پارسا اس کے والدین بھی پارسا اور یہی عورت موردِ الزام ہے۔ کیونکہ اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔
(۲) جننے والی عورت پکار پکار کر بچہ کو ایک غیر متعلق شخص سے منسوب کر رہی ہے۔	(۲) جننے والی عورت بالکل خاموش ہے اور اپنی صفائی اس لیے پیش نہیں کرتی کہ اپنے حق میں اس کی صفائی چنداں معتبر نہ ہوگی
(۳) جھگڑا یہ نہیں کہ بچّہ بغیر باپ پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں	(۳) جھگڑا ہی یہ ہے کہ بچّہ بغیر باپ پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں

(۴) جریج جیسے پارسا آدمی کی صفائی مطلوب ہے فاحشہ کی نہیں جس نے بچہ جنا۔

(۵) بچہ نے گود میں کلام کرکے جریج کی صفائی بھی پیش کر دی اور اصل والد کا پتہ بھی بتا دیا۔

(۴) بچہ جننے والی عورت کی صفائی مطلوب ہے۔ یہاں کوئی متعلق شخص ہے ہی نہیں۔

(۵) بچہ نے گود میں کلام کرکے ماں کی صفائی پیش کر دی کہ جس طرح میرا گود میں کلام کرنا خرقِ عادت ہے اسی طرح میری پیدائش بھی خرقِ عادت ہے اور کسی دوسرے کا نام نہیں لیا۔

اب دیکھئے ان دونوں واقعات میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن حافظ صاحب جریج کو عیسیٰؑ کے واقعہ پر قیاس کرکے فرما رہے ہیں کہ "کسی کو خیال تک نہ آیا کہ صاحب جریج کو قدرتِ خدا کے سپرد کرکے عیسیٰؑ کی طرح بے پدر ٹھہرایا جائے"

اسی واقعہ کو ص ۱۲۸ پر حافظ صاحب بدیں الفاظ نقل کرتے ہیں :۔

"صحیح بخاری و صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں جریج راہب کا واقعہ جو کہ رسول اللہؐ نے بیان فرمایا ہے۔ اس (عام اصول کہ بچہ گود میں نہیں بولتا) کے خلاف ہے کہ عام خیال کے مطابق دودھ پیتا بچہ گود میں بولا اور ماں اس کی پھر بھی مجرم ہی ثابت ہوئی۔ اس لیئے صفائی کی ضرورت ہے۔ جو یہاں نہیں اور صرف بچہ کا بولنا صفائی کا قائم مقام نہیں۔ (ایضاً ص ۱۲۸)

اس اقتباس میں اثری صاحب نے اصل مبحث سے ہٹ کر دوسرا پینترا بدلا ہے پہلے صف۲ پر درج کرکے یہ نتیجہ پیش کیا کہ کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ صاحب جریج کو بے پدر سمجھا جائے۔ اب دوسرا پینترا یہ بدلا ہے کہ اس بچہ کے بولنے کا کیا فائدہ کہ ماں تو پھر بھی مجرم ہی رہی۔ اب یہ حافظ صاحب کو کون سمجھائے کہ وہ بچہ (۱) اس لیئے نہیں بولا تھا کہ اس فاحشہ اور رسوائے زمانہ عورت کی بریت کرے بلکہ اس لیئے بولا تھا کہ جریج عابد کی بریت ہو (۲) اس کے بولنے کے یہ مقصد نہ تھا کہ وہ بتلائے کہ میرا باپ کوئی نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اصلی باپ کا نام بتلا دے اور بچے کے بولنے سے یہ دونوں مقصد حل ہو گئے۔

اب اثری صاحب کے بیان کو پھر سامنے لائیے کہ :

(۱)۔ ایک فاحشہ عورت نے ایک چرواہے سے زنا کیا۔ جریج نے اسے دیکھ لیا مگر اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا۔

(۲)۔ جب بچہ پیدا ہو گیا تو لوگوں نے (دوران حمل نہیں بلکہ بچہ پیدا ہونے پر) اس فاحشہ عورت سے اس کے باپ کا پتہ پوچھا تو اس نے جریج کا نام لے لیا۔ جریج کا شاید یہ جرم تھا کہ اس نے انہیں زنا کرتے

دیکھ لیا تھا لہٰذا اُس فاحشہ عورت نے جریج ہی کا نام لیا۔

(۳) لوگوں نے جریج کو مارا پیٹا تو اُس نے وضو کیا۔ نماز ادا کی اور دُعا کی کہ اللہ اس کا دامن پاک فرمائے تو اسے خواب میں ایک صفائی کا نقشہ پیش کیا گیا۔

(۴) جریج نے خواب کے مطابق چرواہے کو (جس کا اسے پہلے ہی علم تھا) بلایا۔

(۵) جب چرواہا سامنے آگیا تو بچّہ کی شکل وصورت چونکہ اس سے ملتی جُلتی تھی۔ لہٰذا انہیں سمجھ آگئی کہ یہ بچّہ جریج کا نہیں بلکہ اس چرواہے کا ہے۔ تب انہوں نے جریج کا تو پیچھا چھوڑ دیا مگر یہ پھر کسی کو خیال نہ آیا کہ ہو سکتا ہے "بچّہ بے پدر پیدا ہُوا ہو؟"

اب دیکھئے کہ اثری صاحب کے اس شاہکار میں:۔

(۱)۔ جریج کو وضو کرنے، نماز ادا کرنے اور دُعا مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ اسے پہلے ہی اصل باپ کا علم تھا۔ وُہ مار کھانے سے پیشتر ہی اس کو بلوا سکتا تھا۔

(۲)۔ بچّہ کے بزبانِ حال بولنے سے جریج کی صفائی تو ہو سکتی تھی۔ ماں کی کیسے ہو سکتی تھی؟ وہ زنا کا اقرار تو خود کر رہی تھی۔

(۳)۔ جب بچّہ زبان سے بولا ہی نہیں تو اثری صاحب اس کے بولنے سے صفائی کیسے مانگتے ہیں؟

(۴)۔ اثری صاحب نے اس حدیث کے مضمون کو عام ضابطۂ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی جو کوشش فرمائی ہے تو سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ذخیرہ حدیث میں اس طویل حدیث کے اندراج کا فائدہ کیا تھا؟ بالخصوص اس صورت میں کہ یہ حدیث صحاح کی تقریباً سب کتب میں موجود ہے؟

حضرت مریمؑ کے فضائل قرآن اور حدیث کی روشنی میں

(۱) **طہارۃ اور برگزیدگی:** ارشاد باری ہے:۔

يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۳/۴۲)

اے مریم! بیشک اللہ نے تمہیں برگزیدہ کیا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہان کی عورتوں میں سے منتخب کیا ہے

اب حضرت مریم کی اس بزرگی، انتخاب اور پاکیزگی کے فضائل اثری صاحب کی زبانی سنیئے، فرماتے ہیں:۔

"موصوفہ کی بابت ارشاد الٰہی طہرک بھی وارد ہوا ہے اور عبداللہ بن عباس سے مرفوعاً مروی ہے کہ مَنْ اَرَادَ اَنْ يَلْقَى اللّٰهَ طَاهِرًا مُطَهَّرًا فَلْيَتَزَوَّجْ۔ طاہر مطہر وہ ہے جو شادی کرے اور موصوفہ کی بابت اصطفاک بھی وارد ہوا ہے کہ صاف ستھری ہے اور ہر اس اونٹنی پر جو بچہ کو دودھ پلا رہی ہے اور ہر اس کھجور پر جو پھل سے لدی ہوئی ہے اور ہر اس مرغی پر جو انڈے دے چکی ہے یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے کہ اساس البلاغۃ اور قاموس اور مفردات میں ہے اور مریم نے بھی اپنے بچہ کو دودھ پلایا ہے جو کہ مبارک پھل ہے۔" (ص ۸۰)

سو یہ ہیں وہ گرانمایہ فضائل جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو تمام جہان کی عورتوں سے برگزیدہ کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ شادی تو تقریباً سب ہی عورتیں کرتی ہیں۔ ان کے ہاں اولاد بھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو دودھ بھی پلاتی ہیں۔ آخر حضرت مریمؑ میں کونسی زائد خوبی تھی جس کی بنا پر اللہ نے اُسے تمام جہان کی عورتوں سے ممتاز قرار دیا۔

مثل مشہور ہے کہ "ساون کے اندھے کو ہر یاول ہی ہریاول نظر آتا ہے"۔ اسی طرح بات کچھ ہو، الفاظ کچھ ہوں اثری صاحب اس سے حضرت مریم کی شادی، اس کا شوہر، عیسٰی کا باپ تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ اگرچہ طہارۃ کا ایک ذریعہ شادی کرنا بھی ہے مگر کتب احادیث میں کتاب الطہارۃ ملاحظہ فرمائیے۔ بدن کی طہارت اور کپڑوں کی طہارت سے متعلقہ مسائل درج ہوں گے لیکن اس کتاب میں شادی کا کہیں ذکر نہ ملے گا۔ وہ کتاب النکاح میں ہی ملے گا۔ اب رہا قلبی صفائی اور نظر کی پاکیزگی کا معاملہ تو اس میں بھی دوسرے اور بہت سے ذرائع میں سے ایک ذریعہ نکاح بھی ہے۔ اب دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۝ (۳۳/۳۳)

(اے پیغمبر کے) اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

تو کیا یہاں تطہیر کا معنی شادی کرنا ہوگا جبکہ وہ پہلے ہی نبی کی بیویاں ہیں؟

اسی طرح اصطفیٰ کا معنی تحقیق کرنے میں آپ بڑی دُور کی کوڑی لائے ہیں اور صفو اور اصطفیٰ کے معنیٰ کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر آپ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ پر ہی غور فرما لیتے تو معلوم ہو جاتا کہ اصطفیٰ کے معنیٰ پھل دار ہونا اور بچہ کو دُودھ پلانا نہیں ہوتا اور نہ ہی آپ کو اساس البلاغۃ اور قاموس جیسی لغتیں کھنگالنے کی ضرورت پڑتی۔

(۲) **جنّت میں رسُول اللہؐ سے نکاح:** سُورۂ تحریم کی آیت ۵ میں اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ سے فرماتے ہیں کہ "اگر تم اپنی بیویوں کو طلاق دے دو تو جلد ہی رسول اللہ کا پروردگار اسے ان سے بہتر بیویاں بدل دے گا۔ جو مومن ہوں گی، فرمانبردار ہوں گی، توبہ کرنے والی عبادت گذار اور روزہ رکھنے والی ہوں گی۔ ان میں ثیب (شوہر دیدہ) بھی ہوں گی اور بکر (ناشوہر دیدہ۔ کنواری) بھی"۔ (۶۶/۵)

چُونکہ بیویوں کو آپؐ نے طلاق نہیں دی۔ لہٰذا دنیا میں اس تبدیلی کا امکان نہ رہا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو مطلع فرمایا کہ اس وعدہ کے مطابق جنّت میں دو بیویاں عطا کرے گا۔ ان میں ثیب تو آسیہ زوجہ فرعون ہے اور بکر مریم بنت عمران۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس مقام پر چار احادیث پیش کی ہیں:

(۱) بحوالہ معجم طبرانی ابن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے نبی سے جو وعدہ فرمایا ہے اس سے بیوہ تو آسیہ زوجہ فرعون ہے اور کنواری سے مراد مریم بنت عمران۔

(۲) بحوالہ ابن عساکر۔ اس میں بھی انہی دو عورتوں کا ذکر ہے۔

(۳) بلا حوالہ۔ روایت ہے...... اس میں تین عورتوں مریم بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون اور کلثوم اخت مُوسیٰ کا ذکر کر کے حافظ ابن کثیرؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

(۴) بحوالہ ابو یعلی ابو امامہ سے مروی ہے۔ اس میں بھی مذکورہ تین عورتوں کا ذکر ہے۔ اس حدیث کے متعلق ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ ضعیف بھی ہے اور مرسل بھی۔ گویا پہلی دو احادیث جن میں مریم اور آسیہ کا ذکر ہے وہ تو قابلِ اعتماد ہیں اور درایت کے لحاظ سے بھی یہی بات عقل کو اپیل کرتی ہے کہ ان دونوں عورتوں کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمائی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ عزت بخشی کہ ان کا نکاح رسول اللہؐ سے ہو گا۔ حضرت مریم کا اس لیے کہ دنیا میں ان کا کوئی شوہر نہ تھا جبکہ مومن عورتیں جنّت میں اپنے مومن مردوں کے نکاح میں ہوں گی۔ حضرت مریم کا شوہر نہیں اس لیے رسول اللہ کے نکاح میں ہوں گی اور آسیہ کا شوہر فرعون کافر ہے جو دوزخ میں ہو گا یہ بھی اکیلی جنّت میں رہ گئیں تو ان کو رسول اللہ کے نکاح میں دینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔

رہی کلثوم اُختِ موسیٰ تو اُس کے رسول اللہ کے نکاح میں آنے کی کوئی تُک نہیں۔ اس کا خاوند کافر تھا یا مسلمان؟ یا اس دُنیا میں کلثوم نے وقتاً فوقتاً کتنے شوہروں سے نکاح کیا۔ کچھ معلوم نہیں۔ پھر مریم اور آسیہ کے تو اللہ تعالیٰ نے فضائل بیان کر دیئے لیکن کلثوم اختِ مُوسیٰ کی فضیلت تو درکنار ویسے بھی مجہول الحال ہے۔ اس کو یہ عزت کیوں کر عطا ہو سکتی تھی۔

اَب اثری صاحب کی سنیئے۔ انہوں نے اس روایت کو جس میں صرف مریم اور آسیہ کا ذکر ہے۔ جرح وانتقاد کی نذر کر دیا اور جس دیانتداری سے وہ جرح کرتے ہیں اس کا جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ پھر روایت میں ایسی کج بحثی اختیار فرمائی ہے کہ اللہ کے کلام اور اللہ کے نہم پر بھی بحث کرنے سے نہیں چوکتے بہرحال اس روایت کو درج کر کے اسے رد کر دیا ہے جس میں صرف مریم اور آسیہ کا ذکر ہے۔

اَب وہ روایت جس میں تین عورتوں یعنی مریم اور آسیہ کے ساتھ کلثوم کا بھی ذکر ہے۔ اسے "اصل روایت" کے عنوان کے تحت زیرِ بحث لائے ہیں۔ گو اس بحث کے آخر میں آپ نے خود بھی اس روایت کو حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے ضعیف تسلیم کیا ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے اس "اصل روایت" کو اپنی بحث کا محور اس لیئے بنایا ہے کہ اس میں آپ کو اپنے نظریہ کے داخل کرنے کی کچھ کچھ گنجائش نظر آ رہی تھی۔ طبرانی کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ:

إِنَّ اللهَ زَوَّجَنِي فِي الْجَنَّةِ مريم بنت عمران وامرأة فرعون واخت موسیٰ (ص ۱۰۲)	(اثری ترجمہ) اللہ پاک جنت میں میری شادی مریم اور آسیہ اور کلثوم سے کرا دیگا۔ یہ ہر سہ شادی شدہ ہیں کوئی بھی غیر شادی شدہ نہیں۔

یہ فقرہ "یہ ہر سہ شادی شدہ ہیں کوئی بھی غیر شادی نہیں" جو آپ کی طرف سے اضافہ ہے "چور کی داڑھی میں تنکا" کی واضح مثال ہے جسے آپ ایک سانس میں کہنے کو بے قرار تھے۔ ورنہ اسے ترجمہ کے طور پر درج کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

پھر اسی "چور کی داڑھی میں تنکا" کے مصداق ایک سوال اُٹھاتے ہیں کہ "فرعون کی بیوی سے تو شادی اسلیئے ہو گی کہ وہ دوزخ میں ہوگا اور مریم کا شوہر تو مسلمان ہے اور جنت میں ہوگا تو وہ اپنے شوہر کے پاس ہوگی مگر روایت میں ہے کہ وُہ رسُول اللہ کے پاس ہو گی جس سے ظاہر ہے کہ اس کا کوئی شوہر نہیں"۔

اَب سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تو کیا کلثوم کا بھی کوئی شوہر نہیں کہ وہ آپ کے نکاح میں ہو گی؟[1] اصل بات یہ ہے کہ عورت کی رضا

[1] بس یہ جواب پیش کرنے کے لیئے اثری صاحب نے تین عورتوں والی ضعیف روایت کو ضعیف تسلیم کرنے کے باوجود اصل روایت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

بھی ضروری ہے۔ اگر کسی عورت کے کئی ایک شوہر یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے اور سب مسلمان ہوں تو پھر اُمّ سلمہ کی روایت کے مطابق عورت جسے پسند کرے گی اس کے پاس رہے گی۔ یہ ہر سہ (یعنی مریم آسیہ اور کلثوم رسول اللہ کو پسند کریں گی تو آپ سے شادی ہو گی۔" (ص۔ ۱۰۲)

اس اقتباس میں درج ذیل امور قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) کلثوم کے نکاح والی روایت کو جب آپ بھی ضعیف تسلیم کرتے ہیں تو اس ضعیف روایت کو بنیاد قرار دینے کی کیا تُک ہے۔ قارئین کو غالباً اب یہ معلوم ہو چکا ہو گا کہ اثری صاحب نے یہ روایت ضعیف سمجھنے کے باوجود اسے کیوں اصل روایت قرار دیا۔

(۲) کلثوم کا خاوند اگر مسلمان ہو اور جنت میں ہو تو وُہ رسول اللہ کے نکاح میں آ کیسے سکتی ہے؟

(۳) اب عورت کی رضا اور پسند کا پہلو لیجئے۔ حضرت مریم کا شوہر ہے اور مسلمان ہے اور زندگی بھر ایک ہی شوہر رہا ہے۔ اور وُہ جنّت میں ہے۔

تو حضرت مریم کا حقِ انتخاب کیا ہُوا؟ اور وہ رسول اللہ کے نکاح میں کیونکر آ سکتی ہیں؟ یہ حقِ انتخاب والی دلیل تو دراصل اثری صاحب کے نظریۂ نکاح مریم کا پُورا پُورا ردّ ہے۔ پھر بھی نہ سمجھیں تو انہیں کون راہِ ہدایت پر لا سکتا ہے؟

۳۔ عذرا اور بتول: عذرا اور بتول کی بحث اثری صاحب نے عون زمزم کے ۷، ۲۱، ۴۸ اور ۹۴ صفحہ پر متفرق طور پر بیان کی ہے۔

صٓ پر مسند ابوداؤد طیالسی کے حوالہ اور عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نجاشی کے دربار میں ہم نے اپنا خیال یُوں ظاہر کیا:۔

نقول کما قال اللہ عز وجل ھو رُوح اللہ و کلمتہٗ القاھا الی العذراء والبتول لم یمسسھا بشرٌ ولم یفترضھا وَلدٌ	ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ نے فرمایا کہ وہ اللہ کی طرف سے رُوح اور اس کا کلمہ تھا جسے اللہ نے مریم کی طرف ڈالا جو عذرا اور بتول بھی۔ نہ اُسے کسی بشر نے چھوُا تھا نہ اُس نے کوئی بچہ جنا تھا۔

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ مریم ہمیشہ کنواری رہی اور مس بشر سے دوچار نہیں ہوئی۔" (ص ۷)

اس حدیث کا ترجمہ پیش کرتے وقت آپ رُوح اللہ وکلمتہٗ القاھا کا ترجمہ چھوڑ گئے۔ چلئے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ پھر صٓ پر ابن الاثیر کے حوالہ سے لم یفترضھا وَلدٌ کی تشریح لکھتے ہیں "یعنی مسیح کی ولادت سے پہلے کوئی بچہ نہ ہُوا تھا۔" (ص ۸)

اب اس سوال کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"رسول اللہ کے نکاح میں کنواری بھی تھی اور بیوہ بھی۔ تو کیا کنواری کنواری ہی رہی تھی؟ پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ میں اسے کنواری کے عوض کنواری اور بیوہ کے عوض بیوہ دوں گا تو کیا یہ ادل بدل ہو کر آنے جانے والی دونوں کا بکر قائم ہے"؟ (ص ۷)

گویا یہ کلام اللہ پر اعتراض ہوا۔ شادی سے قبل جو بیوی کنواری تھی اسے اللہ پاک نے کنواری کہہ دیا تو اس پر اب اثری صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ کیا اب بھی وہ کنواری ہی رہی؟

پھر ص۳۱ پر باکرہ اور عذرا کا یہ فلسفہ بیان فرمایا کہ:۔

"بکارت اور عذرا ایک پردہ ہے جو پہلے حیض سے ٹوٹتا ہے۔ پھر جماع سے اور اس کے بعد پھر بچہ کی پیدائش پر ٹوٹتا ہے"۔ (ص ۳۱)

ان باتوں سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب مریم کے بچہ پیدا ہوگیا تو پھر اس سے پہلے لازماً مس بشر بھی ہوا اور اس سے پہلے حیض بھی آیا ہوگا تو وہ باکرہ اور عذرا کیسے رہی؟ اور اس ضابطہ الٰہی سے آپ حضرت مریم کا نکاح اور مس بشر ثابت کر رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد آپ ایک متفق علیہ حدیث بروایت ابوسعید خدری نقل فرماتے ہیں کہ

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشد حیاءً من العذراء فی خدرھا۔	(یعنی رسول اللہ اس کنواری سے بھی بڑھ کر باحیا تھے جو اپنے پردے میں ہو)

آپ حدیث سے صرف خِدر (پردہ) کا لفظ بحث کے لیئے انتخاب کرتے ہیں کہ "وہ بالغ ہے اور عورت کی بلوغت حیض سے ہوتی ہے جس سے عذر ٹوٹتا ہے پھر اس کے بعد دخول سے ٹوٹتا ہے پھر اس کے بعد وضع سے ٹوٹتا ہے"۔ (ص ۳۱)

اثری صاحب کا یہ فلسفہ تو شاید ٹھیک ہو مگر سوال یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ کو ان مراحل سے کیا نسبت؟ جو اس حدیث کے ضمن میں یہ فلسفہ بیان کرنے کی آپ کو ضرورت پیش آگئی۔ یہ عذرا کی بحث ختم ہوئی۔ رہی یہ بات کہ حدیث میں عذرا کا لفظ جو بمعنی کنواری استعمال ہوا تو اس کا کیا فائدہ؟ تو آپ نے بکارت کے ٹوٹنے کا ایک عام اصول بیان کر کے حضرت مریم کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھا اور بچہ کی پیدائش سے پہلے مرحلہ مس بشر اور اس سے پہلے مرحلہ حیض کا ذکر کر کے بالواسطہ یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ آپ کنواری نہیں تھیں۔

اب رہا لفظ بتول کا معاملہ تو یہ چنداں مشکل نہیں کیونکہ یہ لفظ حضرت فاطمہ کے لیئے بھی استعمال ہوئے ہیں اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ دنیا کے جھمیلوں سے الگ ہو کر خدا کی طرف متوجہ ہوتی رہیں حالانکہ انہوں نے شادی بھی کی تھی۔

پھر ص۴۸ پر لکھتے ہیں کہ "اہلِ لغت نے جیسے کہ قاموس وغیرہ میں ہے اس لفظ پر مریم اور فاطمہ دونوں کا ذکر فرمایا ہے اور تفریق بھی کر دی ہے مگر وُہ تفریق رائج خیال کی بنا پر ہے قرآن وحدیث اور لغت کی بنا پر نہیں۔" (۴۸)

اب سوال یہ ہے کہ اہلِ لغت کو یہ تفریق کرنے کا کیا فائدہ تھا۔ اور یہ رائج خیال کیسے رائج ہو گیا؟ بات واضح ہے کہ بتول کا لفظ دونوں کا لقب ہے مگر فاطمہؓ صرف بتول ہیں جبکہ مریم عذرا بھی ہیں پھر حضرت مریم پر اللہ کی طرف سے رُوح اور کلمہ بھی ڈالا گیا تھا اور فاطمہؓ پر کچھ نہیں ڈالا گیا۔ پھر اگر اس تفریق کی اثری صاحب اپنے آپ کو سمجھ نہ آنے دیں تو اس میں اہلِ لغت یا دُوسرے لوگوں کا کیا قصور ہے؟ رہی قرآن وحدیث کی بات تو اس سے صاحب قاموس بیچارے اور اسطرح امت کے دوسرے افراد قرآن وحدیث کے فہم سے کورے ہی رہے۔ یہ سمجھ اگر آئی ہے تو صرف اثری صاحب کو آئی ہے۔

۴۔ **استعاذہ والدہ مریم:** جب حضرت مریم پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ حنہ بنت فاقوذ نے یہ دُعا کی تھی۔

وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (۳۶/۳)	میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اسکی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

حضرت مریم کی اس دُعا کی قبولیت کی کیا صورت تھی اس کی تفصیل درج ذیل متفق علیہ اور مرفوع حدیث میں ملاحظہ فرمایئے:۔

مامن مولود یُولَدُ اِلّا الشیطان یَمَسُّہٗ حین یُولَدُ فَیَسْتَھِلُّ صارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّیطانِ ایاہُ اِلّا مریم وابنَھا ثم قال ابوھریرۃ واقرءوا ان شئتم وانی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطٰن الرجیم ۰ (بخاری۔ کتاب التفسیر)	جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے اس کے پیدا ہوتے وقت شیطان اسے چھُوتا ہے اور وُہ شیطان کے چھُونے سے چلا کر رونے لگتا ہے۔ البتہ مریم اور اس کے بیٹے عیسیٰ کو شیطان نے نہیں چھُوا۔ حضرت ابُوہریرہ یہ روایت بیان کرکے ذیل کے طور پر لوگوں سے کہتے تم چاہو تو یہ آیت پڑھو، وانی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطٰن الرجیم۔ (ب ص۳۴۱)

یہ حدیث دراصل حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی ایک فضیلت بیان کرتی ہے جو کسی دُوسرے کے حصہ میں نہیں آئی۔ اور وُہ یہ ہے کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت جو چیختا چلاتا ہے تو اس کی وجہ مس شیطانی ہوتا ہے۔ اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ اس وقت بھی اس مس شیطانی سے محفوظ رہے ہیں۔

اُب دیکھئے اثری صاحب اس آیت اور حدیث سے ان دونوں ہستیوں کی فضیلت ثابت کرنے کے بجائے اپنا کونسا مطلب سیدھا کرتے اور ان کے کیا کیا مختلف مطالب بیان فرماتے ہیں:۔

(۱) تکلم فی المھد کی بحث میں فرمایا کہ عیسیٰ تو بموجب حدیث مرفوع پیدا ہو کر روئے بھی نہیں جس طرح

دوسرے بچے روتے ہیں تو انہوں نے بات کیا کی ہوگی؟ دیکھا آپ نے اثری صاحب نے بمصداق اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی "کیسے اپنے مطلب کی بات ڈھونڈ نکالی ہے۔

(۲) پاکبازوں کی عصمت بیان کرنے کی خاطر بیان المختار کے پہلے ایڈیشن[1] میں فرمایا کہ:

"اس کے مشہور مطلب پر چونکہ کوئی پاکباز محفوظ نہیں۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ "کوئی عورت جس نے بے شوہر بچہ جنا ہے وُہ مس شیطان (زانی) سے محفوظ نہیں اور اس کا یہ بچہ چونکہ اس کی مس سے پیدا ہوا ہے اس لیئے وُہ حلال زادہ نہیں۔ ہاں عیسیٰ علیہ السلام اور اس کی والدہ ماجدہ اس کلیہ سے باہر ہے"۔ (ع ص۹۷)

آپ نے عیون زمزم شائع کرنے سے پہلے اس مطلب ۲ سے رجوع کر لیا۔ اس دوران جو اس عقیدہ میں ارتقاء ہوا اس کا اظہار یا تیسرا مطلب آپ نے عیون زمزم میں یُوں بیان فرمایا کہ:۔

"حدیث نبویؐ کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ، یہودیوں نے منذور اور منذورہ کی بابت شریعت اسلام کا مفہوم غلط سمجھ کر جو انہیں شادی سے روکا ہوا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ خفیہ طور پر زنا پھیلا اور اولاد بھی ہوئی ہوگی جو شاید ضائع کر دی جاتی ہوگی یا کہ کسی طرح پرورش بھی پا جاتی ہوگی۔ اس زمانہ میں شائد ہی کوئی ایسا ہوگا جو اس بدکاری سے بچا ہوگا مگر "ماں مریم" کو اللہ پاک نے توفیق عطا فرمائی تو اس نے منذورہ ہونے کے باوجود ان کی جاہلانہ رسومات کو توڑتے ہوئے عملی طور پر نکاح کر لیا۔ پھر اللہ پاک نے اسے (مریم کو) اس مبارک نکاح سے ایک ایسا بچہ بھی عطا فرمایا جس نے ایسی شیطانی رسوم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ یہودیوں کو خائب وخاسر ہو کر نادم ہونا پڑا"۔ (ع ص۹۸)

اس حدیث کا اتنا لمبا چوڑا مطلب جو اثری صاحب نے بیان فرمایا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ اس حدیث کا مطلب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ:۔

(۱) شیطانی رسوم کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے انسانی تاریخ میں اگر صرف یہی دو افراد (یعنی مریم اور عیسیٰ) ہی ہوتے تو پھر تو یہ تشریح اس حدیث کا مصداق بن سکتی تھی مگر مشکل یہ ہے کہ شیطانی رسوم کا ڈٹ کر مقابلہ کرنیوالے اور بھی لاکھوں انسان انبیاء وصالحین موجود ہیں تو پھر اس حدیث کا یہ مطلب کیونکر ہو سکتا ہے۔

(۲) حدیث کے مطابق مس شیطان سے مراد بچہ کا پیدا ہوتے ہی چیخنا چلّانا ہے مگر اثری صاحب مس شیطان سے مُراد بدکاری یا زنا سے کم کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار بندے اس بدکاری سے محفوظ رہے ہیں لہٰذا اثری تعبیر ہر لحاظ سے غلط ہے۔

[1] یاد رکھیے کہ موجودہ دوسرے ایڈیشن میں یہ مطلب غائب کر دیا گیا ہے۔

حضرت مریم کے فضائل اثری صاحب کی نظر میں:

اب دیکھئے تطہیر اور اصطفیٰ کے لحاظ سے بھی اثری صاحب حضرت مریم کو ایک عام عورت کی سطح پر لے آئے ہیں جو شوہر دار ہو اور بچہ کو دُودھ پلا رہی ہو۔ دُنیا میں ایسی ہی عورتوں کی اکثریت ہے پھر حضرت مریم کی فضیلت کیا ہوئی؟ مگر اثری صاحب کو تو ان کے نکاح سے غرض ہے۔ فضیلت رہے نہ رہے وُہ ان کی بلا سے۔

حضرت مریم کی دُوسری فضیلت حدیث سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ جنت میں رسول اللہ ان سے نکاح کریں گے کیونکہ دنیا میں ان کا کوئی شوہر نہیں تھا۔ آپ نے اُختِ موسیٰ کو ساتھ شامل کرکے اور ضعیف حدیث کا سہارا لے کر حضرت مریم کی اس فضیلت کو بھی ختم کر دیا۔ جب اختِ موسیٰ جیسی مجہول الحال عورت بھی رسول اللہ کے نکاح میں آ سکتی ہے تو حضرت مریم اور آسیہ کی کیا فضیلت رہ گئی۔ اثری صاحب صرف حضرت مریم کا شوہر ثابت کرنے کی خاطر بیچ میں آ کر حضرت مریم کے ساتھ حضرت آسیہ کو بھی افضلیت کے مقام سے اُتار کر اُختِ موسیٰ کے مقام پر لے آئے ہیں۔ اختِ موسیٰ اس لیئے شامل کی گئی کہ ایک تو اس کا شوہر دار ہونا یقینی ہے۔ اور دُوسرے شوہر کا مسلمان ہونا یقینی ہے۔

حضرت مریم کی تیسری فضیلت عذرا اور بتول ہونے کی تھی۔ جس کو حافظ صاحب نے بکر کا فلسفہ پیش کرکے اس فضیلت کو بھی مجروح کر دیا ہے۔

حضرت مریم کی چوتھی فضیلت مس شیطانی سے محفوظ رہنے کی تھی۔ اس مس شیطانی کا اثری مفہوم بدکاری لیا جائے یا مس شیطانی سے بچنے کا مفہوم جاہلانہ رسوم کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا لیا جائے حضرت مریم کی خصوصی فضیلت ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اثری صاحب نے حضرت مریم کی ایک ایک فضیلت پر پانی پھیر دیا۔ دراصل انہیں حضرت مریم کے کسی سے افضل ہونے سے کچھ سروکار بھی نہیں۔ انہیں تو بس ایک ہی بات سے سروکار ہے اور وُہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح حضرت مریم کا شوہر ضرور ثابت ہونا چاہیئے۔

باب ۸

حضرت مریم کے نکاح یا شوہر اور حضرت عیسیٰ کے باپ ہونے کے اثری دلائل

ہم یہاں ان دلائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اثری صاحب نے حضرت عیسیٰ کا باپ ثابت کرنے، یا حضرت مریم کا نکاح اور شوہر ثابت کرنے کے لیئے دیئے ہیں۔ یہ دلائل بھی کئی قسم کے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) بے کار دلائل

بیکار دلائل سے ہماری مراد ایسے دلائل ہیں جو مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جنہیں مسلمان تو درکنار کافر، مشرک اور دہریے بھی تسلیم کرتے ہیں کیونکہ یہ دلائل ضابطۂ الٰہی یا قانونِ فطرت سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن واحادیث میں بھی مذکور ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسے دلائل کسی خرقِ عادت امر میں کوئی فیصلہ کن حیثیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً یہ کہ

(۱) "ہر جاندار کی پیدائش کے لیئے اس کے ماں باپ دونوں کا ہونا ضروری ہے۔" اب اس قانونِ فطرت یا ضابطۂ الٰہی سے بھلا کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ اس سے یہ نتیجہ پیش کریں کہ چونکہ ہر جاندار کے لیئے اس کے ماں باپ کا ہونا ضروری ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ کا باپ ضرور تھا تو معجزات کے قائلین کے نزدیک یہ ثبوت بیکار اور یہ دلیل باطل ہے لیکن افسوس ہے آپ نے ایسے بیکار دلائل کے خواہ مخواہ انبار لگا دیئے ہیں یا مثلاً

(۲) یہ کہ عیسیٰ اپنے آپ کو ولد تسلیم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آدم کی ذریت شمار کیا ہے تو ولد اور ذریت کے لیئے زوجین یعنی ماں باپ کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ قرآن واحادیث سے ثابت ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ عیسیٰ کی جیسے والدہ تھی والد بھی ضرور تھا۔ (ع ص ۹)

(۳) احادیث سے ثابت ہے کہ مرد کے نطفے سے ہڈیاں اور پٹھے بنتے ہیں اور ماں کے نطفہ سے گوشت پوست اور خون، اور چونکہ عیسیٰ کے بدن میں ہڈیاں اور پٹھے بھی موجود تھے لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ کا باپ ضرور تھا۔ (ع۔ ۲۸)

(۴) حضرت مریم کا اپنا بیان ہے (فرشتہ کے سامنے) کہ ولد کیلئے مس بشر کا ہونا ضروری ہے۔ پھر ولد ہو بھی گیا۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ آپ کا شوہر تھا۔

(۵) احادیث میں حضرت مریم اور حضرت فاطمہ دونوں کو عذرا اور بتول یا بکر کہا گیا ہے پھر چونکہ حضرت فاطمہ کا شوہر تھا (حضرت علیؓ)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مریم کا بھی شوہر تھا۔ (ص۴۷، ص۸۹)

(۶) کسی کنواری کو حمل ہو جانا ہی اس بات کی قوی دلیل ہے کہ اسے مس بشر ہوا ہے۔ خواہ یہ جائز ہو یا ناجائز اور حضرت مریم کے تو صرف حمل ہی نہیں بچہ بھی پیدا ہُوا۔ اور فاروقی فتوے کے مطابق کسی کو حضرت مریم کے متعلق حد لگانے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مریم کا جائز شوہر تھا (ع ۲۰۰۱۶)

(۷) احادیث سے ثابت ہے کہ دودھ مرد کے نطفہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے حضرت مریم کا دودھ پیا تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا والد ضرور تھا۔ (ع ۳۶)

(۸) اگر ماں باپ میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا پتہ نہ ہو تو بھی اس کے والدین ضرور ہوتے ہیں۔ لہٰذا عیسیٰؑ کا باپ یا مریم کا شوہر بھی ضرور ہے۔ اور وُہ یوسف نجار تھا۔ (ع ۔۲۲)

(۹) اگر عورت بچہ اُٹھائے ہُوئے لاتی ہے تو بھی اس کے باپ کا ہونا ضروری ہوتا ہے (ع ۷۶) چنانچہ آپ نے اس ضابطہ کے مطابق کئی فیصلے بھی سرانجام دیئے ہیں مثلاً ص۵۷ پر عیسوی فیصلہ کے عنوان کے تحت متی باب ۱۱ سے عیسیٰ کا ایک قول نقل کرتے ہیں :-

"مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا ظاہر نہیں ہوُا۔"

پھر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یحییٰ صرف ماں سے پیدا ہوئے باپ کوئی نہیں"۔ اس کے بعد ایک "محمدی فیصلہ" پیش فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا "مَیں ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو گوشت کی سُوکھی قاشیں کھایا کرتی تھی"۔ پھر اس سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ "تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں بے پدر پیدا ہوا ہوں"۔ گویا جس طرح ساون کے اندھے کو ہریاول ہی ہریاول نظر آتا ہے۔ اسی طرح اثری صاحب کو معمولی معمولی باتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کا باپ یا اس کے لیئے کوئی دلیل نظر آنے لگتی ہے۔

(ب) "صاف ظاہر ہے" قسم کے دلائل

یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ اثری صاحب پر ایک ایسا وقت بھی آیا۔ جبکہ آپ کو ہر معاملہ پر غور کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ کا باپ یا حضرت مریم کا شوہر یا نکاح کا ثبوت نظر آنے لگا تھا۔ ایسے دلائل میں پیشتر کا تذکرہ اس کتاب میں گزر چکا ہے۔ لہٰذا ہم ایسے دلائل کو حتی الامکان اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ بالفاظ دیگر گزشتہ تصریحات کا خلاصہ ایک نئے انداز میں حاضر خدمت ہے :۔

(۱) مس بشر کے لفظ سے نکاح کا ثبوت: آپ لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں عیون زمزم کے صفحہ ۱۰۱ پر کہ قرآن میں آیا ہے۔

"اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ۔ (احزاب)	جب نکاح کے بعد میل ملاپ سے پہلے طلاق کی صورت پیدا ہو جائے تو دریں حالات کوئی عدت نہیں۔

نیز فرمایا : وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً (بقرہ) مساس سے سے پیشتر اگر طلاق کی ضرورت پڑی ہے تو جو مہر مقرر ہوا ہے اس کا نصف ادا کر دو"۔ ان دونوں آیات میں تمسوھن کے لفظ پر ع۱ اور ع۲ کے نشان دے کر حاشیہ میں یوں وضاحت فرمائی ہے۔

ان دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ع۱ نکاح اور ع۲ مساس ہے پھر جب کبھی بھی ع۲ کا ذکر ہوگا تو ع۱ اس سے پیشتر ہو چکا ہوگا۔ چونکہ مریمؑ ع۲ کا ذکر کرتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ع۱ سے فارغ ہے"۔ (یعنی اس کا نکاح ثابت ہوگیا)۔

اب دیکھئے ان دونوں آیات سے دو شرعی احکام نکلتے ہیں ایک یہ کہ طلاق نکاح سے پہلے نہیں ہو سکتی دوسرے یہ کہ طلاق مساس سے قبل بھی ہو سکتی ہے اور بعد بھی۔ ان باتوں کا بھلا حضرت مریم سے کیا تعلق؟ نہ ان کا نکاح نصوص شرعیہ سے ثابت ہے۔ نہ مساس ہوا اور نہ طلاق پھر بھلا اس معاملہ میں ان آیات کو پیش کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

پھر قانون فطرت کے مطابق بھی مساس سے قبل نکاح کی کوئی شرط نہیں۔ مساس تو تمام حیوان بھی کرتے ہیں اور ان کے اولاد بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انہیں نکاح کی ضرورت ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ کے نافرمانوں کو نکاح کی کیا بندش ہے۔ نتیجہ واضح ہے کہ مساس کے لیئے پہلے نکاح کی شرط صرف اللہ کے فرمانبرداروں کیلئے ہے عام قانون قدرت یا ضابطہ الٰہی یہ نہیں۔

پھر جس بھونڈے طریقے سے آپ نے عفیفہ مریم پر "عدم مساس کی شکایت" کا الزام لگایا ہے۔ اس کی وضاحت

ہم پہلے پیش کر چکے ہیں تاہم آپ نے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ "عدم مساس کی جائز شکایت سے صاف ظاہر ہے کہ نکاح ہو چکا ہُوا ہے۔" (ص ۱۱۱)

(۲) لفظ حمل سے نکاح کا ثبوت : عیون زمزم کے ۱۱۳ پر آپ حمل سے حضرت مریم کا نکاح ثابت کر رہے ہیں لکھتے ہیں :۔

"اور یہاں (یعنی حضرت مریم کے معاملہ میں یہودیوں کو) بے نکاح حمل کا علم ہے مگر اعتراض تک نہیں ہاں بچہ دیکھتے ہی فوراً اعتراض شروع ہو جاتا ہے۔ گویا ان کا خیال تھا کہ اس کے حمل سے جب بچہ پیدا ہوگا۔ تب زنا ثابت ہوگا۔ کیا خوب ہے ...... ان دونوں صورتوں میں (یعنی یہ حمل خواہ سات ماہ رہا یا نو ماہ) کے نتیجہ سے صاف ظاہر ہے کہ حمل نکاح سے ہُوا ہے اور صحیح ہے کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ گھریلو زندگی شروع کر کے عہد نذر کو توڑا گیا ہے۔"

اس اقتباس میں آپ یہ فرما رہے ہیں کہ سات ماہ یا نو ماہ حضرت مریم حاملہ رہیں اور لوگوں کے سامنے رہیں مگر کسی نے کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حمل نکاح سے تھا ورنہ یہود ضرور شور مچاتے۔ اَب دیکھیئے اثری صاحب نے اِس اقتباس میں دو طرح سے دھوکا دیا ہے :۔

ا۔ قرآن کے الفاظ ہیں، "فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹/۲۲) یعنی جب وُہ حاملہ ہوگئیں تو کسی دُور مقام پر جا کر گوشہ نشین ہوگئیں۔"

اب اثری صاحب نے حضرت مریم کو گوشہ نشین ہونے کے بجائے سُسرال بھیج دیا اور کہا کہ وہیں سُسرال میں انہیں اپنے شوہر سے وقت پر حمل ہوا پھر اپنی اس قائم کی ہوئی غلط بنیاد پر یہ اعتراض بھی کر دیا کہ "حمل کا علم ہے مگر اعتراض نہیں"۔ اس سے تو اُلٹا اثری صاحب پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب وہ حمل کے وقت اپنے سُسرال میں لوگوں کے درمیان تھیں تو اس وقت کسی نے کیوں اعتراض نہ کیا اور یہی بات اثری صاحب کی اس تاویل کو کہ "وہ سُسرال چلی گئیں اور وقت پر حاملہ ہوئیں پھر وضع حمل کے وقت شوہر کو دُور کا سفر اختیار کرنا پڑا اور وُہ انہیں ساتھ لے گیا"۔ غلط ثابت کرتی ہے قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مریم کے حمل کا دَور کسی نے دیکھا ہی نہیں اور اثری صاحب اسی حمل کو نکاح کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں کہ لوگوں نے دیکھا مگر کوئی اعتراض نہ کیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ صحیح نکاح ہوا تھا۔

اب جب اثری صاحب نے دیکھا کہ اس نکاح پر بھی اعتراض ہو سکتا تھا کیونکہ یہ نکاح

یہود کے رسم و رواج یا شریعت کے خلاف تھا تو اس کا جواب آپ نے یُوں بیان فرمایا کہ :۔

"اگر مخالفت کرنیوالوں میں اس کا کوئی متولی ہوتا تو ضرور شور ہوتا بلکہ نکاح روک دیا جاتا۔ اصلی متولی نے جب نکاح کر دیا تو وہ بے بس تھے پھر جب نکاح مبارک ثابت ہوا (یعنی عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی) تو انہیں چیخ و پکار کی ضرورت پڑی"۔ (ص ۱۲۶)

اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اثری صاحب کی عقل میں بھی فتور ہے اور یہود کی عقل میں بھی یہود کی عقل میں اس لیئے کہ نکاح کے وقت بھی وہی متولی تھا اور وضع کے وقت بھی وہی متولی تھا اور پاس کھڑا تھا کیونکہ اس کی طرف حضرت مریم نے جواب دہی کے لیئے اشارہ بھی کیا تھا (فاشارت الیہ کی اثری تفسیر) اور یہود ایسے بدھو تھے کہ نکاح کے وقت تو خاموش بیٹھے رہے اور ولادت کے وقت آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ حالانکہ بقول اثری صاحب انہیں اصل اعتراض تو نکاح پر تھا۔ ولادت پہ تو نہ تھا۔ اور اثری صاحب کی عقل میں اس لیئے کہ وُہ اپنی تمام تر باتوں کی بنیاد تو نکاح بنا رہے ہیں لیکن اس نکاح کا کوئی نقلی ثبوت پیش نہیں کرتے۔

اب دیکھئے قرآن نے اثری صاحب کے یا یہود کے اس "الزام نکاح" کے علی الرغم بہتانا عظیما کے الفاظ بیان فرمائے۔ پھر یہی الفاظ واقعہ افک کے متعلق سُورۂ نور میں بیان فرمائے جس سے واضح ہو جاتا ہے بہتانا عظیما کے الفاظ قرآن نے "زنا کے الزام" کے لیئے استعمال فرمائے ہیں کسی دُوسری طرح کے الزام کیلئے نہیں۔ علاوہ ازیں درمنثور ج ۴ ص ۲۷۰ (سطر ۲۷-۲۸) مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت کی درج ذیل روایت بھی پکار پکار کر اسی بات کی تائید کر رہی ہے :

اخرج عبد بن حمید عن عمرو بن میمون قال ان مریم لما ولدت اتت بہ قومھا فاخذوا لھا الحجارۃ لیرموھا فاشارت الیہ فتکلم فترکوہ۔	عبد بن حمید نے عمرو بن میمون سے روایت کیا۔ اس نے کہا مریم نے جب (عیسیٰ کو) جنا تو اسے لے کر اپنی قوم کے پاس آئی تو انہوں نے مریم کو مارنے کے لیئے پتھر پکڑ لیئے تو مریم نے عیسیٰ کی طرف اشارہ کیا تو وہ بول پڑے تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔

اب دیکھیئے کہ پتھر مارنے کی سزا موسوی شریعت میں زانی کے لیئے مقرر تھی اور مندورہ کا ترک نکاح کوئی شرعی حکم تو تھا نہیں۔ یہ تو ان کا رواج تھا۔ اس کی یہ سزا کیسے ہو سکتی تھی۔ ایسے واضح دلائل کے باوجود بھی

لہ اثری صاحب اس نکاح کو کبھی تو یہود کے رسم و رواج کے خلاف قرار دیتے ہیں کیونکہ انہیں رہبانیت کا کوئی حکم نہیں ملا تھا۔ لیکن جب شیئاً فریا پر بحث کی باری آتی ہے تو اسی نکاح کو شریعت قرار دے لیتے ہیں جو چاہیں کریں۔ کون روک سکتا ہے ؟

اگر اثری صاحب "الزام نکاح" اور حمل سے نکاح کی رٹ لگاتے جائیں تو اس سے زیادہ ہٹ دھرمی اور کیا ہو سکتی ہے؟

(۳) لفظ وجیہ سے حضرت عیسیٰ کے باپ کا ثبوت: عیون زمزم کے صـ۱۱۴ پر وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:۔

"زانیہ اور ولد الحرام کبھی اپنا چہرہ دنیا کو نہیں دکھلا سکتے۔ اللہ پاک نے عیسیٰ کو وجیہ فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا چہرہ دکھاتا رہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پر ایسا کوئی الزام نہیں آپ نے ساری زندگی میں کبھی بھی یہ بیان نہیں فرمایا کہ میں بے پدر پیدا ہوا ہوں"

آپ کے اس "ثبوت" کا پورا جواب ہم "وجیھا فی الدنیا" کی بحث میں تفصیل سے درج کر آئے ہیں۔

(۴) اَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ سے طلاق اور نکاح دونوں کا ثبوت: اثری صاحب فرماتے ہیں کہ "جب عورت اپنے شوہر سے پناہ طلب کرے (اللہ سے نہیں بلکہ اپنے شوہر سے) تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے طلاق دے دے"۔ (۱۲۴)

اب اگر آپ اس "مطلب" کو درست تسلیم کریں تو آگے بات یوں چلتی ہے کہ "پناہ طلاق" ہے۔ لہٰذا نکاح ثابت ہے کہ اس کے بغیر طلاق نہیں۔ اسی طرح پر مریم کا نکاح ثابت ہے۔ انکار کی وجہ نہیں"۔ (حاشیہ صـ۱۲۴)

اس ثبوت کا بھی ہم مندرجہ آیت کے تحت تفصیل سے جائزہ پیش کر چکے ہیں۔

(۵) نبیوں کا اعلیٰ النسب ہونا: فرماتے ہیں کہ "ہرقل شاہ روم نے ابوسفیان سے پوچھا کہ "اس نبی کا نسب کیسا ہے"؟ تو ابوسفیان نے کہا کہ "وہ شریف النسب" ہے۔ اس پر ہرقل کہنے لگا "تمام رسول اسی طرح صاحب نسب ہی ہوتے رہے" (صـ۵۹) .... "جس طرح مسلمان رسول اللہ کا بلند مقام قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ہرقل عیسائی ہونے کی حیثیت سے عیسیٰ کا مقام بلند قرار دیتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آپ کے پدر کو مانتا ہے اور نسب اس کی طرف سے چلاتا ہے" (ص ۵۱)

اس مکالمہ سے جس طرح اثری صاحب نے یہ صاف نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرنے کی ہم کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔

(۶) خرق عادت امور سے منطقی طور پر عیسیٰ کے باپ کا ثبوت: فرماتے ہیں "جن بزرگوں کے نزدیک حواؑ آدمؑ سے پیدا ہوئی ہے۔ کیا وہ اسے اس کی دلیدہ بھی شمار کرتے ہیں اور پھر وہ اس سے اس کا نکاح بھی کراتے ہیں کیا خوب ہے! اگر احد الطرفین سے پیدا شدہ ان کے نزدیک ولد نہیں تو پھر عیسیٰ بھی مریم کے ولد نہیں۔ مگر قرآن مجید

عیسیٰؑ کو ولد بتاتا ہے۔ لہٰذا وُہ (عیسیٰؑ) ذوالطرفین ٹھہرے؟" (ص ۸۹)

اِس بیان میں "کیا خُوب ہے!" کا جواب تو اثری صاحب نے خود ہی دے دیا ہے کہ مسلمان حوّاؑ کو آدمؑ کی ولیدہ شمار نہیں کرتے۔ کیونکہ ولد وُہ ہوتا ہے جسے کوئی مادہ پیٹ کی پرورش کے بعد فرج کے راستہ سے جنتی ہے۔ اب چونکہ حوّاؑ کی پیدائش اس ضابطہ کے مطابق نہیں ہوئی۔ لہٰذا وہ ولیدہ نہیں اور حضرت عیسیٰ اسلیئے ولد ہیں کہ وُہ اس ضابطہ الٰہی کے مطابق ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اب دُوسرا عام ضابطہ الٰہی یہ ہے کہ حمل زوجین کے نطفہ سے قرار پاتا ہے۔ حوّاؑ اور عیسیٰؑ دونوں اس ضابطہ الٰہی سے خارج ہیں اور خرق عادت طور پر پیدا ہُوئے۔ حوّاؑ اس لیئے کہ آدمؑ نہ مادہ ہیں نہ ان کے پیٹ میں پرورش ہوئی۔ نہ ان کی پیدائش فرج کے راستہ سے ہوئی۔ وہ آدم کی پسلی سے خرق عادت طور پر پیدا ہُوئیں۔ اور عیسیٰؑ اس لیئے کہ ان کا باپ نہیں تھا۔ ان میں خرق عادت امر یہ تھا کہ اللہ کی طرف سے ڈالے ہوئے کلمہ اور رُوح سے اُنہیں حمل ٹھہر گیا۔ اور پہلے مذکورہ ضابطہ کے مطابق ان کی پیدائش ہوئی۔ لہٰذا احدالطرفین اور ذوالطرفین کا کوئی ضابطہ لاگو ہی نہیں ہوتا۔

(۷) مریمؑ کے صدیقہ ہونے سے نکاح کا ثبوت: فرماتے ہیں کہ "ابو ایوب انصاری سے مرفوعاً مروی ہے کہ نکاح انبیائے کرام کا معمول رہا ہے اور مریمؑ کی بابت بھی یُوں ارشاد ہوا ہے کہ صَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ (تحریم) وُہ اللہ پاک کی کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق کیا کرتی تھی۔ دریں صُورت وہ باوجود ضرورت کے نکاح سے علیحدہ کیسے رہ سکتی تھی؟" (ص ۹۵)

گویا نکاح کا ثبوت یہ ہے کہ "تمام کتابوں میں لکھا ہے کہ نکاح کیا کرو اور مریم کتابوں کی تصدیق کرتی تھی لہٰذا اس نے نکاح بھی ضرور کیا تھا" ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ کتابیں تو وہی ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل شدہ ارشادات و احکام ہیں۔ انہیں میں سے ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ ہم نے مریم کی طرف اپنی رُوح بھیجی اور اس کی طرف کلمہ ڈالا جس سے وہ حاملہ ہوئی تو کیا اس ارشاد الٰہی کی اُس نے تصدیق نہ کی تھی۔ نکاح ایک عام حکم ہے جب کہ کلمہ اور رُوح کا ڈالنا حضرت مریم سے خاص ہے تو حضرت مریم کی تصدیق تو یُوں ہوتی ہے کہ اس نے نکاح نہیں کیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس کا نکاح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو گویا وُہ اس کے صدیقہ ہونے کا انکار کرتا ہے۔

(۸) علاّتی اور اخیافی بھائی: فرماتے ہیں کہ "رسُول اللہؐ نے فرمایا" ہے:-

انا اولی الناس بعیسی بن مریم فی الدنیا والآخرۃ | مَیں دوسرے لوگوں (بالخصوص عیسائیوں سے بھی) دُنیا و

الانبیاء اخوۃ العلات امھاتھم شتّٰی ودینھم واحدٌ۔

آخرت میں عیسیٰ کی مودّت کا زیادہ حقدار ہوں تمام انبیاء آپس میں علاتی بھائی (جن کا باپ ایک اور مائیں الگ الگ ہوں) ہیں کہ اُن کی مائیں (شریعتیں) تو الگ الگ ہیں اور ان کا (باپ) دین ایک ہے۔

اس حدیث کو درج کرنے کے بعد اثری صاحب فرماتے ہیں کہ اگر عیسیٰ کا باپ نہیں تو پھر وہ علاتی بھائی کیسے ہوئے؟ حالانکہ رسُول اللہؐ نے سب کو علاّتی ٹھہرایا ہے اور بالخصوص عیسیٰ کا ذکر فرمایا ہے"......عیسیٰ بالاتفاق اسرائیلی ہیں۔ لہٰذا علاّتی ہونے کی وجہ سے ان کا باپ ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ یہاں دُوسری صورت بھی قائم ہے مگر اس حدیث میں علاّتی ہے۔ اخیافی کا ذکر نہیں" (ص ۹۶)

آپ کی اس دلیل پر تو آپ کا قلم چُوم لینے کو جی چاہتا ہے کیونکہ اس دلیل کی بے ہودگی آپ کو بھی خوب معلوم تھی۔ تاہم عیسیٰ کا باپ ثابت کرنے کے جنون نے آپ سے یہ دلیل بھی درج کروادی۔ اب سوالات یہ ہیں کہ:۔

(۱) اگر عیسیٰ کا باپ تسلیم کر بھی لیا جائے۔ تو پھر بھی تمام انبیاء کے باپ ایک کیسے ہُوئے۔ چُونکہ ہر ایک کا باپ الگ الگ ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ توجیہہ غلط ہے۔

(۲) حدیث میں واضح الفاظ ہیں دینھم واحدٌ ان انبیاء کا دین ایک تھا۔ علاتی اس مقام پر مجازی اور کنائی معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ لہٰذا یہاں اُمّہات کا ذکر بلحاظ نسب نہیں کیا گیا۔ بلکہ بطور کنایہ ہے ان کا معنیٰ شریعتیں ہیں جو سب انبیاء کی الگ الگ رہی ہیں۔ اور دین ایک رہا ہے۔

(۳) "اگرچہ یہاں دُوسری صورت بھی قائم ہے" اس دوسری صورت کی تشریح آپ نے اس لیے نہیں فرمائی کہ اگر یہ تشریح فرما دیتے تو پہلی صورت از خود ختم ہوجاتی تھی۔ جس پر آپ زور دے رہے ہیں۔

(۴) اولی الناس بعیسی میں صرف محبت و مودّت جتلانا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ الفاظ قربت زمان ومکان پر بھی دلالت کرتے ہیں۔

(۹) اندازِ بیان سے عیسیٰ کے باپ کا ثبوت:

ص۸۹ پر آپ ایک سوال اُٹھاتے ہیں کہ: اللہ پاک نے آدمؑ کو بے پدر نہیں بتایا مگر بیان ایسا کیا ہے کہ وُہ بے پدر سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی عیسیٰ کو بے پدر نہیں بتایا مگر بیان ایسا کیا ہے کہ وُہ بے پدر سمجھا جاتا ہے۔ (ع ص۸۹)

اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں" اچھا ایسے ہی موسیٰ کو بے پدر نہیں بتایا مگر بیان ایسا کیا ہے کہ وُہ

بے پدر سمجھا جاتا ہے تو کیا وُہ بے پدر ہے۔ ہرگز نہیں تو ایسے ہی وُہ بھی نہیں ...... اصل بات یہ ہے کہ ان مواقع پر بے پدری زیر بحث نہیں اور نہ ہی مقصود ہے۔ بلکہ اس وقت کے حالات اور کیف تخلیق مقصود ہے جسے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔"

اس جواب میں آپ نے "تجاہل عارفانہ" کے جن حربوں سے کام لیا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) ان تینوں مثالوں میں فرق یہ ہے۔ کہ موسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کی تربیت کے حالات قرآن نے ذکر کیئے ہیں جبکہ آدمؑ اور عیسیٰؑ کی کیف پیدائش کو ذکر کیا ہے کہ دونوں کا کوئی باپ نہ تھا۔ اثری صاحب نے خود بھی "اصل بات" میں یہ وضاحت کر دی لیکن "اس وقت کے حالات" اور "کیف تخلیق" کو ایک بنا کر خلط مبحث کر دیا ہے۔

(۲) اللہ تعالےٰ نے اسی کیف پیدائش میں عیسیٰؑ کو آدم کے مثل قرار دیا ہے۔ عیسیٰؑ کو موسیٰؑ کے یا آدمؑ کو موسیٰؑ کے مثل نہیں کہا۔ جس سے واضح ہے۔ کہ موسیٰؑ کی کیف پیدائش زیر بحث ہے ہی نہیں۔ تو پھر یہ تینوں مثالیں منطبق کیسے ہوئیں۔

(۳) قرآن کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے بیان کردہ واقعات میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو یہ کہ دونوں کے باپوں کا نام مذکور نہیں۔ اسی بنا پر اثری صاحب نے یہ دھوکا دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ اگر موسیٰ کے باپ کا نام مذکور نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بے پدر نہیں سمجھا جا سکتا تو پھر آخر حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ایسا کیوں نہیں سمجھا جا سکتا۔

(۱۰) کمثل کا لفظ جہاں بھی ہو اس سے باپ ثابت کرنا:

اسی مندرجہ بالا سوال یعنی (انداز بیان سے باپ کا ثبوت) کے ضمن میں اثری صاحب کا جواب نمبر ۳ یوں ہے:۔

"ابوداؤد جلد ۲ میں ہے: اَنَّ مثل عثمان عند اللہ کمثل عیسیٰ بن مریم (عثمانؓ[1] کی مثال اللہ کے ہاں عیسیٰ بن مریم کی سی ہے) تو کیا عثمان بے پدر پیدا ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں"...... اور مشکوٰۃ میں بحوالہ مسند احمد مرفوعاً مروی ہے کہ فیك مثلٌ من عیسیٰ (اے علی! تیری مثال عیسیٰ جیسی ہے) تو کیا علی بے پدر پیدا ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں" (صـ۹)

اس دلیل کی بے ہودگی آپ نے خود ہی اگلی سطور میں یہ لکھ کر واضح کر دی ہے "اصل بات یہ ہے کہ یہ تمثیل اور بات میں ہے۔ پیدائش میں نہیں"

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ تمثیل کسی اور بات میں ہے تو کیا آپ نے اس کا رُخ پدر، بے پدر ہونے کی طرف صرف دھوکا دینے کیلئے موڑ دیا ہے؟

---

[1] حضرت عثمان اور عیسیٰ بن مریم میں قدر مشترک نرم دلی اور عفو و درگزر ہے۔

پھر آپ نے آگے چل کر حضرت علیؓ اور عیسیٰؑ میں وجہ مماثلت خود ہی بیان بھی کر دی ہے چنانچہ ص۱۵۳ پر ایک مرفوع حدیث کا ذکر فرماتے ہیں کہ:۔

"اے علی! اس بات میں تم عیسیٰ بن مریم کے مثل ہو۔ ایک قوم نے (عیسائیوں نے) عیسیٰ سے محبت کی اور حد سے بڑھ گئے تو ہلاک ہوئے اور ایک قوم نے (یہود نے) ان سے بغض رکھا اور حد سے بڑھ گئے تو ہلاک ہوئے پھر ایک قوم نے میانہ روی اختیار کی تو اس نے نجات پائی"۔ (ص ۱۵۲)

گویا اے علی! تم سے بھی ایک قوم (شیعہ) محبت رکھے گی اور حد سے بڑھ جائے گی۔ یہ بھی ہلاک ہو گی۔ ایک اور قوم (خارجی) تم سے بغض رکھے گی اور حد سے بڑھ جائے گی۔ یہ بھی ہلاک ہو گی۔ پھر ایک اور قوم (اہلسنت) میانہ روی اختیار کرے گی وہ نجات پائے گی۔ یعنی علیؓ اور عیسیٰؑ میں وجہ مماثلت محبت اور بغض میں افراط ہے لیکن اثری صاحب نے "تو کیا علی بھی بے پدر پیدا ہوئے تھے" کا پہلو نکال کر "اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی" کی مثال پیش کر دی ہے۔ گو بعد میں تردیدی بیان بھی خود ہی دے گئے ہیں کیونکہ دروغ گو کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔

(۱۱) لفظ قری عیناً سے باپ کا ثبوت: قری عیناً سے آپ نے عیون زمزم کے ص۱۲۱ پر جو ثبوت دیا ہے اس پر تبصرہ فضائل مریمؑ میں اصل مقام پر پیش کر چکے ہیں۔

(۱۲) لفظ طہارۃ سے باپ کا ثبوت: اور لفظ طہارۃ سے آپ نے ص۸۰ پر مریم کا شوہر ثابت کیا ہے۔ اس پر تبصرہ "حضرت مریم کے فضائل" کے تحت کہہ چکے ہیں۔

(۱۳) کنیت سے باپ کا ثبوت: آپ عیون زمزم کے ص۱۱۶، ص۱۱۷ پر فرماتے ہیں کہ کنیت ابو آدم کسی نے نہیں رکھی کیونکہ ان کا سچ مچ کوئی باپ نہ تھا۔ مگر کنیت ابو عیسیٰ رکھنا جائز ہے اور بہت سے لوگوں نے رکھی بھی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ تھا۔

اس دلیل کی بیہودگی یہ ہے کہ حضرت آدم ابو البشر ہیں اور بشر میں مرد، عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ ان کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی لیکن عیسیٰؑ ابو البشر نہیں کیونکہ ان کی ماں موجود ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اجازت کے باوجود کہ انبیاء کے نام رکھے جا سکتے ہیں۔ لوگوں نے عیسیٰ نام تو رکھا لیکن آدم کسی نے نہیں رکھا۔ پھر جب اور کسی کا نام ہی آدم نہ ہو تو کنیت کیسی اور نسبت کیسی؟

(۱۴) لفظ ذریت سے نکاح کا ثبوت: اثری صاحب حضرت مریم کے قول اِنِّیْ اُعِیْذُھَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَھَا سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"صاف ظاہر ہے کہ اولاد کے ذکر پر مریمؑ کی والدہ کے پیش نظر ہرگز یہ نہیں تھا کہ بے نکاح اس کے اولاد ہو گی کہ یہ علم غیب کی بات ہے جو اگر ہو بھی تو اسے اللہ پاک کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دریں حالات کوئی ناجائز صورت بنا کر شرعی نکاح سے انکار درست نہیں"۔ (ص ۱۰۹)

اس دلیل کا ابطال بھی آپ نے خود ہی فرما دیا کہ واقعی حضرت مریم کی ماں نے یہ بات کہی تھی لیکن "حضرت عیسیٰ کی پیدائش علم غیب کی بات ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا" مریم کی والدہ نے اپنے علم کے مطابق بات کی تھی۔ لیکن اُسے علم غیب نہ تھا۔

(۱۵) لقیط بچہ سے نکاح کا ثبوت: فرماتے ہیں: "جب فرعون کی عورت کی گود میں بچہ (موسیٰ) دیکھا گیا تو کسی نے بھی یُوں نہ کہا کہ یہ بچّہ کہاں سے لائی ہے سب کو معلوم ہے کہ یہ کسی نامعلوم الاسم کا بچّہ ہے۔ جسے اس طرح پر پایا گیا ہے۔ یہاں (یعنی حضرت عیسیٰ کے معاملہ میں) بھی ایسا ہوسکتا تھا (یعنی مریمؑ یہ کہہ دیتیں کہ یہ بچّہ لقیط ہے میں ازراہِ ہمدردی اسے پال لُوں گی)۔ خواہ مخواہ ایک بلا خریدنے کی ضرورت نہ تھی مگر ایسا نہیں ہُوا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سب فرضی باتیں ہیں۔ کسی خطرناک الزام کا خوف نہیں اور نہ ایسا وقوع میں آیا۔ صرف ایک مسئلہ زیرِ بحث تھا جو کہ اس موقعہ پر صاف ہوگیا اور بس" (ص ۱۲۵)

آپ کے اس بیان سے معلوم ہُوا کہ:۔

(۱) حضرت مریمؑ نے بچّہ کو لقیط اس لیے نہ کہا تھا کہ انہیں زنا کے الزام کا یہود کی طرف سے کچھ خطرہ نہ تھا اور یہ جو قرآن کریم میں یہود کے بہتانِ عظیم، بچّہ کے متعلق شَیْئًا فَرِیًّا اور حضرت مریم کے متعلق امْرَأَ سَوْءٍ اور امُّكِ بَغِيًّا کے لفظ آئے ہیں۔ یہ سب فرضی باتیں ہیں ان کا واقعہ کی حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔

(۲) اس موقعہ پر ایک زیرِ بحث مسئلہ 'منذورہ ہو کر نکاح کا جرم کرنا' تھا۔ جب یہود نے اعتراضات کی بوچھاڑ کی تو مریمؑ نے تو زکریّا کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہی کرتا دھرتا تھے۔ وُہ بھی خاموش رہے۔ بچّہ بول نہیں سکتا تھا۔ شوہر ویسے ہی گم ہوگیا تھا۔ پھر زیرِ بحث مسئلہ اس موقع پر صاف کیسے ہُوا؟

(۱۶) حضرت مریم کے کھجور کھانے سے شوہر کا ثبوت: ص ۱۴۱ پر فرماتے ہیں کہ "سلمہ بن قیس سے مرفوعاً مروی ہے کہ اپنی عورتوں کو ولادت کے وقت کھجور چھوہارے کھلایا کریں کہ مریم کو بھی ایسے وقت میں کھجور کھلائی گئی تھی۔ اس نبوی بیان سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو دیگر عورتوں کی طرح جائز حمل ہو کر وضع ہوا اور اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا کہ اس نے یہ سب کچھ مہیا کر دیا تھا"۔ (ص ۱۶۱)

واضح رہے کہ اثری صاحب نے وضع کے وقت شوہر صاحب کو یہ کہہ کر گم کر دیا تھا کہ وہ دائی یا دوائی لینے چلا گیا ہوگا اور سب بات چیت صاحب النخلہ سے کرائی۔ اب پھر اس حدیث نبوی پر عمل کرانے کیلئے اسے ڈھونڈھ نکالا ہے چونکہ اس حدیث میں اور اس واقعہ مریم میں "کھجور کھانا" قدرِ مشترک ہے لہٰذا نکاح اور شوہر

آپ سے آپ ثابت ہوگیا۔

(۳) ہیرا پھیری یا چکّر بازی کی قسم کے دلائل

(ا) ۔ ایسے دلائل جہاں آپ نے آیت یا روایت کا ترجمہ کرتے وقت اپنی طرف سے اپنے مطلب کے الفاظ کا اضافہ کرکے اسے بطور دلیل پیش کیا ہے :۔

مثلاً (۱) صٓ۲۲ پر جواب ۳ کے تحت عیسوی مناظرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرفوع روایت پیش کرتے ہیں ان عیسٰی حملتہ اُمّہ کما تحمل المرأۃ اور اس کا ترجمہ کرتے ہیں "مریم کو اسی طرح جائز حمل ہوا جس طرح دیگر عورتوں کو جائز حمل ہوا کرتا ہے ۔ اس ترجمہ میں لفظ جائز اثری صاحب کا اپنی طرف سے اضافہ ہے جس سے وُہ نکاح ثابت کر رہے ہیں۔

(۲) اسی مذکورہ صفحہ اور جواب کے تحت ایک آیت درج فرماتے ہیں :۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ (حٰمٓ السجدہ ۵)	(اصل ترجمہ : کوئی مادہ جو حاملہ ہوتی یا جنتی ہے اس کا اللہ کو علم ہوتا ہے)

آپ اس کا ترجمہ یا مطلب یُوں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ حمل و وضع اُنثیٰ کا کام ہے مگر یہ بھی بغیر ذکر ممکن نہیں۔ اسی طرح مریمؑ کا حمل و وضع بھی بغیر شوہر ممکن نہیں۔ یہاں آپ نے پہلے فقرہ میں بغیر ذکر ممکن نہیں کا اضافہ کر لیا۔ اور حضرت مریم کی مثال دے کر اس میں بغیر ذکر کی جگہ بغیر شوہر کر لیا۔ اور نکاح ثابت کر لیا۔

(۳) ۔ صٓ۲۴ پر "نبوی گرامی نامہ" کے تحت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے شاہِ حبش کو لکھا کہ :۔
عیسٰی بن مریم روح اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم البتول اس کا ترجمہ یُوں کرتے ہیں کہ "مریمؑ نے اپنے زمانہ کی ہر ایک عورت سے جو رسم و رواج اور تبتّل کی پابند تھی ۔ ممتاز ہو کر نکاح کیا"۔ گویا اصل مسئلہ جو زیرِ بحث ہے اس کا ثبوت مہیّا کرنے کی بجائے ۔ روایت کا ترجمہ بلا تکلف از خود اضافہ کرکے نکاح ثابت کر دیا۔

(۴) صٓ۱۳۲ پر مکاناً شرقیاً کو زیرِ بحث لاتے ہوئے شرقیا کے معنی لکھتے ہیں :۔ "حَيْثُ طَلَعَتْ وَاَتَتْ مَنْكُوْحَةً" اس تشریح میں حَيْثُ طَلَعَتْ مشرق کا ترجمہ تو ہوسکتا ہے لیکن لفظ شرقیاً ہے بمعنی شرقی جانب دُوسرے آپ نے حسب عادت "منکوحہ ہو کر آئی" کا اپنی طرف سے اضافہ کرکے نکاح ثابت کر دیا۔

(ب) ۔ کسی روایت کے ان الفاظ کا ترجمہ گول کر جانے سے، جن کا ترجمہ آپ کے مطلب کے خلاف

ہو۔ مثلاً

(۱) ص ۴۹ پر آپ نے عون المعبود سے ایک طویل روایت درج فرمائی ہے۔ جس کا ترجمہ یا مطلب پیش کرتے وقت آپ لم یقربھا بشرؒ کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں۔ اسی طرح اپنی تفسیر میں لم اکُ بغیاً کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل کے ذبح عظیم کے واقعہ میں ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔

(۲)۔ ایسی روایات کو جن کا آپ کے پاس کوئی جواب نہ بن پڑے۔ ان کو درج کرنے سے پرہیز فرماتے ہیں۔ جیسے تفسیر ابن عباس میں اِنّ مثل عیسٰی ...... الخ کے تحت حضرت عباس تین بار تصریح فرماتے ہیں کہ عیسٰی بغیر باپ پیدا ہوئے اور یہ تو ناممکن ہے کہ تفسیر ابن عباس، جو دُرِ منثور کے حاشیہ پر درج ہے آپ کے مطالعہ میں نہ آئی ہو جبکہ دُرِّ منثور سے آپ نے بکثرت روایات درج فرمائی ہیں۔

(ج)۔ غلط مطلب پیش کرنے سے مثلاً :-

(۱) ص ۵۱ پر ایک روایت کے الفاظ وَ اَنَّہٗ وُلِدَ بِغَیْرِ ذَکَرٍ (یعنی عیسٰی بغیر باپ کے پیدا ہوئے) کا ترجمہ پیش کرتے ہیں " عیسٰی کی ولادت میں باپ کا کوئی تعلق نہیں"۔ اس کا مطلب آپ جو چاہیں سمجھیں بہرحال آپ نے واضح سی بات کو چکر میں ڈال دیا۔

(۲) ابنِ مریم کو نسب کے بجائے کنیت قرار دینا۔ پھر اگلا مرحلہ یہ کہ کنیت ہیں ماں کی طرف نسبت بلندی شان کی وجہ سے ہے۔ اس پر بھرپور تبصرہ ہم اس بحث کے صحیح مقام پر پیش کر چکے ہیں اور پھر اس سے اگلا مرحلہ عیسٰی کا باپ ثابت کرنا ہے جیسے فرماتے ہیں:۔

"اگر والدہ کے نام پر اصرار ہے تو پھر جیسا کہ جامع البیان میں ہے کہ عیسٰیؑ اور حسنینؓ ہر سہ کا جلال و شرف ہے اور ظاہر ہے کہ ان ہر سہ میں سے کوئی بھی بے پدر پیدا شدہ نہیں"۔ (ص ۶۴)

(۳)۔ ص ۵۴ پر لَیْسَ لَہٗ اَبٌ کا مطلب یوں لکھتے ہیں "مطلب یہ ہے کہ آپ باپ کی طرف سے ابراہیم کی نسل سے نہیں ثابت ہو سکتے کہ آپ کا باپ کوئی غیر اسرائیلی ہے اور اللہ پاک نے ان کو ماں کی طرف منسوب کر دیا جو یقینی ہے"۔ یہ سب لَیْسَ لَہٗ اَبٌ کا مطلب ہے۔

یہ چند مثالیں ہم نے بطور نمونہ پیش کر دی ہیں۔ اگر آپ استقصاء کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ایسے دلائل آپکی ساری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔

تتمہ

اثری صاحب سے چند سوالات

آپ نے اپنی کتاب میں سوال و جواب کے طرز پر لکھی ہیں۔ اور اس کا فائدہ یہ بتلایا جا رہا ہے کہ مسئلہ زیر بحث کا کوئی پہلو اوجھل نہ رہ جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ سینکڑوں سوال و جواب کے باوجود بعض ایسی باتیں جو ذہن میں کھٹکتی ہیں وہ پھر بھی باقی رہتی ہیں۔ اب اثری صاحب تو فوت ہو چکے ہیں ہم ان کے معتقدین سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل سوالات کے جواب مرحمت فرمائیں گے۔

(۱) حضرت مریم کے نکاح کا آپ نے بیسیوں مرتبہ ذکر فرمایا ہے لیکن اس کا کوئی نقلی ثبوت پیش نہیں کیا۔ اس کا حوالہ درکار ہے۔ اگر قرآن حدیث یا اثر سے مل جائے تو فبہا ورنہ کم از کم بائیبل یا تاریخ سے اس کا حوالہ درکار ہے۔

(۲) آپ فرماتے ہیں کہ آیت کا معنی نمونہ ہے اور ناس سے مراد منذور لوگ۔ آیت کا یہ معنی لغت کی کس کتاب سے لیا گیا ہے؟ اگر یہ نکاح مریمؑ ہی نمونہ تھا تو اس نکاح میں یا تو حضرت زکریا کا دخل تھا یا پھر حضرت مریمؑ کا۔ حضرت عیسیٰ کا اس نمونہ یا آیت میں کوئی دخل نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہم نے مریم اور اسکے بیٹے کو جہان والوں کے لیئے نشانی بنا دیا۔

اس آیت کے کردار حضرت مریم اور ان کا بیٹا عیسیٰ ہیں حضرت زکریا کا کوئی دخل نہیں۔ اور ناس کے بجائے کبھی عالمین کا لفظ آیا ہے جو مطلق ہے اور ناس کی طرح مقید نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں توجیہات میں سے کون سی درست ہے اور کیوں؟

(۳) فاشارت الیہ کا مشارٌ الیہ زکریا علیہ السلام ہیں تو انہوں نے اس موقع پر کیا جواب دیا۔ حوالہ درکار ہے۔ اور اگر خاموش رہے تو کیوں خاموش رہے جبکہ وہ اس سارے معاملہ کے کارپرداز بھی تھے اور حضرت مریمؑ کے کفیل اور مربی بھی؟

(۴) وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا کا ترجمہ "اے مریم کھجور کے درخت سے جتنی کھجوریں جب چاہو اتار سکتی ہو" کونسے صرف ونحو کے قاعدے یا لغت سے ماخوذ ہے؟

(۵) حضرت مریم کا فرضی شوہر کس عمر میں مرا تھا؛ چونکہ کتاب ہذا میں ہر جگہ تضاد بیانی سے کام لیا گیا ہے لہٰذا یہ وضاحت درکار ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کتنے سال یا دن بعد وہ مرا یا وضع کے وقت ہی وہ مر چکا تھا؟

(۶) اگر فی الواقعہ یوسف عیسیٰ کا باپ تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ نام بتلانے سے کیوں احتراز کیا؟ پھر رسول اللہ پھر صحابہ کرامؓ پھر تابعین اور محدثین ومفسرین کا طرز عمل بھی کیوں ایسا ہی رہا۔

حصّۂ سوم

عصمتِ انبیاءؑ کی آڑ میں

خرقِ عادت امور

اور

معجزاتِ انبیاءؑ سے انکار

بجواب

البیانُ المختار و القولُ المختار

چند دلچسپ تاویلات

۱۔ فرشتے اور اُن کے پر

قرآن کریم میں بالوضاحت اس بات کا ذکر ہے کہ فرشتوں کے پر ہوتے ہیں۔ارشاد باری ہے :۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۵/۱)	سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنیوالا اور فرشتوں کو قاصد بنانے والا جن کے دو دو، تین تین اور چار چار پر ہوتے ہیں۔ پھر جس کسی فرشتے کے چاہتا ہے وہ پر بڑھا بھی دیتا ہے بیشک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت کو درج کرکے اس کا ترجمہ پیش کرتے وقت حافظ صاحب نے دو مقامات پر تبدیلی فرمائی ہے :۔

(۱) اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ یعنی "پروں والے" کے بجائے بازوؤں والے لکھا ہے اور حاشیہ میں یہ بھی درج فرما دیا ہے کہ "بازوؤں والے یعنی ساتھیوں والے کہنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے"۔ (ص ۱۰) یعنی فرشتوں کے پروں کا دھندا ہی ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کا ترجمہ "بے شک ہر چیز کا بندھن باندھنے والا ہے" کرکے معتزلین کے اس نظریہ کی تائید فرما دی ہے کہ خدا اپنے وضع کردہ قوانین کا خود بھی پابند بن گیا ہے۔ وُہ ان قوانین کے سامنے خود بھی بے بس ہے اور ان میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔

ترجمہ کے بعد حافظ صاحب سوال اُٹھاتے ہیں کہ "کیا فرشتوں کے پَر ہوتے ہیں۔ کسی کے دو دو، کسی کے تین تین اور کسی کے چار چار اور کسی کے اس سے بھی زیادہ۔ اور حدیث میں ہے کہ جبریل کے چھ سو پر ہیں نیز نیز حدیث میں یہ بھی ہے فرشتے طالب علموں کے لیے پَر بچھا دیتے ہیں تو کیا سچ مچ فرشتے پرندے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس آیت اور حدیثوں کا کیا مطلب ہے؟" (ص ۱۱)

اب اس کے جواب میں حافظ صاحب نے جو قلا بازیاں کھائی ہیں وہ قابل داد ہیں۔ پہلے تو یہ ثابت

کیا ہے کہ جُناح کے معنی صرف پر ہی نہیں بازو بھی ہے۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ بازو کے لیے عضدً کا لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ عضدًا کے معنی صرف بازو ہی نہیں مددگار بھی ہے۔ لہٰذا جناح کے معنی مددگار کے ہوئے۔ اب دو پروں والے فرشتے کا مطلب یہ ہوا کہ اس فرشتے کے دو مددگار ہیں اور وہ ان کا سردار ہے۔ اسی طرح جب رسُولِ اکرمؐ نے جبریل کو دیکھا تو ان کے چھ سو پر تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وُہ اس وقت چھ فرشتوں کی قیادت فرما رہے تھے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ فرشتے طالب علم کے لیئے پر کیسے بچھاتے ہیں؟ تو اس مقام پر اب جناح یا بازو سے مُراد "شفقت اور مہربانی" لیتے ہیں اور دلیل میں یہ آیت پیش فرمائی ہے:۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷/۲۴) اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جُھکے رہنا (اثری ترجمہ)

اس آیت میں جُھکے رہنا تو واخفض کا ترجمہ ہوا اور "شفقت سے انکساری کے ساتھ" الذل من الرحمۃ کا اور جناح کا ترجمہ آپ ہضم کر گئے اور اس طرح ثابت کر دیا کہ جناح کے معنے الفت شفقت اور پیار ہے۔ (ص ۱۱)

اب سوال یہ ہے کہ حافظ صاحب کو فرشتوں کے پر غائب کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پیشرؤں یعنی معتزلین اور سرسید کا فرشتوں کے متعلق یہی نظریہ تھا کہ فرشتے کوئی خارجی وجود نہیں رکھتے بلکہ اس سے مراد یا تو (۱) کائناتی قوتیں ہیں اور یا (۲) انسان کے اندر کے قوائے ملکوتی (اس نظریہ پر میں کسی دُوسرے مضمون میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں) حافظ صاحب نے کھل کر فرشتوں کے خارجی وجود کا انکار تو نہیں فرمایا البتہ پروں کی مختلف تاویلات پیش کر دی ہیں۔ کیونکہ پروں کے ثابت ہونے سے ان کے خارجی وجود کی تائید ہوتی تھی۔

۲۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ

تخلیق آدم کی بات شروع ہو تو فرشتوں کے سجدہ کا ذکر بھی آ ہی جاتا ہے ابتدائے سورۂ بقرہ میں ہی ہے:۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (۲/۳۴) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے دُوسرے مقام پر یوں ادا فرمایا:

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ (۱۵/۳۰) | تو ابلیس کے سوا سب کے سب فرشتے سجدہ میں گر پڑے

غرض قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات فرشتوں کے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا ذکر آیا ہے مگر اثری صاحب کو آدم کو فرشتوں کا سجدہ کرنا گوارا نہیں وہ ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لآدم کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں کہ: "پھر جو تم میں آدم نامی بزرگ تھے ۔انہیں خلیفہ بنا کر فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اللہ کا شکر بجا لاتے ہوئے اس کی جناب میں سجدہ ریز ہو کر صاف صاف اعتراف کرو کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے آدم کو ایک بڑا معزز اور شاندار خلیفہ بنایا ہے" (ص۱)

غور فرمائیے یہ ساری عبارت قرآن کریم کے صرف چار الفاظ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لآدم کا ترجمہ ہے۔ جس میں آپ نے فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے پھر اسی صفحہ کے حاشیہ میں اس انکار کی وجہ یہ بتلائی کہ:۔

"میرے نزدیک لِآدَمَ میں لام تخصیص کے لیئے نہیں بلکہ تعلیل کے لیئے کہ آدم کی خلافت پر اللہ پاک کیلئے سجدہ شکر بجالاؤ۔" (ص ۱، کا حاشیہ)

اب دیکھئے کہ قرآن کریم کا انداز بیان اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتلایا کہ میں زمین میں آدم کو پیدا کر کے اسے زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے یوں جواب دیا تھا کہ الٰہی! تو ایسے شخص کو خلیفہ بناتا ہے جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے گا۔ جبکہ ہم ہر وقت تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں اس مکالمہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کو آدم کی پیدائش اور خلیفہ ہونے کے اعزاز کی خوشی تو کیا ہوتی اُلٹا رقابت کا جذبہ موجود تھا۔ کیونکہ انہوں نے آدم کی نااہلیت یا کسی بُری بات ہی کا ذکر کیا اور اس کے مقابلہ میں اپنی خوبی بیان کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اسی فخر و غرور کو توڑنے کے لیئے فرشتوں کو حکم دے دیا کہ اچھا اب تم آدم کو سجدہ کرو۔ چنانچہ سب فرشتے اللہ کا حکم مانتے ہوئے آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ صرف ابلیس ایسا تھا جو اپنے فخر و غرور پر اَڑ گیا اور راندۂ درگاہ بن گیا۔

لیکن اثری صاحب فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا وہ تو اللہ ہی کو سجدہ کیا تھا اور فرشتوں کا تو یہ سجدہ شکرانہ تھا کہ الٰہی تیرا شکر ہے کہ تو نے آدم کو خلافت عطا فرمائی۔۔ اللہ کو سجدہ تو ابلیس بھی کرتا تھا پھر وہ کیوں راندۂ بارگاہ الٰہی ہو گیا؟۔ دیکھا آپ نے قرآن کے انداز بیان اور اثری صاحب کے بیان میں کس قدر تضاد ہے مثلاً قرآن یہ کہتا ہے کہ:۔

۱۔ خلافت آدم پر فرشتوں کو اعتراض پیدا ہوا لیکن اثری صاحب کہتے ہیں کہ خلافت آدم پر فرشتے بہت خوش ہوئے۔

۲۔ فرشتوں نے سجدہ آدم کو کیا لیکن اثری صاحب کہتے ہیں کہ فرشتوں نے سجدہ خدا کو کیا۔

۴۔ خدا کے حکم کے تحت فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا لیکن اثری صاحب کہتے ہیں کہ خلافتِ آدمؑ کی خوشی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اللہ کا شکریہ ادا کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اثری صاحب آخر قرآن کے اس قدر خلاف کیوں بیان دے رہے ہیں نیز اثری صاحب کو قرآن کے ظاہری الفاظ، احادیث اور جمہور مفسرین کے خلاف لِآدَمَ میں لام کو تعلیل کا لام بنانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ تو اس کا جواب واضح ہے کہ آپ کو جب حضرت آدم کو پہلا انسان یا ابوالبشر تسلیم کرنے میں تردد ہے[1]۔ تو پھر فرشتے آخر سجدہ کیسے کرتے؟ لہٰذا آپ نے لِآدَمَ کے لام پر تحقیق شروع فرمائی اور بتلایا کہ یہ لام تخصیص کا نہیں بلکہ تعلیل کا ہے اور اس کا ترجمہ یوں ہوا کہ:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۲/۳۴) اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو ہمیں واسطے خلافتِ آدم کے۔

اب رہی یہ بات کہ کیا سجدہ لغیر اللہ جائز ہے یا نہیں تو یہ بحث حضرت یوسف علیہ السلام کے بیان میں بھی مل جائے گی۔ یہاں صرف آدم کے لام تعلیل کا ہی ذکر ضروری تھا۔ جو کر دیا گیا۔

---

[1] جیسا کہ کبھی اثری صاحب یوں کہتے ہیں کہ "پھر جو نئم میں آدم نامی بزرگ تھے ......" (ص ۱۷) اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ "اللہ نے اس وقت ایک نہیں بلکہ ایک لاکھ کے قریب آدم پیدا کیے" (ص ۱۸)

باب ۸

(۱) حضرت آدم علیہ السلام

تخلیقِ آدم

تخلیقِ آدم کے متعلق دُنیا میں دو قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ مذہبی حلقوں اور اسی طرح عام مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت آدم کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا (خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۳۸/۷۵) پھر اسی نفس واحدہ سے تمام بنی نوع انسان پیدا ہوئے۔ جس کا ذکر قرآن میں بیشمار مقامات پر آیا ہے۔ پھر احادیث میں بھی اس بات کی وضاحت ملتی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے :

الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب (ترمذی) | تمام انسان آدمؑ کے بیٹے ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے ہیں

دُوسرا گروہ مادیین اور عقل پرستوں کا ہے جو انسان کو کائنات کے ارتقائی قانون کے ماتحت لاکر انسان کو بندر کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق انسان حیوانات سے پہلے نیم انسانی شکل میں آیا۔ پھر خالص انسانی شکل میں آیا۔ مسلمانوں میں سے بھی عقل پرست فرقہ اسی نظریہ کا ہمنوا ہے۔ سرسید اور پرویز صاحب کے خیال کے مطابق آدم کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد بنی نوع انسان کا نمائندہ ہے اور نیز یہ کہ اس مخصوص آدم جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے سے پہلے بیشمار انسان معرضِ وجود میں آچکے تھے چنانچہ سرسید اپنی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۴۸ پر فرماتے ہیں۔

سرسیّد کا نظریہ : "آدم کے لفظ سے وُہ ذات خاص مراد نہیں ہے جس کو عوام الناس اور مسجد کے مُلاّ باوا آدم کہتے ہیں۔ بلکہ اس سے نوعِ انسانی مراد ہے جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاستار میں لکھا ہے "ھو ما المقصود بآدم آدم وحدہٗ" اور خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے "لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ" پس "کُم" کا خطاب کل انسانوں کی طرف ہے اور آدم سے بنی آدم یعنی نوعِ انسانی مُراد ہیں"۔

سرسیّد کے نظریہ کا جائزہ : اقتباس بالا میں سرسیّد نے لفظ آدم کی یہ تشریح پیش کرکے ڈاروِن کے نظریہ ارتقاء کے لیے مکمل طور پر راستہ ہموار کر دیا ہے۔ آدم کی اس نئی تشریح میں آپ نے مشہور و معتبر تفاسیر کو نظر انداز کر کے کسی مجہول تفسیر "کشف الاسرار و ہتک الاستار" کا

سہارا لیا ہے۔ صاحب تفسیر کا نام آپ نے درج نہیں فرمایا کہ اس پر کچھ تبصرہ کیا جائے البتہ تفسیر کے نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تفسیر نے قرآن کو اسرار و رموز کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے اور مصنف صاحب ان سربستہ رازوں کو کھولنے اور پردوں کو ہٹانے کی کوشش فرما رہے ہیں اور جو اسرار انہوں نے بیان فرمائے وُہ سرسید کے مطلب کی چیز تھی۔ باطنی فرقہ کے لوگوں نے بھی قرآن کے ساتھ یہی گل کھلائے تھے۔ پھر قرآن کو جیسے انہوں نے بازیچۂ اطفال بنا دیا وُہ سب کو معلوم ہے۔

نقلی دلیل جو قرآنی الفاظ لقد خلقناکم سے پیش کی گئی ہے۔ اس دلیل کے پیش کرنے میں چونکہ حافظ عنایت اللہ اثری اور جناب پرویز صاحب برابر کے شریک ہیں لہٰذا اس دلیل کا ہم ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۷/۱۱)	اور بیشک ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر صورتیں بنائیں پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

اس میں ثُمَّ قلنا کے لفظ سے سید صاحب نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس قصۂ آدم سے پیشتر بہت سے بنی نوعِ انسان موجود تھے کیونکہ صیغہ "کم" جمع کا استعمال ہوا ہے۔

یہ آیت سورۂ اعراف کی آیت ۱۱ ہے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے درمیان میں سے کسی آیت کا ٹکڑا پیش کر کے مقصد برآری کوئی مستحسن فعل نہیں ہوتا۔ اس آیت کے مخاطب دورِ نبوی کے لوگ ہیں اگر اس سورۂ اعراف کو شروع سے پڑھ لیا جائے تو ذہن خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون آیت ۳ سے مسلسل چلا آ رہا ہے اور وُہ یُوں شروع ہوتی ہے:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۳)	لوگو! جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو۔

گویا ان آیات میں کُمْ کے مخاطب دورِ نبوی کے عوام النّاس ہیں جنہیں بطور شرف و اکرامِ انسانی یہ بات یاد دلائی جا رہی ہے کہ تمہارے باپ آدم کے لیے ہم فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو یہاں کُمْ کی ضمیر آدم اور بنی آدم دونوں کے لیے مشترکہ طور پر استعمال ہوتی ہے جب فاعل یا مفعول ایک یا ایک سے زیادہ ہوں تو ضمیر واحد بھی استعمال ہو سکتی ہے اور جمع کی بھی جیسا کہ قرآن میں قصہ موسیٰ و خضر میں یہ ضمائر جمع بھی استعمال ہوئی ہیں اور واحد بھی۔ حضرت خضر جب حضرت مُوسیٰ کو تینوں واقعات کی تاویل بتلاتے ہیں تو پہلے واقعہ کے لیے اَرَدْتُّ ضمیر واحد متکلم استعمال کرتے ہیں لیکن دوسرے واقعہ کی تاویل بیان کرتے وقت فَاَرَدْنَا ضمیر جمع متکلم استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ کشتی کو توڑنے میں بھی خضر کے ساتھ خدا اور اسکی

مشیّت کو ایسا ہی دخل تھا جیسا کہ دُوسرے واقعہ لڑکے کو مار دینے میں۔

یہ تو رفع اشتباہ والتباس کی بات تھی۔ اب دیکھئے کہ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ جہاں بنی نوع انسان کو مخاطب کرنا مقصود ہو تو بنی آدم کا لفظ استعمال کرتا ہے جیسے فرمایا وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ یہاں بنی آدم سے بنی نوع انسان مُراد ہے جس میں آدمؑ بھی شامل ہیں۔ مگر جہاں ایک مخصوص اور فرد واحد آدم کو مخاطب کرنا مقصود ہو تو لفظ آدم ہی آئے گا۔ قرآن میں قصہ آدم بیسیوں مقامات پر مذکور ہے لیکن کہیں بنی آدم کا لفظ استعمال نہیں ہُوا تو پھر آدم سے مُراد بنی نوع انسان بشمولیت آدم کیونکر لیا جا سکتا ہے

پھر قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جو آدم کو ذاتِ خاص، فرد اوّل اور برگزیدہ نبی قرار دیتی ہیں مثلاً

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ (۳۳/۳)	بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں سے منتخب فرمایا تھا

یہ آیت حضرت آدم کو اسی طرح برگزیدہ قرار دیتی ہے۔ جس طرح نوحؑ کو اور نوحؑ چونکہ فرد واحد تھے اور نبی بھی۔ لہٰذا حضرت آدم بھی فرد واحد تھے اور نبی بھی۔

پھر درج ذیل آیت حضرت آدم کے فرد واحد ہونے اور ان کی نبوت پر واضح دلیل ہے:۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ (۳۷/۲) پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔

اس آیت میں علیہ میں ضمیر واحد غائب سے واضح ہوتا ہے کہ آدم فردِ واحد ہے۔ یہاں بنی نوع انسان یا جماعت کی بات نہیں ہو رہی اور نیز توبہ کی قبولیت کی اطلاع بھی بغیر وحی ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں حافظ ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں اس مقام پر مندرجہ ذیل روایت بھی درج کی ہے:۔

عن ابی ذرٍ قال، قلت یارسول اللہ! ارایت اٰدم نبیًا کان؟ قال: نعم نبیارسولا یکلم اللہ قبیلاً (ج ۱ ص ۳۴ قدیم)	حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے۔ میں نے عرض کیا 'یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کیا آدم نبی تھے؟ آپؐ نے فرمایا' ہاں! نبی اور رسول بھی انہیں اللہ تعالیٰ سے تخاطب و تکلم کا شرف حاصل ہُوا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت آدم ذاتِ خاص، فردِ واحد اور برگزیدہ تھے۔ اب قصہ آدم کو جو قرآن میں بیسیوں مقامات پر مذکور ہے۔ اس کے ساتھ ملائیے تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے انسان اور ابوالبشر تھے جن سے پہلے کوئی انسان موجود نہیں تھا۔

اثری صاحب اور تخلیق آدم

اثری صاحب آدمؑ کو برگزیدہ اور ذاتِ خاص تو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن پہلا انسان یا ابوالبشر ماننے میں سرسیّد کے ہمنوا ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق بھی حضرت آدم کی تخلیق کے وقت لاکھوں انسان موجود تھے۔ چنانچہ آپ آیت مذکورہ ولقد خلقناکم ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لآدم کا ترجمہ یوں پیش فرماتے ہیں :۔

"اور ہم نے پہلے تمہارے (انسانی جنس کے) ڈھانچے تیار کیئے۔ پھر تمہاری علیحدہ علیحدہ شکلیں صورتیں بنائیں۔ پھر جو تم میں آدم نامی بزرگ تھے۔ انہیں خلیفہ بنا کر فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہوئے اسی کی جناب میں سجدہ ریز ہو کر صاف صاف اعتراف کرو کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے آدمؑ کو ایک بہت بڑا معزز اور شاندار خلیفہ بنایا ہے" (ب ص ۱۷)

اس ترجمہ میں موصوف نے ایک دوسرا موضوع بھی گھسیٹر دیا ہے یعنی "فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا یا اللہ کو"۔ اس موضوع پر تو الگ بحث ہوگی سردست یہ دیکھئے کہ حافظ صاحب بھی آدمؑ کو ابوالبشر ماننے کو تیار نہیں بلکہ اس سے مراد بہت سی پھیلی ہوئی انسانی مخلوق میں سے کوئی آدم نامی بزرگ قرار دے رہے ہیں۔

۲۔ اپنے نظریہ کی تائید میں دوسری نقلی دلیل یہ پیش فرمائی کہ مکتوبات امام ربّانی مجدد الف ثانی دفتر دوم میں بحوالہ فتوحاتِ مکیہ ابن عربی[1] بیان کیا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے ایک نہیں بلکہ ایک لاکھ کے قریب آدم پیدا کیئے۔	اِنَّ اللہَ خَلَقَ مِاۤئَۃَ اَلْفَ آدمَ ؎

ہم سرِفہرست اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ابن عربی نے جو صوفیا کے گروہ کے شیخ اکبر کہلاتے ہیں دین میں کیسے کیسے گمراہ کن نظریات داخل کیئے اور نہ اس بحث میں پڑنا چاہتے ہیں کہ مجدّد الف ثانی ابن عربی کی تصنیفات فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے متعلق کس قدر نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ ہم سردست یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اتنے اہم اور بنیادی مسئلہ ہیں جس میں تمام دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ آیا ابن عربی کا

---

[1] ابن عربی وہ شخص ہے جس نے نظریہ وحدت الوجود کا اس حد تک پرچار کیا کہ انہیں اس نظریہ کا بانی سمجھا جاتا ہے مجدد الف ثانی نے اس نظریہ وحدت الوجود کا رد کیا اور اس کے بجائے نظریہ وحدت الشہود پیش کیا پھر مقام عبودیت تک آئے۔ اس وقت مکتوبات دفتر دوم ہمارے پاس نہیں ہے کہ دیکھا جا سکے کہ مجدد الف ثانی نے ابن عربی کا یہ قول کس حیثیت سے پیش کیا ہے۔ غالب خیال یہی ہے کہ یہ قول پیش کر کے ابن عربی کی تردید ہی کی ہوگی۔ بہرصورت یہ قول چونکہ قرآن وسنت کے خلاف ہے لہٰذا مردود ہے۔

یہ قول بطورِ حجت یا استشہاد پیش کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیئے موصوف نے کچھ نقلی دلائل بھی دیتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ "حوّا بھی بشیر ہیں لیکن آپ (یعنی آدمؑ) ان کے باپ نہیں" (ب ص۱۶ کا حاشیہ)

اب دیکھیے کہ حضرت آدمؑ اور حوّا دونوں کی پیدائش عام ضابطہ الٰہی کے مطابق نہیں۔ دونوں خرقِ عادت کے طور پر وجود میں آئے اور خرقِ عادت امور سے منطقی طور پر..... نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس قسم کی دلیل کی تردید آپ نے بھی خود ہی اسی مقام پر فرمادی ہے چنانچہ لکھتے ہیں "کہ حدیث نبوی کے مطابق تمام آدم کی بیٹیوں پر حیض لازم ہے اور حیض حضرت حوّا کو بھی آیا ہے۔ حالانکہ وہ آدم کی بیٹی نہ تھیں" اور اس کی وجہ بیان فرمانے کے بجائے یہ کہہ دیا کہ "ایسے مواقع ذی علموں کے لیئے باعثِ مزلّت نہ ہوں" (ب ص۱۱ کا حاشیہ)

گویا آپ کی اس دلیل — کہ آدم ابوالبشر نہیں ہو سکتے کیونکہ حوّا بھی بشر ہے۔ لیکن آپ اس کے باپ نہیں — کا جواب صرف اتنا ہی ہے کہ "ایسے مواقع ذی علموں کے لیئے باعثِ مزلّت نہ ہوں" کیونکہ خرقِ عادت امور سے منطقی نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوتا۔

۴۔ ابُوالبشر ہونے سے انکار کی دُوسری عقلی دلیل آپ نے یہ دی ہے کہ حضرت آدمؑ کو اگر ابُوالبشر کہہ بھی دیا جائے تو یہ نسبت مجازی ہے حقیقی نہیں۔ اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے "ہر رسول مسلمانوں کا باپ کہلاتا ہے مگر وُہ اپنے ماں باپ اور بیویوں کا باپ نہیں" (حوالہ ایضاً)۔ گویا جس طرح ہر رسول مسلمانوں کا باپ کہلاتا ہے مگر حقیقتاً وُہ اپنے ماں باپ یا بیویوں کا تو کیا ذکر کسی کا بھی باپ نہیں ہوتا۔ اسی طرح آدمؑ کو اگر ابوالبشر کہہ بھی دیا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ حقیقتاً تو وُہ بھی ہر بشر کے باپ نہیں اور یہ نسبت مجازی ہے۔

حافظ صاحب کی اس مجازی نسبت کی دلیل غالباً قرآن کی یہ آیت ہے وازواجہ امھٰتھم (۳۳/۶) اور نبی کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

اب یہ نسبت محض احترام کے لحاظ سے ہے حقوق و واجبات کے لحاظ سے نہیں۔ پھر اس مجازی نسبت پر یہ بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر نبی کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں تو نبی خود بھی احترام کے لحاظ سے مسلمانوں کا باپ ہُوا۔

لیکن مجاز مجاز ہے اور حقیقت حقیقت۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود محمد رسول اللہؐ جو "افضل الرسل والانبیاء" ہیں وُہ بھی حقیقتاً کسی کے باپ نہیں! ارشادِ باری ہے:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ	محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ بلکہ

رَسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (۳۳/۴۰)	اللہ کے رسُول اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ابوالبشر میں باپ ہونے کی نسبت حقیقی ہے یا مجازی؟ قرآن اس نسبت کو حقیقی قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری ہے۔

یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً (۴/۱)	اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک شخص (آدمؑ) سے پیدا کیا۔ پھر اس آدم سے اسکی بیوی پیدا کی۔ پھر ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں (روئے زمین پر) پھیلا دیں۔

اس آیت سے درج ذیل امور کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) ایہاالناس کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں جو ایک شخص (آدم) سے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا ابوالبشر کی نسبت مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ آپ فی الواقعہ سب مردوں اور عورتوں کے باپ ہیں۔

(۲) حوّا بھی اسی شخص آدمؑ سے پیدا ہوئی لیکن وُہ اس کی ولیدہ نہیں بلکہ اس کی زوج یا بیوی ہے۔ کیونکہ اس کی پیدائش عام ضابطہ الٰہی کے مطابق یعنی حمل و وضع کے طور پر نہیں ہوئی بلکہ جس طرح آدمؑ خرقِ عادت طور پر پیدا ہوئے اسی طرح حوّا بھی خرق عادت طور پر پیدا ہوئی۔ جس طرح آدمؑ حقیقی طور پر ابوالبشر ہیں اسی طرح حوّا حقیقی طور پر اُمّ البشر ہیں کیونکہ تمام بنی نوع انسان انہیں دونوں سے پیدا ہو کر پھیلی ہے۔

(۳) جس طرح آدم حوّا کا باپ نہ ہونے کے باوجود بھی حقیقی طور پر ابوالبشر ہیں اسی طرح حوّا آدمؑ کی ماں نہ ہونے کے باوجود بھی اُمّ البشر ہیں۔ حالانکہ آدم بھی بشر تھے۔ خرق عادت امور سے منطقی نتیجہ حاصل کرنا درست نہیں ہوتا۔ یہ اثری صاحب یا ان جیسے لوگوں کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

۵۔ حدیث متعلقہ تخلیق آدم:

اب رہی ترمذی کی یہ حدیث کہ "تمام انسان آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے تھے" تو آپ چونکہ اہلحدیث ہیں لہٰذا اس حدیث کا جواب دینا بھی ضروری سمجھا۔ اس کا جو جواب آپ نے دیا ہے وہ یہ ہے :۔

"مذکورہ حوالہ جات (یعنی قرآن میں بنی آدم اور حدیث میں بنو آدم) میں اولاد کا ذکر نہیں اور نہ ہی بنات کا ذکر ہے۔ جس طرح تغلیباً اسی میں شامل ہیں۔ اسی طرح یہ تمام انسان اس میں شامل ہیں کیونکہ جنس ایک ہے"۔ (الفیلیص ۱۹)

اس جواب سے کیا سمجھے آپ؟ کیا اولاد یا لڑکیاں بنو یا بنی میں شامل نہیں ہوتے؟ پھر آپ کی تغلیباً

اور "جنس ایک" کی فلسفیانہ موشگافیاں دیکھ کر یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اپنے نظریہ کی خود تردید: یہ سب دلائل تو آپ نے عقل پرستوں کی ہمنوائی میں دے دیئے لیکن ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ان دلائل سے پیشتر آپ ہی یہ بیان بھی دے رہے ہیں کہ:

"آدم کی پیدائش کا ذکر قرآن میں مفصل طور پر موجود ہے۔ آپ سے پیشتر کوئی انسان دُنیا میں پیدا نہیں ہُوا آپ کی پیدائش سب انسانوں سے پہلے ہُوئی۔" (ب ص ۱۶، ۱۷)

پھر اس کی مزید تشریح عیون زمزم کے ص ۸۹ پر جواب نمبر ۲ کے تحت یُوں فرمائی کہ:۔

"آدمؑ پہلا پیدا شدہ انسان) کے لیئے اتنا تکلّف کچھ بھی بیان نہ ہوتا تو وُہ بے مادر و پدر پیدا شدہ تسلیم ہوتا نہ صرف وُہ بلکہ تمام انسان جو ابتداء میں پیدا ہُوئے بلکہ تمام حیوانات چرند، پرند اور درند اور سب حشرات الارض ابتدا میں بے مادر پدر پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی تسلیم مجمل ہو یا کہ مفصل بیان پر موقوف نہیں کہ سلسلہ کی ابتدا اس کے سوا ممکن ہی نہیں۔" (ع ص ۸۹ - ۹۰)

اس اقتباس میں آپ نے:۔

(۱) صرف آدمؑ کو ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے انسانوں کو بے مادر و پدر تسلیم کر لیا ہے اور یہ سب ابتداء ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

(۲) اس ابتدائی مخلوق یعنی آدم یا دوسرے انسان یا حیوانات کو بے مادر و پدر تسلیم کرنا اس لیئے ضروری نہیں کہ قرآن نے آدمؑ کو بے مادر و پدر بتلایا ہے بلکہ اس لیئے تسلیم کرنا ضروری ہے کہ عقلی لحاظ سے سلسلہ کی ابتداء اس کے سوا ممکن ہی نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اثری صاحب حضرت آدم کو فی الواقعہ ابوالبشر سمجھتے ہیں یا نہیں؟ تو یہ بات سمجھنے سے ہم تو قاصر ہی رہے شاید آپ کچھ سمجھ سکیں۔

---

(۲) حضرت حوّا کی پیدائش

قرآن میں اکثر مقامات پر جہاں آدم کی پیدائش کا ذکر آیا ہے وہاں ساتھ ہی حوّا کی پیدائش کا بھی ذکر آیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہم سورۂ نساء کی پہلی آیت درج کر کے اس پر تبصرہ پیش کر چکے ہیں۔

پسلی سے پیدائش کا انکار: یہ آیت اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہے کہ حوّا آدم کے جسم سے پیدا ہوئی تھیں پھر احادیث اس کی وضاحت یوں کرتی ہیں کہ حوّا کی پیدائش آدمؑ کی پسلی سے ہوئی لیکن یہ بات چونکہ خرقِ عادت ہے۔ لہٰذا حافظ صاحب کو کیونکر گوارا ہو سکتی تھی۔ تاہم آپ کو ان آیات یا احادیث میں تاویل کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ صرف چند الفاظ کے اضافہ یا تھوڑے سے ہیر پھیر نے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔

مثلاً جن آیات میں "خلق منها زوجها" یا "جعل منها زوجها" کے الفاظ آئے ہیں تو آپ نے منہا کے معنی اس جان کے بجائے "اسی کی جنس سے" کر دیئے ہیں۔ (ص ۲۹) یعنی حوّا آدم کی جنس ہی میں سے تھی کسی دوسری جنس یعنی گھوڑے، گائے یا بندر کی جنس سے نہ تھی۔

اور بخاری میں جو حدیث مرفوعاً آئی ہے وہ درج ذیل ہے:۔

اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ الشَّيْءِ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب خلق آدم وذریتہ)	عورتوں سے اچھا سلوک کیا کرو۔ کیونکہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی اور پسلی کا اوپر کا حصہ بہت ٹیڑھا ہوتا ہے اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے تو اسے توڑ دے گا اور اگر اسے یونہی چھوڑ دے گا تو وہ ٹیڑھا ہی رہے گا۔

اس حدیث کے متعلق آپ فرماتے ہیں:۔

"عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے یعنی پسلی کی طرح ٹیڑھی پیدا کی گئی ہے (ص۳۰) حاشیہ میں مزید وضاحت یہ ہے کہ اس میں عورت کے مزاج کی طرف اشارہ ہے کہ طبعی طور پر آپ کے مزاج کا رنگ ڈھنگ بدلتا رہتا ہے۔" (ص ۳۰)

چلیئے حوّا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونے کا قصہ ہی پاک ہوا۔ مگر یہ خیال فرمایئے کہ

(۱) امام بخاری اس حدیث کو کتاب الانبیاء میں لائے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم محض فردِ واحد ہی نہیں بلکہ نبی بھی تھے۔

(۲) پھر یہ حدیث باب خلق آدم و ذریتہ میں لائے ہیں جس کا صاف مطلب ہے کہ اس حدیث میں حوّا کی پسلی سے تخلیق ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ حوّا بھی المراۃ کے زمرہ سے خارج نہیں نیز ضلع کے معنی پسلی ہوتا ہے۔" پسلی کیطرح ٹیڑھا نہیں ہوتا۔

(۳) اس حدیث میں حوّا کے بجائے مرأۃ کا لفظ اس لیئے آیا ہے کہ پہلے استوصوا بالنساء کے الفاظ آئے ہیں اور حوّا بھی ایک عورت ہے۔

پھر اسی حدیث کے حاشیہ میں شرح خیر الجاری کے حوالہ سے دو باتوں کا مزید ذکر آیا ہے (۱) انها خلقت من الّذی فی اعلی الضلوع۔ یعنی وُہ اُوپر کے حصّہ کی پسلیوں سے پیدا کی گئی (۲) انّ حوا خلقت من ضلع ادم الایسر یعنی حوّا آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی۔

اثری صاحب کے دلائل: (۱) "پیدائش (بائیبل) میں ایسا ہی بیان ہوا ہے جہاں سے ہمارے مفسّرین نے لے کر تفاسیر میں درج کر لیا ہے" (ب صفہ ۳۰)

اب دیکھئے کہ ہم نے جو حدیث درج کی ہے وہ بخاری کی ہے۔ اور اثری صاحب نے خود مسلم کا حوالہ دیا ہے اور یہ احادیث بھی مرفوع (نبی رسول اللہ کا اپنا) قول ہے۔ اب ان احادیث کی موجودگی میں اس سے بڑا کیا جھوٹ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مفسرین نے یہ بات بائبل سے لے کر تفسیر میں درج کر دی۔ کیا بخاری و مسلم بائیبل کی کتابیں ہیں؟

(۲) فرماتے ہیں کہ جس طرح جعل لکم من انفسکم ازواجاً (۱۶/۷۲) اور خلق لکم من انفسکم ازواجاً (۳۰/۲۱) میں من انفسکم سے مراد تمہاری جنس ہے۔ جس سے بیویاں پیدا کیں اسی طرح خلق منها سے مراد نفس واحدۃ (آدم) نہیں بلکہ تمہاری جنس ہے۔ (ب ۳۰ کا ملخص)

اس دلیل کی کمزوری بالکل واضح ہے۔ من انفسکم جمع کا صیغہ ہے جس سے کثرت یا جنس مراد لی جا سکتی ہے مگر نفس واحدۃ جو ایک ہی تھا اور سب سے پہلا بھی اس سے جنس کیسے مُراد ہو سکتی ہے؟ آدمؑ کے علاوہ اور کون تھا کہ اُسے آدم کی جنس قرار دیا جاسکے۔ تاہم حافظ صاحب نے "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" اس کو بھی بطور دلیل درج فرما دیا۔

(۳) جس طرح قرآن میں خلقکم من ضعف (۳۰/۵۴) یا خلق الانسان ضعیفا (۴/۲۸) یا خُلق الانسان من عجلٍ (۲۱/۳۷) اور کان الانسان عجولاً (۱۷/۱۱) کا یہ مطلب نہیں کہ انسان فی الواقع کمزوری یا جلدی سے پیدا کیا گیا ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ وُہ کمزور اور جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح خلِقتَ مِن ضِلعٍ سے مُراد یہ نہیں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ پسلی کی طرح ٹیڑھی پیدا کی گئی ہے (ب ۳۱ کا ملخص)

اب دیکھئے یہاں حافظ صاحب نے خلقکم من تراب ثم من نطفۃ کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ مٹی نُطفہ اور اسی طرح پسلی سب مادی چیزیں ہیں جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر کمزوری اور جلد بازی غیر مادی چیزیں

اور اوصاف ہیں جو غیر مرئی ہیں۔ آپ دلائل تو اوصاف کے دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ مادی اشیاء پر فٹ کرنا چاہتے ہیں یہ کہاں کا دستور ہے ؟

اثری صاحب کے انکار کی توجیہہ ۲ : اثری صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ حوّا آدم سے پیدا نہیں ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کیسے پیدا ہوئی ؟ تو اس کی ایک توجیہہ تو آپ نے یہ بیان فرمائی کہ وہ اس آدم کی جنس سے پیدا ہوئی۔ جنس اس وقت موجود ہو یا نہ ہو۔ بہرحال اثری صاحب حوّا کو اس آدم کی جنس سے پیدا فرما رہے ہیں۔ اس پر ایک اور سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر اسکی پیدائش کی ابتداء کہاں سے ہوئی ؟ جس کا آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اور دوسری توجیہہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ حوّا بھی اسی کیچڑ سے پیدا ہوئی جس کیچڑ سے خدا نے آدم کو بنایا تھا۔ چنانچہ آپ عیون زمزم کے صـ۸۸ پر ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ :-

”حافظ ابن کثیرؒ نے سورہ مریم کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ نے انسانوں کو چار طرح پر پیدا کیا ہے :-
(۱) زوجین سے (۲) زوجین کے بغیر جیسے آدمؑ (۳) صرف نر سے جیسے حوّا آدم سے پیدا کی (۴) صرف مادہ سے جیسے عیسیٰؑ کو مریم سے پیدا فرمایا۔“ (ع صـ۸۸)

اثری صاحب اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ ” (۱) وقوع میں آیا ہے (۲) انسان کی ابتدائی پیدائش ہے جس کے سوا اور کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں۔ جنس انسان کی پیدائش کیچڑ گارے جیسی مٹی سے ہوئی ہے اور ۳ (یعنی حوّا کی پیدائش) میرے نزدیک ۲ میں داخل ہے۔“ (ص ۸۹)

اب ذرا قرآن کے الفاظ پھر سامنے لائیے۔

خلقکم من نفسٍ واحدۃ وخلق منہا زوجہا ؕ اللہ نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے اور اس ایک جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا۔

اب دیکھئے کہ منہا میں ھا کی ضمیر نفسِ واحدۃ کی طرف مڑتی ہے لیکن حافظ صاحب اس ھا کی ضمیر کو کیچڑ، گارے مٹی کی طرف پھیر رہے ہیں۔ کیا اس آیت کے آس پاس یا آگے پیچھے آپ کو تراب۔ طین۔ صلصال۔ حمأ مسنون یا فخار جیسا کوئی لفظ نظر آتا ہے کہ ہم حافظ صاحب کی اس توجیہہ کو درست قرار دے سکیں؟

اور حدیث کے الفاظ بھی سامنے لائیے :-

النّاس کلھم بنو آدم و آدم مِن تراب (ترمذی مرفوعًا) اس حدیث میں خلق آدم وحوّا من تراب نہیں فرمایا۔ بلکہ صرف خلق آدم من تراب فرمایا ہے جس سے اثری صاحب کے اس نظریہ کی کہ ” حوّا بھی اسی کیچڑ سے پیدا ہوئی جس سے آدم پیدا ہوئے“ کی تردید ہو جاتی ہے۔

۳۔ قصۂ ہابیل وقابیل

حقیقی بہن بھائیوں کی شادی: اِس قصّہ میں حافظ صاحب نے عام مفسّرین کی روش کے خلاف یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آدمؑ کی اولاد میں حقیقی بہن بھائیوں کے نکاح کا تصور غلط ہے کیونکہ ہماری شریعت میں ایسا رشتہ حرام ہے اور سورۂ نساء کے جس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے محرمات کا ذکر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی یہ فرما دیا ہے کہ

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (۴/۲۶)	اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے لوگ کرتے تھے۔

لیکن حافظ صاحب اس آیت کا ترجمہ یُوں کرتے ہیں کہ "میں اس فہرست کی گزشتہ انبیائے کرام اور انکے خدّام صلحاء عظام سے بھی اپنے اپنے وقتوں میں پابندی کراتا آیا ہوں اور آج میں تمہیں بھی ان ہدایات کا پابند ٹھہراتا ہوں"۔ (ب م ص۲۸)

اب دیکھئے (۱) سنن الذین کا معنی "ان لوگوں کے طریقے" ہے نہ کہ "اللہ تعالیٰ کی فہرست"۔ لہٰذا اس آیت سے وہ مفہوم نہیں نکلتا جو آپ لینا چاہتے ہیں۔

(۲) تمام انبیاء کی شریعت میں اس دَور کے تقاضوں کے مطابق ردّوبدل ہوتا رہا ہے جیسا کہ بخاری کتاب الانبیاء میں کئی احادیث سے ثابت ہے اور اس کی مثالیں بھی بہت پیش کی جا سکتی ہیں جسب حال مثال یہ ہے کہ سابقہ ادوار میں مال غنیمت اکٹھا کیا جاتا۔ پھر آسمان سے آگ آتی اور اُسے کھا جاتی۔ ان لوگوں کے لیئے مالِ غنیمت حلال نہیں تھا مگر امتِ محمدیہ کے لیئے حلال قرار دیا گیا دُوسری حسب حال مثال یہ ہے کہ سابقہ شریعتوں میں ایک شخص کے ہاں دو حقیقی بہنوں کا نکاح میں ہونا جائز تھا اور شریعت میں یہ پابندی مُوسیٰ علیہ السّلام کے دَور میں لگائی گئی اور تورات میں حقیقی بہنوں کا نکاح ناجائز قرار دیا گیا بلکہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری سورۂ یوسف کی تفسیر الجمال والکمال کے ص۱۹۶ پر یُوں رقمطراز ہیں کہ "موسیٰ علیہ السّلام کے عہد تک کوئی شریعت نازل نہ ہوئی تھی۔ جس میں تفصیلی احکام ہوں۔ اوّلین شریعت جو دُنیا میں پائی جاتی ہے وُہ مُوسیٰ علیہ السّلام کی شریعت ہے۔ عہدِ مُوسیٰ سے پہلے کئی ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن کا وجود نزول شریعت کے بعد اُٹھ گیا ہے مثلاً نکاح واحد میں دو بہنوں کا وقتِ واحد میں پایا جانا تورات میں منع ہے مگر یعقوبؑ کے گھر میں راحیل اور لیاہ دونوں خواہرانِ حقیقی موجود تھیں..... پھر قاضی صاحب موصوف نے ان

دونوں بہنوں کی اولاد بھی لکھی ہے کہ لیاہ سے چھ لڑکے ہوئے روبن۔ سمعون۔ لاوی۔ یہوداہ۔ اشکار زبلون اور راخیل سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ یوسفؑ اور بنیامین۔ (حوالہ ایضاً ص۱۹۹۔ ص۲)

علاوہ ازیں ابوہریرہؓ سے مرفوعاً بخاری ومسلم دونوں میں مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

الانبیاء اخوۃ العلات امھاتھم شتی ودینھم واحد (بخاری۔ کتاب الانبیاء)	تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں کہ ان کی مائیں (شریعتیں) تو الگ الگ ہیں لیکن ان کا دین (باپ) ایک ہے۔

اندریں صورت اثری صاحب کی مندرجہ بالا آیت کی تشریح یعنی شریعت محمدی کو شریعت آدم پر فٹ کرنا عقل ونقل دونوں طرح سے غلط ہے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ حافظ صاحب حضرت آدمؑ کو ابوالبشر تو مانتے نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق تو حضرت آدمؑ کے دور میں لاکھوں اور بھی انسان موجود تھے مگر ایسے "عقل پرستوں" کی قلیل تعداد کے علاوہ بنی نوع انسان کی اکثریت تو انہیں ابوالبشر ہی مانتی رہی ہے اور حضرت حواؑ کو ان کی پسلی سے پیدا ہونا تسلیم کرتی ہے پھر اس جوڑے سے جو اولاد پیدا ہوئی۔ ان کی شادی کی وہی صورت ممکن ہے جو مفسرین بیان کرتے ہیں اور وقت کے تقاضا کے مطابق شریعت ہونی بھی یہی چاہیئے تھی۔ جیسا کہ اثری صاحب کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ آدم کی بے مادر و پدر پیدائش کے علاوہ کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہ تھی۔

اب یہ عقل پرست بشمول حافظ صاحب اکثر یہ ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ ہمارے مفسرین نے اسرائیلیات سے روایات شامل کر دی ہیں۔ بلاشبہ تورات میں تحریف ہوئی ہے لیکن زیادہ تر احکام میں جنہیں انہیں تحریف کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ انہیں آدمؑ کے دور کی تاریخ میں ایسے ردّ و بدل کی کیا ضرورت تھی؟ آج بھی بہت سی ایسی باتیں تورات میں ملتی ہیں جو قرآن کریم سے پوری مطابقت رکھتی ہیں۔ لہٰذا توریت کے سارے مجموعے کو یکسر غلط قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ ہمارے خیال میں اسرائیلیات کی کوئی بھی روایت جو کتاب وسنت کے منافی نہ ہو کے لینے میں کوئی حرج نہیں اور اس کی دلیل بخاری کتاب الانبیاء کی درج ذیل حدیث ہے:

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَلَا حَرَجَ (بخاری۔ کتاب الانبیاء)	اگر تمہیں مجھ سے ایک حدیث بھی معلوم ہو تو اُسے آگے آگے پہنچا دو اور بنی اسرائیل سے روایت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لہ اگرچہ کسی دوسرے مقام پر ضرورت پڑنے پر مان بھی لیتے ہیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

قربانی اور آگ: ہابیل اور قابیل کے واقعہ میں دُوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہابیل اور قابیل دونوں نے قربانی دی۔ ہابیل کی قربانی منظور ہو گئی لیکن قابیل کی مردود ہُوئی۔ اور اس کی صورت آپ یہ بتلاتے ہیں کہ "وقت کے خلیفہ یا نبیؑ نے ایک (ہابیل) کے صدقہ وخیرات کو قبول کیا اور دُوسرے (قابیل) کے صدقہ وخیرات کو مسترد کر دیا۔" (ص ۵۰)

قُربانی یا صدقہ وخیرات: حالانکہ اس دَور کی شریعت کے مطابق یہ دستور تھا کہ جس کی قربانی منظور ہوتی۔ آسمان سے آگ اُترتی اور اسے کھا جاتی اور جس کی نامنظور ہوتی وُہ یونہی پڑی رہتی اور یہی کچھ مفسّرین نے لکھا ہے اور اس کی دلیل درج ذیل آیت ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (۳/۱۸۳)

جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم سے عہد کیا ہے کہ جب تک کوئی پیغمبر ہمارے پاس ایسی قربانی لے کر نہ آئے جسکو آگ آکر کھا جائے تب تک ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے کئی پیغمبر تمہارے پاس کھُلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی جو تم کہہ رہے ہو پھر اگر تم سچے ہو تو اُن کو قتل کیوں کیا؟

آگ کا آسمانوں سے اُتر کر قربانی کو کھانا ایک خرقِ عادت امر ہے اور معجزہ بھی جسے حافظ صاحب تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ لہٰذا قربانی کی مقبولیت اور ردّ کا طریقہ ہی کچھ اَور بیان کر دیا۔ "قربًا قربانًا" میں قربانی کے لفظ کے آگے بریکٹوں میں (صدقہ وخیرات) لکھ کر اگلی تمام بحث قربانی کے بجائے صدقہ وخیرات پر شروع کر دی ہے کہ صدقہ وخیرات کے قبول وردّ کا یہ طریقہ ہوتا ہے (ص ۵۰)

قتل کی وجہ: مفسّرین نے یہ بتلائی ہے[1] کہ آدمؑ کے ہاں بیک وقت ایک جوڑا (یعنی لڑکا اور لڑکی) پیدا ہوتا تھا۔ اور دستور یہ تھا کہ ایک وقت کے لڑکے کی شادی دُوسرے وقت کی لڑکی سے ہو۔ ہابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی۔ وُہ معمولی شکل وصُورت کی تھی اور قابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ خوب صُورت تھی۔ اب دستور کے مطابق اس خوبصُورت لڑکی کی شادی تو ہابیل سے اور معمولی شکل والی لڑکی کی شادی قابیل سے ہونا چاہیئے تھی لیکن قابیل کو یہ بات گوارا نہ تھی۔ اور اس نے تنازعہ کھڑا کر دیا وُہ

---

[1] عن ابن جریر، عن ابن مسعود عن ناس من الصحابہ انہٗ کان لا یولدُ لآدم الا وَلَدٌ معہٗ جاریۃٌ .... (درمنثور ج ۲ ص ۲۷۳) مطبوعہ دار المعرفت بیروت، نیز تفسیر ابن کثیر عبداللہ ابن مسعود اور دوسرے بہت سے صحابہ سے یہی روایت مذکور ہے۔ زیرِ آیت واتل علیھم نبا ابنی آدم..... الآیۃ۔

اس خوب صورت لڑکی سے ہی شادی کرے گا۔ ان کے باپ آدمؑ نے یہ تجویز پیش کی کہ دونوں اللہ کے حضور قربانی پیش کریں۔ جس کی قربانی منظور ہو جائے۔ سمجھ لینا کہ اللہ کی طرف سے یہی فیصلہ ہے پھر جب قربانی بھی ہابیل ہی کی منظور ہوئی تو قابیل پہلے سے زیادہ پیچ پا ہو گیا اور ہابیل کے قتل پر اُتر آیا۔ کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ پھر میرے لئے میدان صاف ہے۔ اس وجہ میں تو کچھ معقولیت نظر آتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ دنیا میں سب جھگڑے زر، زن اور زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب حافظ صاحب اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ "قابیل نے اس خیال کے پیش نظر کہ ہابیل نے میری شکایت صدقہ وصول کرنیوالے سے کی ہے اور اسی وجہ سے میرا صدقہ (قربانی نہیں بلکہ صدقہ) مسترد ہوا ہے۔ ہابیل کو قتل کرنے کی دھمکی دے دی"۔ (ص ۵۰)

پھر آگے چل کر مزید تشریح فرماتے ہیں:۔

"جب اس آدم زادہ (قابیل) کو معلوم ہوا کہ میری قربانی مسترد ہے تو اسے شبہ ہوا کہ میرے فلاں بھائی نے میرے خلاف صدقہ وصول کرنے والے صاحب کو ضرور کوئی رپورٹ کی ہے کہ "اس نے حرام مال جمع کیا ہے۔ وہ رشوت خور احسان جتانے والا ہے۔ ایذا دینے والا ہے۔ ناگواری اور بے دلی سے ردّی قسم کا مال لایا ہے وغیرہ وغیرہ جس کی وجہ سے صدقہ مسترد کر دیا گیا"۔ (ص ۵۴)

اب سوال یہ ہے کہ قربانی پیش کرنے سے پہلے کیا ہابیل کو علم تھا کہ قابیل ردّی قسم کی قربانی پیش کریگا؛ جس کی رپورٹ ہابیل نے پہلے صدقہ وصول کرنیوالے کو پہنچا دی۔ اور دُوسرا سوال یہ ہے کہ ہابیل کے متعلق قابیل کا یہ شبہ یا خیال، جس کی تصدیق نہ عامل سے کی گئی نہ کسی دُوسرے شخص یا گواہ سے، کیا ایسا جرم ہے جس کی بنا پر ایک شخص دُوسرے کو قتل کرنے پر اُتر آئے؟

مقتول کی لاش: پھر حافظ صاحب اس نامعقول سی وجہ قتل کو معقول بنانے کے لیئے ایک اور نکتہ بھی پیدا کرتے ہیں وہ یہ کہ آپ سُوْءَۃَ کے معروف معنوں سے ہٹ کر اس کا معنیٰ "عیب اور بُرائی" سے کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن میں دُوسرے مقام پر سوءۃ کے معنی شرمگاہ جو آیا ہے تو وُہ کنایتہً ہے اور اس کا معنیٰ لاش درست نہیں۔ اب قتل کے بعد قصہ یہ ہُوا کہ قابیل کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس لاش کو کیسے ٹھکانے لگائے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا پھر اس میں ایک مُردہ کوّے کی لاش رکھ کر اُوپر سے پھر مٹی ڈال کر دبا دیا۔ یہ گویا قابیل کے لیئے سبق تھا کہ وُہ بھی اپنے بھائی کی لاش کو ایسے ہی دفن کرے۔ کوّے کا یہ فعل دیکھ کر اُسے افسوس ہُوا کہ مجھ میں اس کوّے جتنی بھی عقل نہیں کہ میں لاش کو یُوں دفن کر دیتا۔ قتل کے ارتکاب سے اپنی حماقت پر پریشان تو پہلے ہی تھا۔ اب اپنی ایسی کم عقلی پر اور بھی

شرمسار ہو گیا۔

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر اولادِ آدم سے نہ ہی کوئی طبعی موت مرا تھا اور نہ ہی کوئی قتل کا واقعہ پیش آیا تھا۔ یعنی انسان نے ہنوز میت کو دفن کرنا نہ سیکھا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوا بھیج کر انسان کو میت دفن کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ لیکن حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوا بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح کوا اپنی زائد از ضرورت خوراک زمین میں دبا کر اس پر پردہ پوشی کر دیتا ہے۔ اسی طرح قابیل کو بھی چاہیئے تھا کہ وہ اپنے عیب اور برائی کو (یعنی ہابیل کے متعلق بدگمانی کو) اپنے دل میں دبائے رکھتا اپنے اس عیب پر پردہ پوشی کرتا اور ہابیل کو قتل نہ کرتا۔ گویا حافظ صاحب کی تاویل کے مطابق اس قتل کی واردات یوں ہوئی کہ

زمانۂ قتل: (۱) ابنی آدم میں آدم سے مراد وہ نہیں جو ابوالبشر آدم علیہ السلام ہیں بلکہ یہ کوئی اور آدم نامی آدمی ہے جو بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس قصہ کے اختتام پر ارشاد باری ہے کہ :۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲)	اس قتل کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل نازل کیا کہ جو شخص کسی کو ناحق بغیر جان کے یا زمین میں فساد مچانے کی غرض سے قتل کرے گا تو اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا۔

اب دیکھئے کہ اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ اس قصۂ قتل سے پہلے بھی قرآن میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ اور قصہ کے بعد بھی۔ درمیان میں اس قصۂ قتل کو بیان کرنے کی حکمت یہ تھی کہ جیسے قابیل اپنے ایک نیک اور پرہیزگار بھائی کے بلاوجہ قتل کا مرتکب ہوا۔ ایسے ہی بنی اسرائیل بھی شقی القلب تھے۔ پرہیزگار لوگوں حتیٰ کہ انبیاء کو بلاوجہ قتل کرنے کے عادی تھے۔

قابیل کے قتل کرنے کا واقعہ چونکہ ان کے حسب حال تھا۔ لہٰذا اللہ نے یہ قصہ بیان کر کے انہیں یہ حکم سنا دیا۔ لیکن حافظ صاحب اسے صرف اس لیئے دورِ بنی اسرائیل کا واقعہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بہن بھائی کی شادی کی جو اضطراری ضرورت بیان کی جاتی ہے۔ وہ ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اب ایک مشکل باقی تھی کہ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، احمد، ابن جریر، ابن منذر کے حوالہ سے درِ منثور میں عبداللہ بن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے کہ :۔

لا تقتل نفسٌ ظلمًا الّا کان علی ابن اٰدم الاوّل	کوئی بھی شخص جو ظلم سے قتل کرتا ہے تو اس کے گناہ کا

كِفْلٌ من دمها لأنه اول من سنّ القتل۔ (بخاری، کتاب الانبیاء)	حصہ آدمؑ کے اس پہلے بیٹے پر بھی پڑتا ہے، جس نے قتل کا دستور نکالا۔

اس کا حل اثری صاحب نے یہ سوچا کہ ترجمہ کے بجائے حاصل مطلب بیان کر دو اور اس میں سے ابن آدم الاوّل کا ترجمہ چھوڑ دو۔ چنانچہ آپ نے مذکورہ حدیث کا مطلب یوں بیان فرمایا کہ:

"اس قوم یا اس علاقہ میں اس کے بعد جس قدر بھی قتل ہوئے ہوں ان سب کا وبال اس آدم زادے پر بھی ہوا ہے کہ اس نے اپنے پچھلوں کے لیئے یہ بدتر نمونہ چھوڑا ہے۔" (ب ص ۶۱)

(۲)۔ پھر فرماتے ہیں۔ ابنی آدم میں ابنی سے آدم کے صلبی بیٹے یا حقیقی بھائی مُراد نہیں بلکہ جس طرح پر سب بنی نوعِ انسان یا بنو آدم بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح کے وہ بھی بھائی تھے اور چونکہ یہ بنو اسرائیل کا زمانہ تھا۔ لہٰذا یوں سمجھ لیجئے ایک آدم زاد تو مصر میں رہتا تھا اور دُوسرا آدم زاد اس کا بھائی کنعان میں رہتا تھا۔ یا ذرا فاصلہ کم کر دیجئے اور فرض کر لیجئے ایک آدم زادہ گجرات کا تھا اور دُوسرا وزیر آباد کا۔

(۳) اب صدقہ وخیرات کا (قربانی یا زکوٰۃ کا نہیں بلکہ صدقہ وخیرات کا) وقت آجاتا ہے تو ایک آدم زاد جسے ہابیل کہہ لیجئے نے دُوسرے آدم زاد یعنی وزیر آباد والے قابیل کے متعلق اس وقت کے نبی یا محصّل زکوٰۃ کو رپورٹ کی کہ قابیل تو رشوت خوار، حرام خور ہے۔ لہٰذا اس کا صدقہ وخیرات وصول نہ کرنا۔ یہ وقت کے نبی اور محصّل کانوں کے کچے تھے جنہوں ~~~~~~~ بھی اور وہ ہابیل کی بات مان گئے۔

(۴) اب ہابیل نے صدقہ وخیرات میں بہت اچھا مال دیا جو وقت کے نبی یا عامل نے قبول کر لیا۔ مگر قابیل نے صدقہ وخیرات میں تھوڑا سا اور گھٹیا قسم کا مال دیا۔ جو نبی یا عامل نے قبول نہ کیا۔

ایک محاورہ ہے "مالِ مفت دلِ بے رحم" یعنی جو مال حرام طریقوں سے وافر مقدار میں حاصل ہوتا ہے اس کو خرچ کرنے میں انسان کو دریغ نہیں ہوتا وہ اسے کھُلے دل خرچ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے قابیل کو چاہیئے تھا کہ وُہ ہابیل سے بہتر اور زیادہ مال صدقہ وخیرات میں پیش کرتا مگر معلوم نہیں اس نے گھٹیا اور تھوڑا سا مال کیوں دیا؟ بہرحال اس نے تھوڑا اور گھٹیا ہی دیا تھا۔ اور یہ سمجھ بھی نہیں آئی کہ ہابیل کو ایک غیر متعلقہ بھائی کے ذرائع آمدن کا کیسے پتہ چل گیا؟ پھر اسے قابیل سے کیا خدا واسطے کا بیر تھا کہ اس نے نبی یا عامل کے سامنے اس کی چغلی کھائی؟

(۵) پھر یہ ہُوا کہ اس وقت کے نبی یا عامل نے فی الواقع قابیل کا صدقہ وخیرات قبول نہ کیا پہلے تو قابیل کو صرف شک تھا کہ ہابیل نے اس کی شکایت کی ہے مگر جب اس کا صدقہ وخیرات قبول نہ کیا گیا تو اب اسے یقین ہو گیا کہ ہابیل نے ضرور ایسا کیا تھا۔ لہٰذا وُہ ہابیل کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا۔ بات

اُڑتے اُڑتے ہابیل کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ تو اس نے قابیل کے سامنے بہتری صفائی پیش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہُوا۔ نتیجتاً قابیل نے اپنے آدم زاد بھائی ہابیل کو قتل کر ہی ڈالا۔

(۶) اس قتل پر نہ وقت کے نبی نے کچھ مواخذہ کیا' نہ عامل نے کچھ دلچسپی لی۔ نہ ہی کسی حکومت کا قانون حرکت میں آیا۔ حالانکہ اس دور کی تاریخ آج بھی متداول ہے۔ پھر یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ اس کا ذکر قرآن کریم نے بھی کیا۔ لیکن نہ مقتول کی لاش کا بعد میں سراغ ملتا ہے اور نہ قاتل کے سزایاب ہونے کا۔ اگر کچھ پتہ چلتا ہے تو صرف یہ کہ قاتل کو اس بات پر ندامت ہوتی ہے کہ اگر وُہ اپنے بھائی کا یہ قصور کہ اس نے عامل سے اس کی چُغلی کھائی ہے۔ اپنے سینے میں دبائے رکھتا تو بہت اچھا تھا۔ کیونکہ کوا بھی تو آخر اپنی زائد خوراک زمین میں دبا ہی دیتا ہے۔ پھر کیا وُہ اس کوّے جیسا بھی نہ تھا؟

اثری صاحب کے قصہ پر اعتراضات: اب دیکھئے حافظ صاحب کے اس قصۂ مخترعہ پر کئی عقلی اعتراضات بھی وارد ہوتے ہیں اور قرآن کی عبارت بھی بے ربط اور بے معنی بن کر رہ جاتی ہے مثلاً

(۱)۔ دو حقیقی بھائیوں میں تو کئی وجوہ کی بنا پر بنائے مخاصمت موجود ہوتی ہے۔ جن کی بنا پہ ان میں جھگڑے شدید صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور قتل تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ بنائے مخاصمت صورت نہیں بلکہ کچھ اور ہوگی مگر عام انسانوں یا بنی آدم کے درمیان بالعموم مخاصمت نہیں ہوا کرتی اور اگر ہو تو اسے بیان کرنا ضروری تھا ہے چنانچہ قرآن نے ایسی کوئی وجہ بیان نہیں فرمائی لہٰذا یہ عام بنی آدم کا ذکر نہیں بلکہ حقیقی بھائیوں کا ذکر ہی ہو سکتا ہے اور حافظ صاحب نے جو بنائے مخاصمت بیان فرمائی ہے وہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ صرف چغلی کھانے کے گمان پر اور اس الزام میں جس کی شہادت بھی مہیا نہ ہو قتل جیسے فعل کا ارتکاب ناقابل تسلیم ہے

(۲)۔ قربانا' کے معنی قربانی کے بجائے بریکٹ میں (صدقہ وخیرات) لکھ کر آئندہ سب احکام صدقہ وخیرات سے متعلق بیان کر دینا دراصل قرآن کی تحریف معنوی ہے۔

(۳)۔ ہابیل کا قتل نوعِ انسانی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا جرم تھا۔ قابیل کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ اس لاش کو کدھر کرے وہ اسے چند روز اٹھائے پھرتا رہا۔ حتّٰی کہ لاش بدبودار اور کریہہ المنظر ہو گئی جو سورۃ کا صحیح مفہوم ادا کرتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک کوّا بھیجا جو ایک مردہ کوّے کو اٹھائے ہوئے آیا۔ اسے زمین پر رکھا۔ پھر چونچ سے گڑھا کھودا پھر مُردہ کوّے کو اس میں رکھ کر اُوپر سے مٹی ڈال کر دبا دیا۔ یہ گویا ہابیل کے لیئے سبق تھا کہ وہ بھی کوّے کی طرح اپنے بھائی کی لاش کو گڑھا کھود کر زمین میں دفن کرے۔ اس واقعہ سے یہ بھی از خود ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ اسی آدم کا ہے جو ابُو البشر اور پہلے نبی ہیں۔ بنی اسرائیل کا کوئی آدم نامی شخص نہیں اگر ایسی بات ہوتی تو کسی کی کنیت ابو آدم بھی ہو سکتی تھی لیکن چونکہ بقول اثری صاحب ایسی کوئی مثال نہیں ملتی لہٰذا آدم کسی دوسرے شخص کا نام نہیں ہو سکتا (ع ص)

رہی یہ بات کہ اس کے بعد من اجل ذٰلک کتبنا علی بنی اسرائیل کے الفاظ کیوں آئے ہیں تو اس کا جواب پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ آدمؑ نے ہی اپنے بیٹوں میں مخاصمت کا یہ حل پیش کیا تھا کہ وہ دونوں اللہ کے حضور قربانی پیش کریں جس کی قربانی قبول ہو جائے یعنی جس کی قربانی کو آگ کھا جائے۔ اسی کو حق پر سمجھا جائے گا۔ پھر جب اس امتحان میں قابیل کو شکست ہوئی تو اس کی آتش انتقام اور بھی بھڑک اٹھی جس نے اسے قتل کے ارتکاب پر آمادہ کر دیا۔

(۴) **سَوْءَۃ بمعنی لاش:** حافظ صاحب کو اصرار ہے کہ سَوْءَۃ کے معنی عیب اور برائی کے ہیں۔ پھر قرآن کی دو آیات کا ذکر کیا ہے (جن میں سوءہ کا معنی فرج یا شرمگاہ کے ہیں) لیکن آپ ان کا ترجمہ بیان کرنا چھوڑ گئے ہیں پھر البدایہ والنہایہ کے حوالہ سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سوءۃ کا اصل معنی فرج یا شرمگاہ ہے پھر ہر اس چیز پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جس سے انسان کو شرم آئے (لیکن ترجمہ یہاں بھی چھوڑ دیا ہے) پھر مفردات امام راغب کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ سوءۃ کا معنی کنایۃً فرج ہے حالانکہ امام راغب نے سوءۃ اخیہ کا ذکر کرکے اس سے لاش بھی مراد لیا ہے۔ پھر مصباح المنیر کا حوالہ دیکر فرمایا ہے کہ چونکہ ننگا ہونا ہر انسان کو معیوب اور برا معلوم ہوتا ہے لہٰذا سوءۃ اخیہ کا اطلاق فرج پر کنایۃً ہے۔ (ص ۵۹)

ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ سوءۃ کے معنی کی بنیاد انسان کو معیوب اور برا لگنا ہی ہے تو کیا بگڑی ہوئی لاش انسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے اگر ایسا ہوتا تو کوئی انسان اپنے اعزہ و اقارب کی لاش کبھی دفن نہ کرتا نہ کبھی جلاتا۔ یہ تو لغوی بحث تھی۔ اب اگر سیاق وسباق اور ربط آیت کو ملحوظ رکھا جائے تو بھی عیب اور برائی کا معنی یہاں فٹ نہیں بیٹھتا۔ ایک کوا آکر ایک مادی چیز (مردہ کوے کو) دوسری مادی چیز (زمین) میں مستور کر دیتا ہے لیکن آپ فرماتے ہیں کہ مُواری کا اطلاق مادی اور غیر مادی دونوں چیزوں پر ہوتا ہے۔ یہ لغت بجا اور درست لیکن عیوب باطنی پر پردہ پوشی کرنے یا انہیں دبانے کی تلقین کرنا نبیوں اور نیک لوگوں کا کام تو ہو سکتا ہے، کوّوں کا کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا کوّے کے زمین میں لاش دبانے کے واقعہ کو اور کسی شخص کا کسی کے عیب کو اپنے اندر دبانا یا مستور رکھنے کو ایک دوسرے پر منطبق کرنا خلاف قیاس بھی ہے اور خلاف واقعہ بھی۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آخر حافظ صاحب کو آدمؑ کے بجائے کوئی آدمؑ نامی شخص بتلانے، حقیقی بھائیوں کے بجائے عام بھائی بتلانے، قربانی کو آگ کے کھانے قربانی کے بجائے، صدقہ وخیرات کے ردّ وقبول کے طریقے بیان کرنے، سوءۃ کے معنی لاش کے بجائے عیب و برائی بیان کرنے اور یواری میں سے صرف غیر مادی پہلو کو اختیار کرکے اس قصہ کو ایک نئی ترتیب سے پیش کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ ہے خرق عادت امور سے انکار۔ قربانی کو آگ کا کھانا بھی خرق عادت ہے اور آدمؑ کا بغیر ماں باپ کے پیدا ہونا بھی خرق عادت ہے۔ پھر درمیان میں بہن بھائیوں کی شادی کا ذکر بھی آگیا۔

لہٰذا اثری صاحب نے آدم تو بنی اسرائیل میں بنالیا کہ اس دور میں بہن بھائیوں کی شادی کی کوئی مجبوری بھی نہ تھی۔ البتہ بنائے مخاصمت آپ کو انوکھی تلاش کرنی پڑی۔ قربانی کو آگ کے کھانے کی بات کا یہ حل سوچا کہ اس کے بجائے صدقہ وخیرات لکھ دو اور اس طرح سب الجھنیں دور ہوگئے آدمؑ کی عصمت بیان فرمادی۔ جسے وہ بزعم خود اپنا فریضہ سمجھ رہے ہیں۔

۲۔ صالح علیہ السلام

ارشاد باری ہے :۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ هَٰذِهِۦ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ ءَايَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِىٓ أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۷/۷۳)

اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا تو صالح نے کہا کہ اے میری قوم! خدا ہی کی عبادت کرو۔ اسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک معجزہ آ چکا ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اسے آزاد چھوڑ دو کہ خدا کی زمین چرتی پھرے۔ اسے بُری نیت سے ہاتھ نہ لگانا۔ ورنہ عذاب الیم تمہیں پکڑ لیگا

دُوسرے مقام پر ہے :۔

قَالَ هَٰذِهِۦ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۲۶/۱۵۳-۱۵۴)

صالح نے کہا! یہ اونٹنی ہے، ایک معین دن اس کے پینے کی باری ہے اور ایک دن تمہاری باری ہے اور اس کو کوئی تکلیف نہ دینا ورنہ تم کو بڑا سخت عذاب آ پکڑیگا۔

تیسرے مقام پر ہے :۔

وَءَاتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْءَايَٰتِ إِلَّا تَخْوِيفًا (۱۷/۵۹)

اور ہم نے قوم ثمود کو اُونٹنی (نبوت صالح کی) کھلی نشانی کے طور پر دی تو انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم جو نشانیاں بھیجا کرتے ہیں تو ڈرانے کو۔

چوتھے مقام پر ہے :۔

إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِى وَنُذُرِ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَٰحِدَةً فَكَانُوا

(اے صالح) ہم ان کی آزمائش کیلئے اُونٹنی بھیجنے والے ہیں تو تم ان کو دیکھتے رہو اور صبر کرو اور ان کو آگاہ کر دو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے۔ ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیئے تو ان لوگوں نے

كَمَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴ : ۳۱ تا ۳۱) — اپنے رفیق کو بلایا اور اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں سو دیکھو میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔ ہم نے ان پر ایک ہی چیخ بھیجی تو وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

اور پانچویں مقام پر ہے :۔

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا (۹۱ : ۱۴) — سو قوم ثمود نے صالح کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کر کے ان کو برابر کر دیا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ :

(۱) یہ اونٹنی اللہ کی نشانی تھی جو آیت بھی تھی بیّنہ بھی اور مبصرۃ بھی۔ لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ نے ناقۃ اللہ کہہ کر اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(۲) اس اونٹنی کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا۔ اس کی پیدائش عام اونٹنیوں کی طرح نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ اونٹنی قوم ثمود کو معجزہ کے طور پر دی گئی تھی۔

(۳) یہ اونٹنی اتنا پانی پیتی تھی جتنا کہ ساری قوم اس کے جانور اونٹوں سمیت۔ لہٰذا ایک ایک دن یا ایک معین دن کی باری مقرر تھی اور اللہ کی ہدایت تھی کہ ایک دوسرے کی باری میں کوئی مداخلت نہ کرے اور نہ ہی اس اونٹنی کو کوئی تکلیف پہنچائے ورنہ ان پر سخت عذاب آئے گا۔

(۴) قوم نے اس نشانی کو جھٹلایا اور باری سے تنگ آکر اونٹنی کی رگیں کاٹ دیں تو اونٹنی ایک چیخ مار کر اسی پہاڑ میں غائب ہو گئی جہاں سے نکلی تھی البتہ قوم ثمود پر ایک سخت چیخ کا عذاب آیا جس سے وہ روندی ہوئی باڑ کی طرح ملیا میٹ ہو گئے۔

ناقۃ اللہ کی دلچسپ تفسیر :

انہی آیات کے بعد اب یہ حافظ صاحب ہی کی جسارت ہے کہ وہ فرما رہے ہیں کہ :۔

(۱) "اونٹنی کو اس طرح پیدا کرنا اللہ پاک کی قدرت کاملہ سے کچھ بعید نہیں مگر سلسلہ تناسل کے بعد جب تک نسل قائم ہے اس طرح پیدا کرنے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ قرآن حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ہے۔" (ص ۹۳)

ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر اس اونٹنی کی پیدائش عام اونٹنیوں کی طرح ہی ہوئی تھی تو کیا

ان ہزارہا اُونٹنیوں میں سے کسی اور اُونٹنی کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے ناقۃ اللہ فرمایا ہے۔ آخر اس میں کیا تخصیص تھی؟

(۲) پھر ناقۃ اللہ کی تفسیر بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہی اُونٹنی ہے اللہ تعالیٰ کی (جس پر میں وعظ کرتا ہوں) جو تمہارے لیئے دلیل ہے" (ص ۹۴)

اگر صالحؑ کے اس پر بیٹھ کر وعظ کرنے کی وجہ سے ہی وُہ ناقۃ اللہ کہلانے کی مستحق ہو گئی تھی تو حضور اکرمؐ کی اُونٹنی جس پر بیٹھ کر آپ نے حجۃ الوداع کا خطبہ بھی دیا اور سفر جہاد بھی کرتے رہے۔ زیادہ حقدار ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی ناقۃ اللہ کے لقب سے یاد فرماتے پھر کیا حضور اکرمؐ کی خچر بھی محض وعظ و تبلیغ کی بنا پر بغلۃ اللہ کہلا سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) **ناقۃ اللہ سے بائیکاٹ کی وجہ:** پھر فرماتے ہیں کہ قوم نے صالحؑ کا بھی بائیکاٹ کیا اور آپ کی اُونٹنی کا بھی لہٰذا اس کے درپے آزار ہو گئے (ص ۹۳)۔ گویا اونٹنی کی رگیں کاٹنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ آپ اس پر بیٹھ کر تقریر فرماتے تھے۔ شاید اثری صاحب کے خیال میں آپ اس کے بغیر وعظ و تبلیغ کر ہی نہ سکتے تھے۔ حالانکہ قرآن نے جو وجہ بتلائی ہے وہ یہ ہے۔ کہ پُوری قوم اس کے جانوروں جتنا پانی وُہ اکیلی پی جاتی تھی اور اسی بات کی اُنہیں تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے انہوں نے تنگ آکر اس کی رگیں کاٹی تھیں۔ کیا آپ دُنیا بھر کی تاریخ میں کوئی اور اُونٹنی ایسی بتلا سکتے ہیں جو اتنا پانی پی جاتی ہو؟ آخر یہ معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ ثمودیوں کو یہ تکلیف تھی کہ یہ اُونٹنی اتنا پانی کیوں پی جاتی ہے اور اثری صاحب کو یہ تکلیف ہے کہ اتنا پانی کیسے پی سکتی ہے؟

(۴) **ناقۃ اللہ کے معجزہ ہونے کی دلیل:** پھر اس اُونٹنی کو زخمی کرنے کے بعد قوم پر تباہی آنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ معجزہ تھا مگر جس شخص نے ہٹ دھرمی کا تہیہ کر رکھا ہو۔ قرآنی دلائل اس کے لیئے کیونکر آڑے آسکتے ہیں؟ اور قرآن و حدیث کے دلائل اُسے نظر بھی کیسے آسکتے ہیں؟

صحیح بخاری کی احادیث: گوندھا ہوا آٹا ضائع کرنے کی تحریف معنوی:

اس مقام پر اثری صاحب نے بخاری کی حدیث کو جس غلط انداز میں پیش کیا ہے پہلے ہم ان کی عبارت درج کریں گے پھر صحیح بخاری کی روایات کا ترجمہ درج کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اثری صاحب حدیث بیان کرنے میں کس قدر دیانتداری سے کام لیتے ہیں۔ بیان المختار کے صہ ۹۴ پر رقمطراز ہیں:-

"حجر جو کہ تبوک اور حجاز کے درمیان ثمودی علاقہ ہے وہاں سے جب رسول اللہ کا گزر ہوا تو جیسا کہ بخاری وغیرہ میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے' قافلہ نے وہاں پڑاؤ ڈال کر پانی بھرنا اور برتنا شروع کر دیا بلکہ آٹا بھی گوندھ لیا۔ جب آپؐ تشریف لائے تو فرمایا: پانی گرا دو اور آٹا جانوروں کو کھلا دو۔ ثمودیوں نے ہم سے ناکام بائیکاٹ کیا ہم ان سے کامیاب بائیکاٹ کرتے ہیں اور صرف اس چاہ سے جو کہ ہماری اونٹنی کا مورد و مشرب تھا' پانی بھر کر ظاہر کرو کہ آج ہم اس کے وارث اس چاہ پر ڈیرہ ڈال کر پانی بھر رہے ہیں جس سے کہ اسے روکا گیا تھا۔ کوئی ہے جو ہمیں آ کر روکے؟ (ب صـ۹۴)

اُب دیکھئے اثری صاحب اس حدیث کو بیان کرتے میں ایک ہی سانس میں تین باتیں کہہ گئے ہیں اور ظاہر یوں کیا ہے گویا یہ سب کچھ رسول اللہ کا بیان ہے۔

(۱) آپ نے فرمایا۔ "پانی گرا دو اور آٹا (جو اس پانی سے گوندھا گیا تھا) وُہ جانوروں کو کھلا دو"۔ یہ واقعی رسول اللہ کا فرمان ہے۔

(۲) ناکام اور کامیاب بائیکاٹ والی بات اثری صاحب نے خود گھڑی اور رسول اللہ کے ذمہ لگا دی۔

(۳) "پانی بھر کر ظاہر کرو کہ ہم اس کے وارث اس چاہ پر ڈیرہ ڈال کر پانی بھر رہے ہیں........ کوئی ہے جو ہمیں روکے"۔ یہ اثری صاحب کا کلام رسول اللہ کے فرمان کی تردید کر رہا ہے اور اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اثری صاحب کے حواس ٹھکانے نہیں رہے جو پہلی بات کی خود ہی تردید کر رہے ہیں۔

اِس سلسلہ میں بخاری کتاب الانبیاء میں چار احادیث آئی ہیں۔ ان میں یہ ذکر ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ "یہاں سے جو پانی استعمال کے لیئے لیا گیا ہے سب گرا دو۔ اور وہ آٹا بھی جو اس پانی سے گوندھا گیا۔ سب جانوروں کو کھلا دو"۔ اور دو میں یہ ذکر ہے کہ جب آپ حجر کے مقام سے گزرے تو فرمایا کہ ان مساکن میں مت داخل ہو مگر روتے ہوئے ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی عذاب آ پہنچے جو ان لوگوں کو پہنچا تھا"۔ پھر آپ نے جلد وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا"۔

اب ان احادیث کو سامنے رکھ کر اثری صاحب کے اس بیان سے موازنہ کیجئے جس میں آپ فرما رہے ہیں: "پانی بھر کر ظاہر کرو کہ آج ہم اس کے وارث اس چاہ پر ڈیرہ ڈال کر پانی بھر رہے ہیں جس سے کہ اسے (غالباً یہاں "اس" سے مراد ناقۃ اللہ ہے) روکا گیا تھا۔ کوئی ہے جو ہمیں آ کے روکے"۔

---

(۳) - لُوط علیہ السّلام

لُوطؑ کی قوم پر جو عذاب نازل ہُوا۔ اس کی وضاحت قرآن کریم میں اسطرح آئی ہے کہ اس قوم کی بستیوں کو اُکھاڑ کر نیچے زمین پر پٹخ دیا گیا۔ پھر اوپر سے اس قوم پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ پتھروں کی بارش کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ وَمَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ (۱۱-۸۲-۸۳)

تو جب ہمارا حکم آیا۔ ہم نے اس بستی کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا اور ان پر پتھر کی تہہ بہ تہہ (پے در پے) کنکریاں برسائیں جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان لگے ہوئے تھے اور وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دُور نہیں

دُوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَالۡمُؤۡتَفِكَةَ اَهۡوٰى فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى (۵۳-۵۳-۵۴)

اور اسی (اللہ) نے اُلٹی ہوئی بستیوں کو دے ٹپکا۔ پھر اس بستی کو ڈھانپ لیا جس نے ڈھانپا (یعنی پتھروں کی بارش نے)

ان آیات میں دو امور خرقِ عادت ہیں:

(۱) کسی بستی کے خطۂ زمین کو اُکھاڑ کر اُوپر لے جانا پھر اُلٹا کر اسی گڑھے میں دے مارنا۔

(۲) آسمان سے پتھروں کا برسنا۔

اُلٹی ہوئی بستیوں پر پتھروں کی بارش کی نئی تاویل: اب دیکھئے جناب حافظ صاحب ان دونوں اُمور سے کیونکر گریز فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"جو کہا جاتا ہے کہ اس خطہ کو جڑ سے اُکھیڑا گیا اور آسمان تک پہنچا کر اُلٹا کر پھینک دیا گیا غلط اور قرآن مجید کے خلاف ؎ ہے۔ کیونکہ اللہ پاک نے فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا فرمایا ہے کہ ہم نے اس کے بالائی حصّوں کو نیچے کی طرف پھینک دیا۔ جیسے کہ زلزلوں بھونچالوں میں ہوتا ہے۔" (ص ۸۹)..... "ہاں شہری بلند عمارتوں کو دھم سے گرا کر عذاب کی صُورت پیدا کر دی جسے پتھروں کی بارش سے تعبیر کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اللہ پاک نے مسلمانوں کو کسی بلند مقام پر پہنچا کر آناً فاناً ایک بہت بڑا خطرناک سیلاب ؎ بھیج دیا ہو۔ چونکہ عمارتوں پر بے گھڑی اینٹ پتھروں کی چنائی میں سب کچا گارا لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے پانی دروازوں کے علاوہ دیواروں سے بھی بہت جلد گھروں میں داخل ہوا تو وہ سامان کی اُٹھائی دھرائی میں مشغول ہو گئے ہوں گے کہ نیچے

سے پانی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور دیواریں کھوکھلی ہو کر اُوپر سے گر پڑیں اور چھتیں بھی اُوپر آپڑیں"
(پ حصہ ۸۹-۹۰)

اب ہم قبلہ حافظ صاحب کی تاویلات پر ان نمبروں کی ترتیب سے بحث کریں گے جو آپ کے اقتباس پر لگا دیئے گئے ہیں۔

(۱) بستیوں کو اُلٹا کر آسمان سے دے پٹکنا قرآن کے خلاف تو نہیں۔ البتہ حافظ صاحب کے ذہن اور عقل کے خلاف ضرور ہے۔ کیونکہ خرقِ عادت ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى۔ ان دو الفاظ میں سے آپ صرف پہلے لفظ کو زیر بحث لائے ہیں۔ دُوسرے کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ بہر حال جو المؤتفکہ پر بحث کی ہے وُہ کچھ اس طرح ہے۔

لغوی تحقیق کا جائزہ: (ا) "المؤتفکہ کا باب افتعال ہے اور مادہ اس کا افک ہے کہ انہوں نے حق و صداقت سے مُنہ موڑ کر سراسر جھُوٹ پر کمر باندھی ہوئی تھی"۔ (ص ۹۰)

اب سوال یہ ہے کہ اگر یہی معنی بتلانا تھا تو باب افتعال بتلانے کی کیا ضرورت تھی ؟ افک کے معنی تو واقعی جھُوٹ بولنا ہے۔ لیکن افک اور ائتفک کو ہم معنی قرار دینا کہاں کا لغت ہے ؟

(ب)۔ "اساس البلاغۃ میں لکھا ہے کہ اِئْتَفَكَتِ الْاَرْضُ بِاَهْلِهَا اِنْقَلَبَتْ۔ یہ لفظ ملک میں کوئی بڑا خطرناک انقلاب پیدا ہونے پر بولا جاتا ہے"۔

اس عبارت میں آپ نے اساس البلاغۃ کی عبارت ٹھیک نقل فرمائی۔ لیکن اس کا مفہوم بیان کرنے میں چکمہ دے گئے ہیں۔ انقلبت کے معنی اُلٹ جانا ہے نہ کہ "خطرناک انقلاب پیدا ہونا"۔ صاحب منجد (عربی اُردو) نے اس محاورہ کے معنی یُوں لکھے ہیں "شہر کا اُلٹ جانا"۔ اور صاحب منتہی الارب نے (عربی فارسی) اس محاورہ کے معنی یُوں لکھے ہیں "منقلب گردید" اور مؤتفکات کے معنی لکھے ہیں "شہر ہائیکہ برگردانیدہ شدند بر قوم لُوطؑ" یعنی "قوم لُوطؑ کے وُہ شہر جو اُلٹائے گئے تھے"۔ عجب بات یہ ہے کہ قاموس میں آپ کو معنی تو یہی نظر آئے جو صاحب منجد اور منتہی الارب نے بیان کیے ہیں۔ لیکن آپ نے عربی عبارت نقل کرنے کے بعد اس کا ترجمہ نہیں فرمایا۔

(ج)۔ مختار الصحاح سے عبارت نقل فرمائی ہے۔ "المؤتفکات المدن التی قلبھا اللہ تعالیٰ علی قوم لُوطؑ"۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت "قَلَّبَهَا اللہ تعالیٰ" کا معنیٰ بیان کرتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے ان کی بستیوں کو ان پر گرا دیا"۔

اب یہ تو نا قابلِ فہم بات ہے کہ حافظ صاحب قبلہ قَلَّبَ کے معنی بھی نہ سمجھتے ہوں یا وُہ اُلٹانا اور

گرانا ہیں بھی تمیز نہ کر سکتے ہوں۔ البتہ اس خرق عادت اُمر سے نپٹنے کے لیئے جو کچھ چابک دستیاں آپ نے دکھلائی ہیں وُہ آپ کے سامنے ہیں۔

اَب رہا اَهْوٰى کا لفظ جس کو آپ چھوڑ گئے ہیں۔ جس کا مادہ هَوٰى بمعنی کسی چیز کا بلندی سے نیچے گرنا (مقائیس اللغۃ لابن الفارس) چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳/۱) | قسم ہے ستارہ کی جب وُہ گرتا ہے۔

اور ہوا آسمان اور زمین کی فضا کو کہتے ہیں۔ اور اَهْوٰى ، هَوٰى سے فعل متعدی ہے جس کے معنی ہوئے کسی چیز کو فضا یا بلندی یا آسمان سے نیچے گرانا۔ پھر جب یہ لفظ مُؤتفکت کے ساتھ آیا تو اس میں بستیوں کا اکھاڑ کر بلندی پرسے جا کر نیچے پٹخ دینے کا معنی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے جیسے آپ فرما رہے ہیں کہ یہ "قرآن کے خلاف ہے"۔ قرآن کو تسلیم کرنے سے اگر دل میں گھٹن محسوس ہوتی ہے تو صاف کہہ دینا چاہیئے۔ ایسے حیلوں بہانوں سے فریب دینے کا کیا مطلب؟

(۲) عَالِيَهَا سَافِلَهَا کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ "اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے اس کے اُوپر کے حصّے کو نیچے کر دیا۔ جیسے زلزلوں، بھونچالوں میں ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ جَعَلْنَا سَافِلَهَا عَالِيَهَا یعنی اس کے نچلے حصّے کو اُوپر کر دیا۔ یہ دوستوں کا اپنا تخیّل ہے"۔ (ص ۸۹)

اب سوال تو یہ ہے کہ جس لفظ سے یعنی المؤتفكة، اھوٰی اور المؤتفکات سے یہ مفہوم واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ اسے آپ نے کب تسلیم کر لیا ہے کہ اب ان الفاظ کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

اَب رہا پتھروں کی بارش کا مسئلہ تو اس کی دو تاویلات آپ نے پیش فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ "شہری بلند عمارتوں کو دھم سے (بذریعہ زلزلہ) گرا کر عذاب کی صُورت پیدا کر دی" اور دُوسرا یہ کہ "ممکن ہے اللہ پاک نے مسلمانوں کو کسی بلند مقام پر پہنچا کر بڑا خطرناک سیلاب بھیج دیا ہو"۔

اَب دیکھیئے زلزلہ کی صُورت تو اس کے لیئے ناممکن ہے کہ قرآن کریم میں اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنضُودٍ ہے۔ جس کے معنی کنکریوں کو بارش کی طرح لگاتار برسانا ہے۔ زلزلہ کی صُورت میں کبھی کسی نے آسمان سے کنکریاں برستی دیکھی ہیں؟ اب اس عذاب کی زلزلہ یا سیلاب سے تاویل پیش کرنا ہٹ دھرمی نہیں تو اَور کیا ہے۔ کیا سیلاب کے لیئے قرآن میں کوئی دوسری لغت موجود نہیں۔

۵۔ **کچّا گارا:** کچے گارے کا حافظ صاحب نے اس وثوق سے ذکر فرمایا ہے جیسے بچشم خود ملاحظہ کیا ہو۔ بھلا اس پتھریلے اور ریتلے علاقے کا کچے گارے سے کیا تعلق۔ وہ لوگ تو پتھروں میں کھدائی کر کے مکان بنا لیتے تھے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم سے بھی ثابت ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ (۱۵/۸۲) | اور وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے تھے کہ امن واطمینان سے رہیں گے۔

یہ تو ان لوگوں کے گھروں اور مکانوں کی صورت تھی اور علاقہ کی صورت یہ ہے کہ آج بھی جن لوگوں نے یہ علاقہ دیکھا ہے ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ وہاں چنائی کچے گارے سے ہوتی ہو مگر اثری صاحب دیکھتے تو اپنا دیہاتی علاقہ ہیں اور بات اس علاقہ کی کرتے ہیں۔ لوط علیہ السلام سے تعلق رکھنے والی بستیاں اس بڑی گزرگاہ پر واقع ہیں جو حجاز سے شام کے علاقہ کو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی بارش کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ (۱۵/۷۶) | کہ یہ علاقہ عام گزرگاہ پر واقع ہے۔

پھر اصحاب ایکہ پر عذاب کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ (۱۵/۷۹) | یہ دونوں علاقے بڑی گذرگاہ پر واقع ہیں۔

سیاحت کے بعد دوسرا ذریعہ معلومات عامہ سے واقفیت ہے ایک آٹھویں جماعت پڑھنے والا بچہ بھی جانتا ہے کہ ان علاقوں کی مٹی میں ریت، کنکر، پتھر تو موجود ہوتے ہیں اور اگر کوئی چیز نہیں ہوتی تو وہ یہی گارے والی یا چیک دار مٹی نہیں ہوتی۔ مگر اثری صاحب کو ان باتوں سے کیا سروکار؟ اور اس بات سے بھی کہ اس علاقہ کے مکانوں میں گارا ہوتا بھی ہے یا نہیں؛ انہیں تو بس سیلاب کے ذریعہ دیواروں سے کچا گارا نکالنے اور پھر مکانوں کو گرانے سے سروکار ہے۔

مروجہ تفسیر پر اعتراضات: اس تاویل کے بعد حافظ صاحب مروجہ مفہوم پر دو اعتراض وارد کرتے ہیں (۱) اگر زمین کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا گیا تھا تو زمین کی دوسری طرف پشت پر پتھروں کی بارش سے کیا مطلب ہے؟ آبادی تو نیچے چلی گئی جو قابل سزا ہے اور پتھروں کی بارش زمین کی دوسری طرف برسائی گئی۔" (ص ۹۰)

(۲) یہ تباہ شدہ بستیاں شاہراہِ عام پر برلب سڑک واقع ہیں جن کو ہم نے اب تک کھنڈرات کی صورت میں چھوڑا ہوا ہے تاکہ مسافر اور سیاح ان کے ملاحظہ سے عبرت پکڑیں۔ عام خیال کے مطابق اگر زمین کے نیچے کی جانب کو اوپر اور اوپر کی جانب کو نیچے کر دیا گیا ہوتا تو پھر کھنڈرات کہاں اور عبرت کیسے"؟ (ص ۹۱)

اثری صاحب کے ذہن میں سیلاب کا نقشہ کچھ اس طرح سمایا ہوا ہے کہ انہیں سیلاب سے پیدا شدہ کھنڈرات کے علاوہ کچھ اور بات سجھائی ہی نہیں دیتی۔ پتہ نہیں یہ سیلاب اور کھنڈرات کون سے قرآنی الفاظ کا ترجمہ ہیں۔ حالانکہ اس جگہ نہ کوئی سیلاب آیا تھا نہ بعد میں کھنڈرات بنے اور نہ آج وہاں موجود ہیں وہاں تو کھنڈرات

کے بجائے ان نوکیلے کنکروں کا انبار لگا ہوا ہے جو اس قوم پر آسمان سے برسے اور یہی نشان زدہ کنکر پتھر ہی رہتی دُنیا کے لیئے سامانِ عبرت ہیں۔

رہی یہ بات کہ جب بستیاں اُلٹا کر دے ماری گئیں تو پھر اوپر سے پتھر برسانے کا کیا مطلب؟ تو اس بات کا اصل جواب وہ تو اللہ تعالیٰ ہے تاہم اتنا ہم بھی عرض کر سکتے ہیں کہ ایسی سزا کا سبب اللہ کا انتہائی غضب ہے۔ سوچیئے کہ اللہ تعالیٰ نے زانی محصن کی سزا رجم یا کسی کو پتھروں سے ہلاک کرنا کیوں رکھی ہے حالانکہ وہ آسان طریقوں سے بھی مارا جا سکتا تھا اور قوم لُوط کا جُرم زانی محصن سے بھی زیادہ تھا۔ اہلِ عرب اسلام سے پہلے اپنے دشمن کو مار ڈالنے کے بعد اس کا مثلہ کیوں کرتے تھے؟ دشمن تو پہلے ہی مر چکا۔ پھر اس کے ناک کان کاٹنے یا اس کا جگر چبانے یا اس کی کھوپڑی میں شراب پینے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ فافہم!

باب ۹

۴۔ ابراہیم علیہ السّلام

احیائے موتٰی اور چار پرندے: ارشاد باری ہے :۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲/۲۶۰)

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے فرمایا۔ اچھا تو چار پرندے لے لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو۔ پھر ان کا ایک ایک جز، ایک ایک پہاڑ پر رکھدو پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے اور جان لو کہ اللہ با اقتدار اور حکمت والا ہے۔

قرآن کریم میں اس واقعہ سے پہلے دو مزید واقعات مذکور ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے مُردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کا ذکر ہے۔ پہلا واقعہ تو حضرت ابراہیم و نمرود کے درمیان مناظرہ سے متعلق ہے۔ موضوع بحث یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد دُوسرا واقعہ عزیر علیہ السّلام کا ہے جو ایک گری پڑی بستی پرسے گزرے تو اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ تو ان مُردوں کو کیونکر دوبارہ زندہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السّلام کو اسی مقام پر موت دے دی اور پُورے سو سال بعد دوبارہ زندہ کر کے دکھلا دیا کہ میں یُوں اس بات پر قادر ہوں۔

تیسرا یہ واقعہ بھی حضرت ابراہیم سے متعلق ہے۔ ایمان بالغیب کی حد تک تو آپ اس سلسلہ میں نمرود کو مات بھی دے چکے تھے لیکن اب خود عینی مشاہدہ بھی چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چار پرندے لے کر انہیں اچھی طرح اپنے سے مانوس کر لو اور ان کی شکل صُورت کو پہچان لو۔ یہ پرندے خواہ ایک ہی جنس کے ہوں یا الگ الگ جنسوں کے مثلاً کوّا، تیتر، بٹیر وغیرہ۔ پھر ان کو ذبح کر کے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو چار حصّوں میں بانٹ کر ایک ایک حصّہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر کسی ایک پرندے کا نام لو تو وہی دوڑتا ہوا آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ اسی طرح سب پرندے باری باری بلانے پر آتے جائیں گے۔

احیائے موتیٰ کی تاویل اور اس کا جائزہ:

یہ واقعہ بھی چونکہ معجزہ ہے۔ لہٰذا عقل پرستوں نے اس تفسیر کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ اثری صاحب نے اس پر دو اعتراض اٹھائے ہیں:

(۱) اذْعُھُنَّ میں ھُنَّ کی ضمیر صرف ذوی الارواح کے لیے مستعمل ہے۔

(۲) یہ مطلب تو ایک پرندہ کے ذبح کرنے سے بھی حل ہو سکتا تھا۔ پھر چار پرندوں کے متعلق کیوں کہا گیا؟

پھر اس کی بہتر توجیہہ جو پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ احیائے موتیٰ سے مراد مردہ دل لوگوں کو زندہ کرنا یعنی اسلام کے نزدیک لانا ہے۔ مانوس کرنے سے مراد اخلاق کے ذریعہ ان لوگوں کو اپنے قریب لانا ہے۔ پھر وہ جہاں بھی ہوں آپ کے ایسے گرویدہ ہوں گے کہ آپ کے بلانے پر فوراً چلے آئیں گے۔ اسی طرح اللہ جب قیامت کو کسی شخص کو بلائے گا۔ تو اس کی روح فوراً اس کے جسم میں داخل ہو کر حاضر ہو جائے گی۔ (ص ۱۱۲، ۱۱۳ کا خلاصہ)

اب دیکھئے کہ :-

(۱) اس بیان کردہ مفہوم پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ مطلب تو ایک پرندے سے بھی حل ہو سکتا تھا۔ پھر چار پرندوں کے لیے کیوں کہا گیا؟ ایک آدمی کو اگر اپنے حسن سلوک سے اپنا گرویدہ بنا لیا جائے تو بھی وہی بات ہے جو چار آدمیوں کو گرویدہ بنانے میں ہے پھر چار کا ذکر کیوں کیا گیا؟

اور دوسرا اعتراض ھُنَّ سے متعلق بھی غلط ہے۔ کیونکہ وہ جانور زندہ ہو کر اور ذوی الارواح بن کر ہی ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے لہٰذا ضمیر کا استعمال بھی صحیح ہے۔

(۲) اس آیت میں تین باتیں ایسی ہیں جو ایک قلب سلیم رکھنے والے مسلمان کو اس واقعہ کو معجزہ تسلیم کرنے پر دلیل کا کام دیتی ہیں (۱) احیائے موتیٰ کا لفظ اور اس کا عام فہم اور ظاہری مفہوم (۲) جزءً کا لفظ جو ٹکڑا یا حصہ کے لیے آتا ہے۔ پرندوں کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کا اطلاق محال ہے (۳) آخر میں عزیز حکیم کا لاحقہ جو اللہ کی قدرت کاملہ پر دال ہے۔

اب ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ کے سوال کو پھر سامنے لائیے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ "اے میرے پروردگار مجھے دکھلا کہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرتا ہے؟ تو اللہ پاک نے اس کے جواب میں حضرت ابراہیم کو تبلیغ کا طریقہ بتلا دیا کہ چار آدمیوں کو اپنے اخلاق کے ذریعہ اپنے قریب اور اپنے سے مانوس کر لو۔ پھر یہ چاروں آدمی جہاں بھی جائیں گے۔ جب آپ انہیں بلائیں گے تو یہ چاروں آدمی فوراً آپ کے پاس چلے آئیں گے۔ میرے پاس مردوں کو زندہ کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ تبلیغ تو حضرت ابراہیم کو پہلے سے ہی معلوم تھا اور تمام انبیاء کو بھی معلوم ہوتا ہے

اور اسی طریقہ سے وُہ لوگوں کو اپنے اخلاق سے متاثر کر کے اپنا گرویدہ بناتے ہیں۔ اللہ پاک نے حضرت ابراہیم کے علم میں کیا اضافہ کیا؟ اور جس قلبی اطمینان کی آرزو حضرت ابراہیم نے کی تھی۔ کیا انہیں اثری صاحب کی اس تاویل سے حاصل ہو گیا؟ حضرت ابراہیمؑ نے اس سے پہلے بادشاہ سے مناظرہ کیا تو بادشاہ نے کہا تھا کہ میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار بھی سکتا ہوں تو کیا وہ بھی اسی طریقہ تبلیغ سے کسی کو اپنے قریب کر کے گرویدہ بنا لیتا تھا اور کسی کو متنفر کر کے اسے اپنے دور ہٹا دیتا یا مار دیتا تھا؟

(۴) قرآن کے الفاظ ہیں کہ ثم اجعل علی کل جبلٍ منهن جزءًا یعنی ان چاروں پرندوں کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو۔ تو کیا حضرت ابراہیم کو یہ طریقہ بتلایا گیا کہ پہلے اپنے اخلاق سے ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر پھر ان چاروں آدمیوں کو چار پہاڑوں پر جا کر چھوڑنا بھی حضرت ابراہیم کے ذمہ ڈال دیا گیا لیکن اثری صاحب اس کا ترجمہ یُوں فرماتے ہیں۔ "پھر وُہ جہاں بھی جائیں گے"۔ اس ترجمہ یا مفہوم کا قرآن کے الفاظ کے ساتھ کوئی ربط ہے؟

(۵) پھر فرماتے ہیں کہ "اللہ جب قیامت کو کسی شخص کو بلائے گا تو اس کی رُوح فوراً اس کے جسم میں داخل ہو کر حاضر ہو جائے گی"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر قیامت کی بات ہو تو احیائے موتیٰ کا معنی مردہ کو زندہ کرنا ہوتا ہے اور اس دنیا کی بات ہو تو اس کا معنی مردہ کو زندہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا ہوتا ہے۔ اب ابراہیم نے چونکہ اسی دنیا میں سوال کیا تھا لہٰذا انہیں باوجود سوال کے مُردہ کو زندہ کرنے کی بجائے طریقہ تبلیغ بتلا دیا گیا۔ رہی اطمینان کی بات تو حضرت ابراہیم نے سوال ہی ایسا کر دیا جو قیامت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دنیا میں جو جواب ہو سکتا تھا وہ اثری صاحب نے بتلا دیا۔ اطمینان خواہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) آگ کا ٹھنڈا ہونا:

عقل پرستوں نے حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ سے بھی انکار کیا ہے۔ سر سید نے تو یہ لکھا تھا کہ "یہ کفار کا فقط ابراہیمؑ کو جلانے یا مارنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اس پر عمل نہیں ہُوا۔ لیکن اثری صاحب چونکہ حدیث کو بھی مانتے ہیں اور بخاری کی مرفوع حدیث حِينَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ کا حوالہ بھی دیتے ہیں تاہم ان کی طبیعت پھر بھی اس واقعہ کو ماننے پر آمادہ نہیں اور سخت گرانبار نظر آتی ہے۔ وہ ایک سوال اُٹھا کر اس کا جواب دیتے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کیلئے ہم یہاں درج کرتے ہیں:

سوال: کیا ابراہیمؑ کو سچ مچ آگ میں ڈالا گیا تھا یا کہ وُہ کفار کے فتنہ و فساد کی آگ تھی جسے اللہ پاک نے ٹھنڈا* کر دیا۔ قرآن میں اگرچہ ارادہ القاء آیا ہے مگر بخاری میں مرفوعاً حِينَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ آیا ہے؟ (ب ص۱۱۵)

اب قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے علی الرغم حافظ صاحب اس کا جو جواب دیتے ہیں وُہ یہ ہے:-

معجزہ کی تاویل اور اس کا جائزہ: "ہوسکتا ہے وہ فتنہ و فساد کی آگ ہو جسے اللہ پاک نے ٹھنڈا کر دیا ہو جیسا کہ وہ فرماتا ہے كُلَّمَآ أَوْقَدُوا۟ نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا ٱللَّهُ (۵/۶۴) . یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے اور سُلگاتے رہتے ہیں، جسے ہم ہی بُجھاتے اور ٹھنڈا کرتے رہتے ہیں؟ (حوالہ ایضاً)

اس آیت اور اس کے ترجمہ میں اثری صاحب نے مندرجہ ذیل مغالطے دیئے ہیں:-

(۱) اس آیت میں "اوقدوا" کا استعمال کنایتہً اور محاورۃً ہے ۔ لڑائی کی آگ، حقیقتاً ایسی آگ نہیں ہوتی جس میں لکڑی وغیرہ جل جائیں ۔ یا وہ آگ، دُوسری چیزوں کو جلا کر راکھ بنا دے۔

(۲) قرآن کریم نے حَرِّقُوهُ کا لفظ استعمال فرمایا ہے یعنی ابراہیمؑ کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر جلا دو۔

(۳) ۔ اَطْفَأَ کے معنی بجھانا ہے ۔ ٹھنڈا کرنا نہیں ہے ۔ اس کا آپ نے اضافہ کر کے اشتباہ پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

(۴) ۔ قرآن کریم کے الفاظ "بَرْدًا وَسَلَامًا" "کہ ٹھنڈی بھی ہو اور سلامتی والی بھی"۔ اس میں بجھنے کا ذکر تک نہیں

اَب دیکھیئے کہ اللہ تعالیٰ آگ کو حکم دے رہے ہیں قُلْنَا يَٰنَارُ كُونِى بَرْدًا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ (۲۱/۶۹) اے آگ تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا ۔ پھر اگر ابراہیمؑ آگ میں ڈالے ہی نہ گئے تھے تو اللہ کا یہ حکم کیا معنی رکھتا ہے؟

اَب اثری صاحب کے جواب کا دُوسرا حصّہ سُنیئے جو کہ حدیث سے متعلق ہے:۔

"اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سچ مچ انہوں نے آگ میں جلا دینے کا ارادہ کر لیا اور "اُلقی فی النّار الحدیث" سے بھی پیدا شدہ خطرناک حالات کے مصادفت مُراد ہے کہ کام بالکل تیار تھا مگر اللہ پاک نے آپؑ کو بال بال بچا لیا؟ (ب ص۱۱۵)

کچھ سمجھے آپ کہ لفظ "مصادفت" سے کیا مُراد ہے؟ یعنی ابراہیمؑ آگ سے بچے اور ہٹے رہے اور آگ ابراہیمؑ سے بچی اور ہٹی رہی ۔ دونوں نے ایک دُوسرے کو چھوا نہیں ۔ یعنی اثری صاحب کے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ ابراہیمؑ آگ میں پڑیں اور آگ اپنا جلانے کا کام نہ کرے اور یہی خدا کی قدرت سے بھی انکار ہے اور قرآن و حدیث کو تسلیم کرنے سے بھی ۔ اثری صاحب زبان سے بیشک خدا کی قدرتِ کاملہ کا اقرار کرتے رہیں مگر جب کوئی ایسی بات تسلیم کرنے کا موقع آتا ہے تو جس طرح ہاتھ پاؤں مارتے اور فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں ۔ اس کا یہ ایک نمونہ ہے۔

(۳)۔ ذبحِ عظیم

اثری صاحب فرماتے ہیں:

"اور یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے (اسمٰعیلؑ کے) ذبح کرنے کا حکم فرمایا ہے یا یہ کہ ابراہیمؑ نے سمجھا کہ اللہ پاک مجھے اس کے ذبح کرنے کا حکم فرما رہا ہے یا یہ کہ اسمٰعیلؑ نے سمجھا کہ میری بابت میرے باپ کو میرے ذبح کرنے کا حکم ہو رہا ہے۔ ہر سہ اُمور قرآن و حدیث سے ہرگز ثابت نہیں۔" (ب ص ۱۲۰)

اور اس دعوٰی کی دلیل یہ پیش فرمائی کہ ازرُوئے قرآن و حدیث کوئی مسلمان کسی دُوسرے مسلمان کو بغیر حق کے مار نہیں سکتا۔ مسلمان تو درکنار ایک مسلمان کو تو بلا مقصد کسی چڑیا کو بھی مارنے کا حکم نہیں اور حضرت ابراہیم تو بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ بھی جلیل القدر پیغمبر تھے تو پھر بھلا حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کو کیونکر ذبح کر سکتے تھے۔ (ب ص ۱۲۵)

شرعی احکام کی اقسام: بجا فرمایا آپ نے لیکن یہ واضح رہے کہ شریعت کے ارشادات و احکامات دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو تمام اُمّت مسلمہ کے لیئے قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ دُوسرے وُہ جن پر عمل پیرا ہونا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ یہ فرائض کی تکمیل سے آگے بڑھ کر درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا صرف صاحب عزیمت لوگوں کا کام ہوتا ہے اب ان دونوں قسموں کے احکام کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱)۔ عام مسلمانوں کے لیئے حکم یہ ہے کہ وُہ اپنے اموال میں سے صرف چالیسواں حصّہ زکوٰۃ دے دیا کریں تو ان کا مال پاک ہو جاتا ہے اور یہ حکم صاحب نصاب لوگوں پر فرض ہے اور خواص کے لیئے حکم یہ ہے کہ زائد از ضرورت مال سارے کا سارا اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔ اب اس حُکم پر جس حد تک کوئی عمل پیرا ہوگا۔ اسی قدر اس کے درجات بڑھتے جائیں گے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا فتوٰی یہ تھا کہ زکوٰۃ چالیسواں حصّہ نہیں بلکہ چالیس کے چالیس حصّے (یعنی سارا ہی مال) ہی زکوٰۃ ہے۔ اسی فتوٰی کی بنا پر حضرت عثمانؓ نے انہیں جلا وطن کر دیا تھا حضرت ابوذرؓ کی اجتہادی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے عام قانون اور درجۂ عزیمت کے حکم میں فرق نہ کیا۔ اور اس درجۂ عزیمت کے حکم کو عام قانون کی صُورت میں فتوٰی کے طور پر پیش کر دیا۔ حضرت عثمانؓ یہ کہتے تھے کہ اس درجۂ عزیمت کے حکم پر تم خود جہاں تک ممکن ہو عمل کرو لیکن اسے عام لوگوں کے لیئے قانون کی صُورت میں پیش نہیں کر سکتے۔

(۲)۔ صدقہ کرنے کے سلسلہ میں بخاری میں یہ ہدایت بہ تکرار آئی ہے کہ

اَلصَّدَقَةُ عَنْ ظَهْرِ غِنًى (بخاری) صدقہ اتنا دینا چاہیئے کہ اس کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے!

یہ عام قانون ہے لیکن حضور اکرمؐ کے صدقہ کا یہ حال تھا کہ جب وفات پائی تو آپ کی زرہ چند درہموں کے عوض ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی۔ احتیاج یہ تھی کہ آپ نے زرہ رہن رکھ کر گھر کے لیئے اناج حاصل کیا تھا۔

(۳)۔ عام مسلمانوں کے لیئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ اپنے بیماروں کا علاج کرائیں تاکہ کوئی شخص یوں نہ کہے کہ اگر میں فلاں شخص کا علاج کراتا تو شاید مریض نہ مرتا۔ کتب احادیث میں کتاب الطب کی موجودگی اس بات کی واضح دلیل ہے۔ علاوہ ازیں خود بھی رسول اللہؐ نے کئی بیماروں کا علاج کیا اور علاج بھی بتلائے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمیں یہ صحیح روایت بھی ملتی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ستر ہزار ایسے اشخاص کو بغیر حساب کتاب جنت میں داخل فرمائے گا۔ جنہوں نے محض اللہ تعالیٰ پر توکل کی بنا پر اپنا علاج نہیں کرایا تھا۔

(۴) عام حکم یہ ہے کہ مسلمان جان بچانے کی خاطر کلمہ کفر کہہ کر اپنی جان بچا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا دل اس پر برقرار رہو (۱۶/۱۰۶) مگر حضرت ابراہیمؑ نے یہ رعایت قبول نہیں فرمائی اور جلتی آگ میں گود پڑنے کو ترجیح دی۔

غرض اس عام اور خاص حکم کے سلسلہ میں بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اب اگر اثری صاحب اس عام اور خاص حکم میں ہی تمیز نہ کرسکیں تو "بھینس کے آگے بین بجانے والی بات" بن جاتی ہے۔

اب اصل مسئلہ کی طرف آیئے۔ اثری صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان کو تو ایک چڑیا مارنے کا بھی حکم نہیں چہ جائیکہ ایک نبی اپنے نبی بیٹے کو ذبح کرے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ مسلمان دنبے بکرے کی قربانی کرتے ہیں تو اس میں جانور کا کیا قصور ہوتا ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ کافی نہیں کہ فساد فی الارض یا نفس بغیر نفس کی بات نہیں بلکہ اللہ کا حکم سمجھ کر کیا جاتا ہے اور یہ عام حکم ہوا۔ البتہ اس میں ترغیب یہ ہے کہ مسلمان ایسی قربانی پیش کریں جو تسر الناظرین اور مما تحبون کے مصداق ہوں۔

اب اسی مما تحبون کے مصداق حضرت ابراہیم کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے عزیز ترین متاع، اپنے پیارے، ہونہار اور نوجوان بیٹے کی اللہ کی راہ میں قربانی پیش کریں۔ یہ حکم عام نہ تھا بلکہ خاص تھا جس کی اثری صاحب تمیز نہ کرسکے۔ حضرت ابراہیم کو بھی یہی سمجھ آئی کہ انہیں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جارہا ہے اور حضرت اسماعیل کو بھی یہی سمجھ آئی کہ باپ نے جو خواب دیکھا تو یہ فی الواقعہ خدا کا حکم ہے۔ حضرت اسماعیل کو یہ بھی یقین ہوگیا تھا کہ میں فی الواقعہ ذبح ہو جاؤں گا تبھی تو انہوں نے کہا کہ "آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔ تو ایسے اثری صاحب کے اپنے فہم کے قصور کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟

اب ہم اثری صاحب کی ان تحقیقات جلیلہ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو آپ نے متعلقہ آیات درج

کرنے کے بعد اس کے ترجمہ یا مطلب بیان کرنے کے دوران پیش فرمائی ہیں:-

آیات متعلقہ ذبح عظیم

سورہ صٰفّٰت ۳۸		اثری ترجمہ یا مطلب
فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ (۱۰۲)	جب اسمٰعیل حضرت ابراہیم کیساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا تو ابراہیم نے کہا کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے! انہوں نے کہا ابا! جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجیے خدا نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنیوالوں میں سے پائیں گے۔	جب وہ اپنے باپ کے ہمراہ بھاگ دوڑ اور کام کاج کرنے لگا تو باپ نے ایک روز اس سے بیان کیا کہ اے میرے چھوٹے بیٹے میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں تو بھی سوچ کر بتا کہ اسکی تعبیر کیا ہے اور اس میں تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے فی البدیہہ عرض کی ابا جان! جو کچھ آپکو خواب میں اشارہ ہوا اسکی ظاہری طور پر تعمیل تو ابھی کریں پھر جب اللہ پاک اسکی صحیح اور ٹھیک تعبیر سمجھائیگا تو اگر اس میں میری جان کا بھی مطالبہ ہوا تو میں اس کے لیئے بھی ہر طرح سے تیار ہوں۔ مجھے پھر کوئی بھی انکار نہیں۔
فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (۱۰۳)	پھر جب دونوں نے حکم مان لیا تو باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔	جب باپ بیٹا دونوں اس بات پر متفق ہوئے تو کسی بلند جگہ پہنچ کر جو کہ خواب میں دیکھی تھی باپ نے بیٹے کو کنپٹی کے بل لٹایا جو کہ خواب میں دیکھی تھی۔
وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ (۱۰۴) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۱۰۵) إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ (۱۰۶)	تو ہم نے اس کو پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں بلا شبہ یہ صریح آزمائش تھی۔	تو اللہ پاک نے صریح الہام فرمایا کہ اے ابراہیم! بس ٹھیک ہے جہاں تک ظاہری طور پر خواب کا تعلق ہے وہ پورا ہوا ویسے ہی تیرا بچہ بہت بڑا نیک ہے اور تیرے لیئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔
وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (۱۰۷)	اور ہم نے ایک بڑی قربانی بدلہ میں دیکر اسمٰعیل کو چھڑا لیا۔	اور ٹھیک تعبیر اس کی یہ ہے کہ تو کوئی بہتر سے بہتر اضحیہ لے کر ذبح کر دے جو کہ تسر الناظرین اور مما تحبون کا مصداق ہے" (ب ص ۱۲۷ - ۱۲۸)
وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۱۰۸)	اور پیچھے آنیوالوں میں ابراہیم کا ذکر خیر باقی چھوڑ دیا	اور اسی طرح پر عید الاضحی کے موقع پر بھی ایسے جانوروں کی قربانی مناسب

اثری صاحب کی لغت اور معنوی تحریف:

(۱) یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤمَرُ کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "ابا جان! چونکہ آپ کو خواب میں اشارہ ہُوا اس کی ظاہری طور پر تعمیل تو ابھی کر دیں۔ پھر جب اللہ پاک اس کا صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر سمجھائے گا تو اگر اس میں میری جان کا بھی مطالبہ ہُوا تو میں اس کے لیئے بھی ہر طرح سے تیار ہوں۔ مجھے پھر بھی انکار نہیں"۔

اب دیکھئے اثری صاحب کا اتنا لمبا چوڑا بیان قرآن کے الفاظ افْعَلْ مَا تُؤمَرُ کا ترجمہ یا مطلب ہے۔ تؤمر کا عام فہم تو ترجمہ یہ ہے کہ "جو تو حکم دیا گیا ہے"۔ لیکن آپ نے اس حکم کی تعمیل کو دو قسطوں میں تقسیم کر دیا۔ (۱) ظاہری طور پر اشارہ[1] اور (۲) خواب کی ٹھیک تعبیر۔ پھر ان دونوں قسم کے معانی میں مدت زمانی بھی حائل ہے۔ یعنی ظاہری طور پر اشارہ کی تعمیل تو ابھی کر دیجئے پھر کچھ مدت گزرنے پر جب صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر اللہ سمجھائیگا تو باقی کام کی تعمیل ہوگی۔

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر کی اس وقت نہ تو حضرت ابراہیمؑ کو سمجھ آئی اور نہ حضرت اسماعیلؑ کو۔ وہ سمجھ تو اسی وقت آسکتی تھی جب اللہ تعالیٰ بعد میں کبھی انہیں سمجھاتا۔ اس وقت دونوں کو بس اتنی ہی سمجھ آئی کہ خواب میں باپ نے بیٹے کو کنپٹی کے بل لٹایا ہوا ہے اور باپ نے ہاتھ میں چھری بھی پکڑ رکھی ہے پس یہ "ظاہری طور پر اشارہ" ہُوا۔ تو ان دونوں نے یہی سمجھا کہ بس اتنا ہی ڈرامہ کھیلنا ہے۔ باقی رہی اِنِّی اَذْبَحُکَ والی بات تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں چھری چلنے کے بعد خون بہنے کی کیفیت ہی نہ دیکھی تھی تو انہیں یہ کیسے یقین ہوتا کہ میں نے فی الواقعہ ذبح کرنا ہے۔ اسی طرح حضرت اسماعیلؑ کو بھی یقین تھا کہ بس گلے پر چھری رکھنی ہے۔ ہونا ہوانا تو کچھ ہے نہیں۔ پھر جب کسی کو کچھ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہی نہ ہو۔ تو ایسا آسان ڈرامہ کھیلنے میں باپ بیٹے کو آخر عذر بھی کیا ہوسکتا تھا؟ خصوصاً جب کہ خدا کے حکم کی تعمیل بھی

---

[1] آپ فرماتے ہیں کہ اَمر کے معنی امام راغب نے اشارہ کرنا بھی لکھا ہے ہم مانتے ہیں کہ اگر اشارہ سے کوئی کام کرنے کو کہا جائے تو اس پر بھی اَمر استعمال ہو سکتا ہے تاہم اصل معنی حکم کرنا ہی ہے خواہ وُہ اشارہ سے ہو یا زبان سے محض اشارہ کرنا اس کا ہرگز معنی نہیں لیکن اثری صاحب سے تو یہ سوال بھی ہے کہ ظاہری طور پر "کس لفظ کا معنی ہے۔ پھر اثری صاحب اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کیلئے ب ص[۳] پر ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں فافعلوا ما تؤمرون کا معنی "حکم کرنا" ہے تو یہاں کیوں نہیں؟ پھر اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ سورہ بقرہ میں تو پہلے ان اللہ یأمرکم ان تذبحوا بقرۃ کے مطابق انہیں پہلے حکم ملا تھا تو یہاں حکم کرنا اس کا معنی ہوا مگر اس مقام پر تو پہلے انی اذبحک سے کیفیت ذبح بیان ہوا ہے۔ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا معنی حکم کرنا ہو۔ لہٰذا یہاں اس کا معنی اشارہ کرنا ہے۔ اب دیکھئے کہ :- (۱) آپکے خیال کے مطابق اگر تؤمر سے پہلے امر کا لفظ آیا ہو تو اس صورت میں تؤمر کا معنی حکم کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر پہلے امر کا لفظ نہ آیا ہو تو پھر ضروری نہیں کہ تؤمر کا معنی حکم کرنا کیا جائے۔ اشارہ کرنا بھی کیا جا سکتا ہے اس تقریر سے یہ سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر اَمر کے بعد تؤمر نہ آئے تو اس امر کے معنی حکم کرنا ہونگے یا اشارہ کرنا۔ اگر از روئے لغت اشارہ کرنا بھی درست ہے تو امرنا لنسلم کے کیا معنی ہوں گے (۲) اگر لغۃً امر کے معنی اشارہ کرنا بھی درست ہے تو پھر یہ پابندی کہاں سے آگئی کہ اگر تؤمر سے پہلے اَمر آئے تو تؤمر کا معنی لازمی طور پر حکم کرنا ہوتا ہے اگر دونوں جگہ اشارہ کرنا ہی تصور کر لیا جائے تو پھر کیا حرج ہے اور یہ پابندی جو اثری صاحب نے لگائی ہے وہ گرامر کے کس قاعدہ کی رُو سے ہے؟

ہو رہی ہو۔ اور ان دونوں کے اس کام کو ڈرامہ سمجھنے کی دُوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی اللہ نے اس خواب کا صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر تو سمجھائی تھی۔ اگر اسمٰعیل ذبح ہو جاتے تو وُہ صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر کون سمجھتا ؟

(۲)۔ ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل کو فی الواقع یقین تھا کہ وُہ ذبح ہو جائیں گے ورنہ یہ الفاظ کہنے کا کچھ مطلب نہیں۔ مگر اثری صاحب ان الفاظ کا مطلب تو درکنار ترجمہ بھی چھوڑ گئے کیونکہ یہ الفاظ آپ کے ڈرامہ کا پول کھول دیتے ہیں۔

(۳)۔ قد صدقت الرّؤیا (اے ابراہیمؑ! تونے خواب سچ کر دکھلایا) کا اثری ترجمہ یہ ہے: "بس ٹھیک ہے جہاں تک ظاہری طور پر خواب کا تعلق ہے۔ وہ پورا ہُوا"۔ معلوم نہیں اس ترجمہ میں "ظاہری طور پر" کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ مگر جب تک آپ ان الفاظ کو داخل نہ کریں آپ کا ٹھیک مطلب کیسے سیدھا ہو سکتا تھا ؟

(۴)۔ اِنَّا کَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ کا اثری ترجمہ ہے "تیرا بچہ بہت بڑا نیک ہے"۔ اب دیکھئے۔ زید کہتا ہے کہ اثری صاحب کا ترجمہ درست نہیں بلکہ اس کا ٹھیک ترجمہ یہ ہے کہ وہ سامنے والا درخت بہت اُونچا ہے۔ آپ غور کر کے بتلائیے کہ اثری صاحب اور زید دونوں میں کون سچا ہے اور کیوں ؟

(۵) ان ھذا لھو البلاء المبین کا اثری ترجمہ ہے۔ "یہ بچہ تیرے لیئے ایک بہت بڑی نعمت ہے"۔ انّ ھذا کا معنیٰ یہ واقعہ نہیں، بلکہ "یہ بچہ" ہے۔ اور بلاء المبین کے معنی "واضح آزمائش" نہیں بلکہ "بہت بڑی نعمت" ہے۔

لفظ بلاء کی لُغوی تحقیق: فرماتے ہیں "بلاء کا لفظ دُکھ سُکھ دونوں پر بولا جاتا ہے مگر میں نے مؤخر الذکر مراد لیا ہے۔ جلالین وغیرہ نے لیبتلی المومنین منہ بلاء حسنًا کا ترجمہ نعمت کیا ہے اور ابن الاثیر وغیرہ میں بھی اس کا ترجمہ انعام و احسان کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ" (پ صفحہ ۱۲۰ حاشیہ)

اس اقتباس میں جو اثری صاحب نے مغالطے دیئے ہیں وُہ درج ذیل ہیں:

(ا) بلاء کا لفظ دُکھ سُکھ پر نہیں بولا جاتا بلکہ آزمائش کیلئے بولا جاتا ہے خواہ یہ آزمائش دُکھ پہنچا کر کی جائے یا نعمت عطا کر کے، گویا اصل معنیٰ آزمائش ہے اور دُکھ سُکھ اس آزمائش کے ذرائع ہیں لیکن اثری صاحب نے ان ذرائع کو اصل معنیٰ قرار دے کر دُکھ کو چھوڑ دیا ہے اور سُکھ کو اختیار کیا ہے اس ترک و اختیار کی وجہ تو اثری صاحب ہی بہتر جانتے ہیں۔

(ب) جلالین وغیرہ نے بلاء حسنًا کا ترجمہ نعمت کے ذریعہ آزمائش کیا ہے۔ صرف بلاء کا معنیٰ نعمت نہیں کیا۔

بہرحال ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اثری صاحب قاری کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا فن خوب جانتے ہیں۔

(۶) وفدینٰہ بذبح عظیم کا ٹھیک اثری ترجمہ اور تعبیر یہ ہے کہ "کوئی بہتر سے بہتر اضحیہ لے کر ذبح کر دے"

گویا عظیم کا معنیٰ ہے "بہتر سے بہتر" اور ذبح کا معنیٰ ہے "اضحیہ" اور فَدَیْنٰہ کا معنیٰ "ہم نے فدیہ دے کر اسمٰعیل کو چھڑا لیا" نہیں ہے۔ بلکہ "تو ذبح کر دے" ہے۔ گویا اثری صاحب نے (ل) فدی کا معنی ذبح کرنا کیا (ب) ماضی کے فعل کو امر میں بدلا (ج) جمع متکلّم کے صیغے کو واحد مخاطب میں بدلا۔ ان بلا جواز تبدیلیوں کے بعد آپ نے جو ٹھیک تعبیر برآمد فرمائی ہے یہ قرآن کے ساتھ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

(۷) وَتَرَکنا علیه فی الآخرین کا اثری ترجمہ ہے۔" اور اسی طرح عید الاضحیٰ کے موقعہ پر بھی ایسے جانوروں کی قربانی مناسب ہے" کیا آپ تبلا سکتے ہیں کہ اس آیت میں" اسی طرح" کس لفظ کا معنیٰ ہے" عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر" کس لفظ کا، قربانی کس لفظ کا اور مناسب ہے کس لفظ کا؟ اگر نہ تبلا سکیں تو اثری صاحب کی داد دیجئے کہ بغیر الفاظ کے وہ کیسی ٹھیک تعبیریں تبلانے کا فن جانتے ہیں۔

اثری صاحب کا اللہ تعالیٰ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ سب پر اتہام:

اب دیکھئے کہ اثری صاحب نے اس مختصر ڈرامہ میں ..... اللہ تعالیٰ پر تو یہ اتہام لگایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنّ هذا لَهُوَ البلاء المبین کہ اس میں باپ بیٹا دونوں کی صریح آزمائش تھی یعنی باپ کو یہ یقین تھا کہ میں نے خدا کے حکم کے تحت اپنے پیارے بیٹے کو اللہ کی رضا کے لیئے ذبح کر کے قربانی دینا ہے۔ اسمٰعیلؑ کو یہ یقین تھا کہ میں نے ذبح ہو کر ختم ہو جانا ہے باپ بیٹے کے اس یقین ہی پر اللہ تعالیٰ نے اسے بلاءُ مبین کہا۔ لیکن اثری صاحب اللہ تعالیٰ اور دونوں انبیاء کی نیتوں پر یوں حملہ آور ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

"جس قانون اور علم کی بنا پر اس کے ذبح کرنے کے لیئے اللہ پاک کا ارادہ اور حکم نہیں تھا۔ اس سے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اس نے آگاہ فرما دیا ہوا تھا (گویا یہ تبلا دیا تھا کہ صرف گلے پر چھری رکھنی ہے ذبح نہیں کرنا) اس لیئے اس کے خلاف (یعنی اسمٰعیلؑ کے ذبح ہونے اور کرنے دونوں کے خلاف) نہ کوئی ابتلائی حکم ہے اور نہ اس کی تعمیل کی کوئی تیاری۔" (پ ۱۴۵)

غور فرمایا آپ نے عصمتِ انبیاء بیان کرنے کی آڑ میں انبیاء کی نیتوں پر کس قدر رکیک حملے کیئے جا رہے ہیں۔ تاویل کا دھندا تو دُوسرے بھی بہت لوگ کرتے رہے اور کرتے رہیں گے مگر قرآنی آیت کے الفاظ کے علی الرغم بالکل اس کا اُلٹ مطلب بیان کر کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا کہ ٹھیک اس کا مطلب یا اسکی تعبیر یہ ہے۔ یہ بس اثری صاحب ہی کا حصّہ ہے۔

اور اللہ پر دُوسرا اتہام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسمٰعیل کو ذبح عظیم کا بدلہ دے کر چھڑا لیا۔

جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ ذبحِ عظیم نام کی کوئی چیز بطور فدیہ دی ضرور تھی اور اسلامی روایات سے یہ ثابت ہے کہ جب ابراہیمؑ نے مُڑ کر دیکھا تو ایک عمدہ قسم کا دُنبہ کھڑا تھا۔ جو جنت سے لایا گیا تھا۔ جسے حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کے بدلہ میں ذبح کیا اور اسمٰعیل کی جان بچ گئی۔ اب یہ عقل پرست جنت سے دنبہ آنے کی بات تسلیم نہیں کر سکتے تو نہ کریں مگر دنبہ کے خود بخود حاضر ہونے سے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور اس بات کی بھی کہ یہ دنبہ اللہ نے حاضر کیا تھا۔ لیکن اثری صاحب کو اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور فعل دونوں سے انکار ہے جبھی تو آپ نے اس آیت کا ترجمہ یُوں کر دیا کہ "اے ابراہیم! کوئی بہتر سے بہتر اضحیہ لے کر ذبح کر دے"۔ یعنی اس وقت ذبحِ عظیم نہ کوئی موجود تھا نہ ذبح ہُوا۔ بلکہ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو یہ حکم دے دیا۔ کہ کوئی اچھا سا اضحیہ تلاش کر لینا اور جب مل جائے تو اس کو ذبح کر دینا۔

ذبیح کوئی بھی نہیں: گو علمائے اسلام کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ ہیں تاہم کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ذبیح اسمٰعیلؑ نہیں بلکہ اسحاقؑ ہیں۔ اسحاقؑ کو ذبیح ماننے کی اصل بنیاد تو تورات ہے تاہم ان لوگوں نے بخاری کی ایک طویل حدیث سے جس میں حضرت ابراہیمؑ کا دو تین دفعہ خبرگیری کے لیئے مکہ تشریف لانا مذکور ہے ۔۔۔ تائید حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس میں بھی تکلف ہی برتا گیا ہے حقیقت یہی ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح اللہ قرار پاتے ہیں۔

اس اختلافی مسئلہ میں اثری صاحب بالکل منفرد رائے رکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ذبیح کوئی بھی نہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

"اور اصل بات وہی ہے جسے میں بیان کر آیا ہُوں کہ کسی کے ذبح کا کوئی حکم نہیں ہُوا اور نہ ہی خواب میں ذبح وقوع میں آیا اور نہ خون بہایا گیا۔ صرف کیفِ ذبح کو ملاحظہ فرمایا گیا جس پر ظاہراً عمل بھی کیا گیا اور پھر اس کی تعبیر پر بھی عمل ہوا اور آج تک وہ ہو رہا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا"۔ (ب صفحہ ۱۴۰)

(۵)۔ حضرت یُوسف علیہ السلام

اور چند دلچسپ تاویلات

ستاروں کا حضرت یُوسف کو سجدہ: ارشاد باری ہے :

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ (۱۲/۴)

جب یُوسف نے اپنے والد سے کہا کہ ابا! میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں اور سُورج اور چاند کو دیکھا کہ وُہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

یہ آیت اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہے گیارہ ستاروں سے مُراد یُوسفؑ کے گیارہ بھائی ہیں اور سورج اور چاند سے مراد ہیں آپ کے والدین جیسا کہ اسی سورہ کے آخر میں مذکور ہے کہ جب حضرت یُوسفؑ کو مصر کی حکومت مل گئی تو آپ نے اپنے بھائیوں اور والدین کو اپنے ہاں بُلا لیا تو اس واقعہ کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے :-

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا (۱۲/۱۰۰)

اور یُوسفؑ نے اپنے والدین کو عرش پر بٹھایا اور سب یُوسفؑ کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ اور اس وقت یُوسفؑ نے کہا! اے میرے باپ! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچ کر دکھایا۔

لیکن اثری صاحب نے اس خواب کا جو ٹھیک مطلب پیش فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے آپ از خود ایک سوال اُٹھاتے ہیں کہ "ستارے تو بلند ہوتے ہیں۔ ان کا سجدہ کیسے معلوم ہو؟ پھر اس سوال کا یوں جواب دیتے ہیں۔

خواب یُوسف کی اثری تعبیر: "گویا آپ کنوئیں میں پڑے اُوپر کو اور بھائی اس کے اُوپر ہو کر نیچے دیکھ رہے تھے جیسے کنوئیں میں دیکھا جاتا ہے اور ماں باپ بھی سطح زمین پر بتنے اور یہ ابتدائی کیف ہے۔ جو کہ دکھائی گئی مگر اس میں سجدہ کا ذکر نہیں۔ پھر ضمیر پھیر کر سجدہ کا ذکر فرمایا جو کہ آخری کیف ہے کہ وُہ تشکر کے طور پر جناب الٰہی میں سربسجود ہو رہے ہیں۔ باپ نے خواب سُن کر فرمایا کہ عزیزاللہ پاک تجھے سرفراز کرے گا۔ اور کامل طور پر سربلندی بخشے گا۔" (ص ۱۴۸)

اب دیکھئے کہ آپ کے اس بیان کردہ ٹھیک مطلب میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں :
(۱) ۔ اصل خواب میں کنوئیں کا کہیں ذکر نہیں ۔ لیکن آپ نے خواب کو شروع ہی کنوئیں سے کیا ہے (خواب کے بعد آپ کا کنوئیں میں پڑنا کافی مدت بعد واقع ہوا اور اس کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۱۵ میں ہے لیکن آپ نے اپنے ٹھیک مطلب میں یوسفؑ کو کنوئیں میں ڈال دیا ہے اور منڈیر پر والدین کو اور بھائیوں کو بٹھا دیا ہے ۔ پس یہ خواب کا پہلا سین ختم ہوا جو آپ کے الفاظ میں " ابتدائی کیف " تھا ۔
(۲) ۔ سوال یہ تھا کہ ستارے تو بلند ہوتے ہیں ۔ ان کا سجدہ کیسے معلوم ہو ؟ آپ اس جواب کو بار بار پڑھیئے اور بتلائیے کہ اس میں کہیں ستاروں کا ذکر تک بھی آیا ہے ؟
(۳) ۔ اب اتنی ہی بات یعنی منڈیر سے کنوئیں میں جھانکنے کا قصہ (ابتدائی کیف) یوسفؑ اپنے والد ماجد کو خواب میں ہی سناتے ہیں (کیونکہ ابھی آخری کیف باقی ہے) تو والد ماجد فرماتے ہیں کہ " عزیز ! اللہ پاک تجھے سرفراز کرے گا اور کامل طور پر سربلندی بخشے گا ۔ "
(۴) ۔ جب یوسف نے یہ جواب سنا تو خواب میں ہی سب بھائی اور والدین اللہ کے آگے تشکر کے طور پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں " یہ خواب کا آخری سین یا آخری کیف ہے ۔ گویا خواب بھی ختم ہوا اور اس کا ٹھیک مطلب بھی ۔
اب سوال یہ ہے کہ یوسفؑ کے کنوئیں میں پڑنے اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے والدین اور بھائیوں کو دیکھنے سے تو یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ یوسفؑ نحوست وادبار کا شکار ہونے والے ہیں پھر بھائی اور والدین کس خوشی کے شکریہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے ۔ اور حضرت یعقوبؑ نے اتنی ہی بات سے یہ نتیجہ کیسے نکال لیا کہ اللہ تجھے سرفراز کرے گا اور کامل طور پر سربلندی بخشے گا ؟
اور دوسرا سوال یہ ہے کہ مندرجہ آیت ۴ جو حضرت یوسفؑ کا خواب ہے اور وہ اپنے والد کو اپنا خواب سنا رہے ہیں ۔ اس آیت کے دو آخری الفاظ حضرت یوسفؑ کے کلام سے کٹ کس طرح گئے کہ ان کا ضمیر بھی پھر گیا اور یہی دو الفاظ خواب کا آخری کیف بھی بن گئے اور خواب اور اس کی تعبیر کے دو ٹکڑے کر دیئے ؟ کیا لِیْ سٰجِدِیْنَ سے پہلے رَاَیْتُهُمْ تک یوسفؑ کا کلام کوئی بامعنیٰ کلام بن بھی سکتا ہے ؟

سجدہ تعظیمی : رہا یہ سوال کہ غیر اللہ کو سجدہ جائز نہیں ہے تو ستاروں اور شمس وقمر نے بموجب آیت ۱۲/۴ اور یوسفؑ کے بھائیوں اور والدین نے بموجب آیت نمبر ۱۲/۱۰۰ یوسف علیہم السلام کو سجدہ کیوں کیا ؟ اسی طرح فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیوں کیا تھا ؟ تو اس کا جواب مفسرین نے دو طرح سے دیا ہے :-
(۱) ۔ یہ سجدہ لغیر اللہ اللہ ہی کے حکم سے حرام ہے اور اگر اللہ کا ہی حکم کسی دوسری چیز کو سجدہ کرنے کا ہو تو یہ

اللہ کے ہی حکم کی تعمیل ہے۔ جو بظاہر تو اس چیز کو سجدہ ہے لیکن حقیقت میں اللہ ہی کی عبادت ہے جیسے حجرِاسود کو چومنا یا بیت اللہ کیطرف منہ کرکے نماز ادا کرنا یا اس کی دیواروں سے تضرع کے ساتھ چمٹنا۔ اسی طرح فرشتوں کا آدم کو سجدہ اللہ ہی کے حکم کی تعمیل اور اسی کی عبادت تھا۔ یہی صورت ستاروں اور یوسفؑ کے بھائیوں اور والدین کے سجدہ کی تھی۔

(۲)۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ یا ستاروں یا یوسفؑ کے بھائیوں اور والدین کا یوسفؑ کو سجدہ سجدۂ عبودیت نہیں بلکہ سجدۂ تعظیمی ہے جو وقتی چیز تھی۔ گو اس قسم کا سجدۂ تعظیمی بھی شریعت محمدی میں حرام قرار پایا مگر پہلی شریعتوں میں جائز تھا جیسا کہ مذکورہ آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

(۴) غلہ کی قیمت کی واپسی: ارشادِ باری ہے:۔

وَجَاۤءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ (۱۲/۵۸ تا ۶۵)

اور یوسفؑ کے بھائی (کنعان سے مصر غلہ خریدنے کیلئے) آئے تو یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا اور وہ پہچان نہ سکے۔ اور جب یوسفؑ نے ان کا سامان سفر تیار کر دیا تو ان سے کہا کہ تم میرے پاس اپنا بھائی بھی لاؤ جو تمہارا باپ کی طرف سے بھائی ہے تم دیکھتے نہیں کہ میں پورا پورا ماپ دیتا ہوں اور مہمانداری بھی خوب کرتا ہوں پھر اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیئے نہ تو کوئی غلہ ہے اور نہ ہی تم میرے پاس آنا۔

وہ کہنے لگے ہم اس بھائی کے متعلق اسکے باپ کو آمادہ کریں گے اور یہ کام کرکے رہیں گے۔ اور یوسف نے اپنے خادموں سے کہا کہ ان کی ادا کردہ قیمت بھی ان کی کھرجیوں میں رکھ دو تاکہ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو اسے پہچان لیں تاکہ وہ پھر واپس آئیں۔

پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس پہنچے تو کہنے لگے اے ہمارے ابا! (جبتک ہم اپنے بھائی بنیامین کو اب ساتھ نہ لے جائیں گے) ہم سے غلہ کی بندش کر دی گئی ہے لہٰذا ہمارے اس بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دو تاکہ ہم غلہ لا سکیں۔ اور ہم اس کے نگہبان ہیں یعقوبؑ کہنے لگے کیا میں پھر تم پر اعتبار کر دوں جیسے اس سے

پیشتر اس (بنیامین) کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں تم پر اعتبار کیا تھا؟ سو اللہ ہی بہتر محافظ ہے۔ پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی انہیں واپس کر دی گئی ہے تو کہنے لگے۔ ابا! ہمیں اور کیا چاہیئے۔ دیکھو یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئی ہے۔ اب ہم اپنے اہل و عیال کیلئے غلّہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک بار شتر غلّہ زیادہ لائیں گے۔ اب کی بار غلّہ لانا کیسا آسان ہو گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پہ ذہن میں آتی ہیں :۔

(۱)۔ جب برادران یوسفؑ آپ کے پاس پہنچے تو آپؑ نے انہیں پہچان لیا اور اپنا چھوٹا بھائی اور بوڑھے والدین بھی یاد آگئے۔ آپ نے ان کی عزت و تکریم بھی کی اور فوراً غلّہ بھی اپنی نگرانی میں بھروا کر انہیں تیار کر دیا۔

(۲)۔ اپنے چھوٹے حقیقی بھائی سے ملاقات کی شدید آرزو تھی۔ لہٰذا روانگی کے وقت یہ بھی کہہ دیا کہ آئندہ جب آؤ تو اس بھائی کو ضرور ساتھ لانا ورنہ غلّہ ملنا تو درکنار میں تم سے ملاقات کا بھی روادار نہ ہوں گا۔ چنانچہ انہوں نے وعدہ کر لیا کہ جیسی بھی صورت ہو ہم اسے ضرور ساتھ لائیں گے۔

(۳)۔ یوسفؑ نے ان کے غلّہ میں ان کی ادا کردہ قیمت بھی رکھ دی تاکہ انہیں از سر نو سرمایہ فراہم کرنے میں دقت نہ ہو اور جلد از جلد دوبارہ غلّہ لینے آئیں۔

(۴)۔ گھر آکر غلّہ کھولنے سے پیشتر اپنے باپ کو شاہِ مصر (یوسفؑ) کا پیغام دیا لیکن وہ یوسفؑ والے سابقہ واقعہ کی وجہ سے بنیامینؑ کو بھیجنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

(۵)۔ جب سامان کھولا تو اپنی راس بھی کھرجیوں میں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائے اور دوبارہ والد سے اصرار کرکے کہنے لگے کہ دیکھو شاہِ مصر کتنا اچھا آدمی ہے جس نے ہم پر اتنی مہربانی کی کہ ہماری رقم بھی واپس کر دی۔ جو غلّہ ہم لائے وہ تھوڑا ہے اور دوبارہ غلّہ لانا آسان ہو گیا ہے۔ پھر ایک اونٹ اس بھائی کا غلّہ زیادہ بھی ملیگا۔ لہٰذا آپ کو اسے ہمارے ساتھ ضرور بھیجنا چاہیئے اور ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔

(۳)۔ راشننگ سسٹم اور بنیامین کا زائد کارڈ :

اب اثری تاویلات ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں :۔

"قحط کے برسوں میں غلّہ ارزاں نرخوں پہ شاہی کنٹرول نرخوں کے مطابق فروخت ہونے لگا۔ اطراف و جوانب کے لوگ غلّہ وصول کرنے لگے۔ برادرانِ یوسفؑ بھی مصر پہنچے۔ تو ان کی مہمان نوازی فرمائی اور غلّہ بھی ضابطہ کے مطابق

پھرا تو برادرانِ یوسفؑ نے اپنے بھائی کی طرف سے افسر محکمہ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ اس کے نام کا بھی غلّہ دیا جائے۔ تو آپ نے درخواست پڑھ کر فرمایا کہ ضابطہ کے خلاف مناسب نہیں۔ آپ اسے اپنے ہمراہ لا کر اس کا کارڈ بنوالیں مگر اُس کی حاضری کے بغیر اس کا ٹکٹ بنا کر غلّہ نہیں دیا جا سکتا۔" (ص۔ ۱۶۵)

اثری صاحب کے اس تفسیری بیان پر کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں:

(۱)۔ قرآن کے الفاظ تو یہ بتلاتے ہیں کہ یوسفؑ کو اپنے بھائی کو ملنے کی آرزو تھی لہٰذا انہوں نے بھائیوں کو تاکید کی کہ آئندہ اسے ضرور ساتھ لانا ورنہ تمہیں بھی غلّہ نہ ملے گا۔ لیکن اب اثری صاحب کہتے ہیں کہ بھائیوں نے جب غلّہ وصول کر لیا تو انہیں ایک بار شتر مزید غلّہ لینے کی ہوس نے مجبور کیا تو انہوں نے افسر محکمہ (فوڈ کنٹرولر) کے پاس درخواست دی جو آہستہ آہستہ حضرت یوسفؑ تک پہنچی۔ انہوں نے دس عدد درخواست دینے والے سب بھائیوں کو اپنے پاس پھر بُلایا۔ اور انہیں طریقہ بتلایا کہ بھائی میاں! اس شخص کو ساتھ لا کر اس کا کارڈ بنواؤ اور ٹکٹ حاصل کرو۔ یہی ہمارا اصول ہے۔ اسی کے مطابق اسے غلّہ مل سکتا ہے۔

(۲)۔ ان برادرانِ یوسفؑ نے، جو پہلے غلّہ حاصل کر چکے تھے اور ان کا سامان بھی تیار کیا جا چکا تھا۔ کیا خود اپنے کارڈ بنوا کر غلّہ حاصل کیا؟ اور کیا کارڈ سسٹم یا ٹکٹ جاری کرنے کا اس دَور میں دستور بھی تھا یا نہیں؟ ان باتوں کو سوچنے کا یہ موقعہ نہیں۔ پھر اگر انہوں نے خود کارڈ بنوا کر غلّہ حاصل کیا تھا تو انہیں از خود معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ اس بھائی کی غیر موجودگی میں نہ کارڈ بن سکتا ہے نہ غلّہ مل سکتا ہے۔ پھر فوڈ کنٹرولر کو درخواست دینے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ حضرت یوسفؑ نے ان کی مہمان نوازی فرمائی تھی تو انہیں ہی کہہ دیتے کہ ہمارا ایک اَور بھائی ہے۔ اگر ہم فوڈ کنٹرولر کو درخواست دیں تو وُہ بالآخر آپ ہی کے پاس آنی ہے لہٰذا ہماری یہ درخواست خود ہی وصول پاکر آرڈر کر دیں؟

(۳)۔ اب ایک سوال اثری صاحب کے ذہن میں آیا کہ اگر اس دَور میں راشن کا ایسا ہی سسٹم تھا تو یوسفؑ نے یہ کیوں کہا کہ اگر تم اسے ساتھ نہ لائے تو تمہیں بھی راشن نہیں ملے گا۔ یہ بھلا کونسا ضابطہ ہے؟ کہ جن کے پاس راشن کارڈ موجود ہوا نہیں بھی غلّہ نہ ملے۔ تو اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں

۲۔ تاکید کی وجہ: "بھائی کو ہمراہ لانے یا نہ لانے سے ان کے اپنے غلّہ کا کوئی تعلق نہیں وہ بہرحال ملے گا کہ اس کی بنا قیمت ہے بھائی کو ہمراہ لانا نہیں۔ ہاں اس بنا پر ان کے غلّہ کی روک ہو سکتی کہ اگر اپنے بھائی کو ساتھ نہ لائے تو سمجھا جائے گا کہ تمہارا دراصل کوئی بھائی نہیں اور تم نے ایک زائد کارڈ بنوانے پر حکومت کو دھوکہ دیا ہے لہٰذا رعایتی غلّہ میں تمہارا کوئی حق نہ ہوگا۔" (ص ۱۶۷)

اثری صاحب نے غلّہ نہ دینے کی وجہ تو تلاش فرمائی مگر مشکل یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ فَعَرَفَهُم

یُوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا تھا۔ تو کیا یُوسفؑ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ فی الواقع ان کا ایک اور بھائی ہے جس کے لیئے یہ کارڈ بنوانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اس میں دھوکہ دہی کی کیا بات تھی؟

اب آگے چلیئے۔ فرماتے ہیں :۔

(۲) اُجرت بار برداری : "چنانچہ آپ نے اپنے کارندوں کو ہدایت فرمائی کہ ان سے قیمت وصول کرتے وقت شتر بانوں کو اُجرت (کرایہ بار برداری) اسی سے مجریٰ کر دیا جائے کہ وُہ غلّہ اُتار کر ان سے کرایہ وصول نہ کریں۔ گھر پہنچ کر جب ساربانوں نے اُونٹوں سے بوریاں کھول کر اتاریں تو ان کو کرایہ ادا کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ کرایہ ہم نے وصول کر لیا ہُوا ہے۔ تب انہوں نے اپنے باپ سے عرض کی کہ ابّا جان! بادشاہ نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے کہ ہماری قیمت میں کرایہ مجُرا فرما کر ہمارے کرایہ کی رقم کو ہماری نذر کر دیا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا سلوک ہو سکتا ہے جو کہ کسی کے ساتھ کیا جائے۔" (ص ۱۶۵)

"آیات متعلقہ کا مطلب میں نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے جو کہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اور دیگر نئے اور پُرانے مفسّرین کا خیال کہ یُوسفؑ نے اپنے کارندوں سے کہہ کر ان کی قیمت بوریوں میں بھروا دی تو ایسا کرنا دو حال سے خالی نہیں یا تو انہیں بتا دیا تھا۔ اس صُورت میں رقم ہاتھ میں دینا بہتر تھی اور اگر نہیں بتایا تو بوریوں میں یوں ہی قیمت ڈال دینا کونسی عقلمندی ہے۔ نہ معلوم کون بوریاں کھولے گا اور کس کے ہاتھ میں رقم آئیگی ایسا کوئی نبی تو کیا کوئی معمولی عقلمند[1] بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسا مطلب بیان کرنا مناسب نہیں۔" (ص:۱۶۶)

"[1] اگر یُوسفؑ نے اپنے بھائیوں کی بوریوں میں رقم رکھی تھی جسے انہوں نے گھر جا کر نکالا تو وُہ پیمانہ کے برآمد ہونے پر صاف کہہ سکتے تھے کہ یہ حکومت کے کارندوں کا کام ہے۔ انہوں نے پہلے بھی رقم رکھ دی تھی اس وقت تو چور کہہ کر نہ پکارا، اب چوری کا الزام دیا جا رہا ہے جو کہ سراسر بے انصافی ہے مگر انہوں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بوریوں میں کوئی رقم نہیں رکھی گئی۔ یہ بار برداری کا خرچ تھا جو انہیں معاف کیا گیا۔ (حاشیہ ص ۱۶۶)

بضاعۃ کی لغوی تحقیق : اس ساری بحث میں توجّہ طلب اَمر یہ ہے کہ لفظ بضاعۃ کا لغوی معنیٰ کیا ہے؟ حافظ صاحب نے اس کا معنیٰ کرایہ بار برداری بتلائے ہیں لیکن اس کے لیئے نہ کوئی لُغت سے حوالہ درج فرمایا اور نہ ہی کوئی دلیل پیش کی۔ محض کسی مطلب کا ان کے نزدیک پسندیدہ ہونا تو کوئی سند یا حجّت نہیں بن سکتا۔

لفظ بضاعۃ کے لغوی معنیٰ "مال کا وافر حصّہ جو تجارت کے لیئے الگ کر لیا گیا ہو اور اَبْضَعَ بمعنی پُونجی یا سرمایہ جمع کرنا (مفردات امام راغب) اور بمعنی تجارت کا سامان، سرمایہ، پونجی (منجد۔ عربی۔ اُردو) اور بمعنی "پارہ از مال

کہ بداں تجارت کنند (منتہی الارب عربی۔فارسی) اور بمعنی طائفۃ من المال تقطع للتجارۃ (محیط المحیط۔عربی بعربی)
اب دیکھئے ان سب اہلِ لغت کے نزدیک بضاعۃ کا معنیٰ سرمایہ، پونجی۔ تجارت کے لیئے زائد مال یا تجارت کا سامان ہے کسی نے کرایہ بار برداری کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ لہٰذا حافظ صاحب کے پسندیدہ مطلب کی ساری عمارت از خود منہدم ہوجاتی ہے۔

اَب رہا نئے اور پُرانے سب مفسّرین کا یہ خیال کہ حضرت یُوسف نے قیمت ان کی بوریوں میں رکھوادی۔ یہ محض ان نئے اور پُرانے مفسّرین کا خیال ہی نہیں بلکہ اجعلوا بضاعتھم فی رحالھم کا ٹھیک ترجمہ ہے اگر اسے آپ کی عقل پسندیدہ نہ سمجھے تو قصور کس کا سمجھا جائے؟ قرآن کا یا نئے اور پُرانے مفسّرین کا یا قبلہ حافظ صاحب کا؟ حافظ صاحب کا پسندیدہ مطلب تو صرف اس صُورت میں بن سکتا ہے کہ بضاعۃ کا معنیٰ فرض کرلیا جائے "باربرداری کا کرایہ" اور فی رحالھم کا معنیٰ فرض کرلیا جائے "شتربانوں کے ہاتھوں میں دینا"۔ مگر ایک مشکل پھر بھی رہ جاتی ہے اور وُہ یہ ہے کہ مجرای کرنا کس لفظ کا معنیٰ کیا جائے؟

نہ معلوم حافظ صاحب کو شتربانوں کی کیا سُوجھی! اس دَور میں اگر باربرداری کا عام ذریعہ اُونٹ تھے تو سواری کا بھی عام ذریعہ اُونٹ ہی ہوتے تھے۔ یوسفؑ کے دس بھائی غلّہ لینے آئے تو اپنے اونٹوں پر سوار ہوکر آئے اور انہیں پر اپنا غلّہ لاد کرلے گئے اور جب یوُسفؑ نے تاکید کی کہ آئندہ اپنے بھائی کو ساتھ لانا تو انہوں نے بھی یہی سمجھا کہ ہمیں ایک بارِ شتر غلّہ زائد مل جائے گا۔ اب جو حافظ صاحب نے کرایہ کے شُتربان بھی ساتھ لا کھڑا کیئے ہیں تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ فی کس کتنا راشن ملتا تھا؟ اور اگر فی کس ایک بارِ شُتر ہی ملتا تھا تو پھر وُہ اُونٹ بھی وہی ہوتے تھے جن پر سوار ہوکر لوگ غلّہ لینے آتے تھے یہ شتربان کہاں سے آگئے؟

رہی یہ بات کہ اس طرح بوریوں میں رقم بھرنا عقلمندی نہیں معلوم نہیں کس کے ہاتھ آجائے؟ تو ہمیں از روئے قرآن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم ان بھائیوں کے سوا کسی کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ نہ ہی اس کا احتمال تھا کہ کسی اَور کے ہاتھ لگ جائے علیحدہ کرایہ دار شتربانوں کا سلسلہ بنا کھڑا کرنا، ہی بے ہودہ سی بات ہے کہ شائد رقم ان کے ہتھے چڑھ جائے۔

ایک دُوسرا اعتراض حافظ کا صاحب کا یہ ہے کہ اگر رقم واپس کرنا تھی تو بھائیوں کے ہاتھ میں دے دیتے۔ تو اس کا جواب ایک عام عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس صُورت میں یہ عین ممکن تھا کہ برادران یوسفؑ جو پہلے ہی غلّہ پُورا پُورا ملنے یعنی پورے دس بارِ شتر غلّہ ملنے، فوراً ملنے اور عزّت وتکریم کی وجہ سے پہلے ہی بہت زیادہ زیربارِ احسان تھے۔ قیمت بھی واپس لینے سے انکار کردیتے۔ یُوسفؑ نے احسان ایسی صُورت میں کیا کہ وہ رقم واپس بھی نہ کرسکیں اور ان پر احسان بھی ہوجائے۔

اثری صاحب کے نزدیک قیمت واپس نہ کرنے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ کارندوں نے رقم بوریوں میں بھر دی تھی جسے انہوں نے گھر جاکر نکالا تو وُہ پیمانہ برآمد ہونے پر بھی کہہ سکتے تھے کہ ایسا کام تو پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اب کی بار ہمیں کیوں الزام دیتے ہو؟ لیکن چونکہ بھائیوں نے ایسا بیان نہیں دیا لہٰذا رقم کھرجیوں میں رکھنے کی بات غلط ہے۔ اس دلیل کا جواب بالکل واضح ہے کہ جو رقم واپس ہوئی وہ ان کی جانی پہچانی اور اتنی ہی تھی جتنی دے آئے تھے۔ انہیں یہ رقم برآمد کرکے چنداں تعجب نہیں ہوا کہ یہ رقم کتنی ہے اور کیسی ہے؟ بلکہ وُہ اپنی پُوری رقم دیکھ کر یُوسف کے اس احسان کا خوش ہو کر اپنے باپ سے بھی ذکر کرتے ہیں جبکہ پیالہ دیکھ کر بھی انہیں یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ کیسا تھا اور کیسے ہمارے سامان میں آ گیا؟

(۵) یُوسف کی بھائی کو پاس رکھنے کی تدبیر: پھر جب دُوسری بار برادرانِ یوسف اپنے چھوٹے بھائی کو لانے میں کامیاب ہو کر ساتھ لے آئے تو حضرت یُوسف چاہتے تھے کہ اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس ہی رکھ لیں۔ برادرانِ یوسف کے اس دَورہ کے حالات اللہ تعالیٰ نے یُوں بیان فرمائے ہیں:۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ آوٰى إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ۔ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ قَالُوا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۔ فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ (۱۲ / ۶۹-۷۶)

اور جب وہ یُوسف کے پاس پہنچے تو یُوسف نے اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ میں تمہارا بھائی ہُوں تو جو سلوک یہ (ہمارے ساتھ) کرتے ہیں اس پر افسوس نہ کرنا۔ پھر جب یُوسف نے ان کا سامان تیار کرایا تو اپنے بھائی کی کُھرجی میں پیالہ رکھ دیا۔ پھر (جب وہ روانہ ہو گئے) تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ تم تو چور ہو۔ برادرانِ یوسف انکی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟ وُہ بولے کہ بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور جو کوئی اسے لے آئے اسکو ایک بار شتر انعام اور میں اس کا ضامن ہوں۔ برادرانِ یوسف کہنے لگے خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں اسلیے نہیں آئے کہ یہاں خرابی کریں اور نہ ہی ہم چوری کیا کرتے ہیں۔ وہ بولے اگر تم جھُوٹے نکلے (یعنی کسی سے چوری برآمد ہو گئی) تو اس کی کیا سزا؟ برادرانِ یُوسف کہنے لگے کہ جس کسی کے سامان سے مال برآمد ہو وہ شخص اس کا بدل ہے۔ اور ہم ظالموں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر

یُوسف کے بھائی کی کھرجی سے پہلے دُوسروں کی کھرچیوں کو دیکھنا شروع کیا پھر اسے بھائی کی کھرجی سے برآمد کرلیا۔ اسطرح ہم نے یُوسف کیلئے تدبیر کی۔ بادشاہ کے قانون کے مطابق وہ مشیتِ خُدا کے سوا اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے۔

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) برادرانِ یوسف، بنیامین سے بھی اچھا سلوک نہیں کرتے تھے اور یہی بنیامین یُوسفؑ کے ماں باپ دونوں طرف سے حقیقی بھائی تھے۔ یُوسفؑ نے اسی بدسلوکی سے بچانے کی خاطر بنیامین کو لانے کی تاکید کی تھی۔ وُہ آگیا تو اسے اپنے ہاں ٹھہرایا اور بتلا دیا کہ میں ہی تیرا گمشدہ بھائی یُوسف ہوں۔ اب تم ان بھائیوں کی بدسلوکی پر پریشان ہونا چھوڑ دو۔

(۲) یوسفؑ اس بھائی کو اب آئندہ اپنے بھائیوں کے سپُرد نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ وُہ کنعان کے قانون سے بھی واقف تھے اور مصر کے قانون سے بھی۔ انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لیئے یہ تدبیر اختیار کی کہ جب بھائیوں کا سامان سفر تیار کر دیا تو بادشاہ کا پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں چوری چھپے رکھ دیا۔ کنعان کا قانون یہ تھا کہ جس شخص کے پاس سے چوری کا سامان برآمد ہو جائے۔ وہ اس شخص کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا جس کی چوری ہوئی ہو۔ مصری حکومت کا قانون یہ تھا کہ ایسے ملزم کو سپردِ حوالات کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس ضمن میں یہ فرماتے ہیں کہ یہ تدبیر ہم نے یوسفؑ کو سجھائی تھی۔ کذلک کدنا لیوسف (۱۲/۷۶)

(۳)۔ پھر یہ بات مشہور ہوگئی کہ بادشاہ کا پیالہ چوری ہو گیا۔ برادرانِ یوسفؑ سفر پر روانہ ہوئے ہی تھے کہ پیچھے سے چند آدمی آئے اور کہنے لگے کہ تم چور ہو۔ برادرانِ یوسفؑ نے کہا ہم یہاں چوری کرنے تو نہیں آئے تھے، جواب میں ایک لیڈر بولا۔ پھر اگر تم سے برآمد ہو جائے تو؟ برادران یوسف نے کہا۔ اگر مال برآمد ہو جائے تو جس کے سامان سے وہ برآمد ہو وُہ شخص آپ لوگوں کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ کیونکہ ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے۔ ایک بھائی کا یہ کلام بھی اللہ کی اس تدبیر کے تحت وقوع پذیر ہوا ورنہ اگر وہ کچھ نہ بولتا تو حضرت یوسفؑ اور بنیامین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔

(۴)۔ تلاشی لینے والا پہلے تو دُوسروں کے سامان دیکھتا رہا۔ پھر یُوسفؑ کے بھائی بنیامین کے سامان سے وہ پیالہ برآمد کرلیا۔ اس طرح بنیامین یوسفؑ کی تحویل میں آگیا اور یہی یوسفؑ کی مرضی تھی۔ برادرانِ یوسفؑ نے اپنے باپ سے پختہ وعدہ کرنے کی وجہ سے کوشش تو بہت کی کہ بنیامین کو واپس لے جائیں اور ان کی جگہ کوئی اور بھائی یوسفؑ کی تحویل میں رہ جائے مگر یہ بات ایک تو یُوسفؑ کی مرضی کے خلاف تھی دُوسرے

برادرانِ یوسف خود ہی اس کے متعلق اپنا قانون بیان کر چکے تھے لہٰذا ان کی یہ استدعا مسترد کر دی گئی۔

اس تدبیر کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیوں کیا؟

(۵)۔ اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کی یہ تدبیر یوسفؑ کو اللہ پاک نے سجھائی تھی جیسا کہ ارشادِ باری ہے کذلك کدنا لیوسف۔ ورنہ اگر اللہ نہ چاہتا تو یوسفؑ کو کوئی ایسی تدبیر نظر نہیں آ رہی تھی جس کی بنیاد پر وُہ بنیامین کو اپنے پاس رکھ سکتے۔ اس طرح گویا ایک تو اللہ کا یوسفؑ پر یہ احسان تھا کہ اس تدبیر سے بنیامین اور یوسفؑ کو جو ایک طویل مدّت سے بچھڑے ہوئے تھے ملا دیا اور اکٹھا رہنے کا موقعہ مہیّا کیا۔ دُوسرے بنیامین کو بھائیوں کی بدسلوکی سے نجات ملی۔ اور اپنے بھائی کے سایۂ عاطفت میں آ کر کسی حد تک تلافی مافات ہو گئی۔ گویا نہ یوسفؑ بنیامین کو واپس بھیجنا چاہتے تھے اور نہ ہی بنیامین ان حالات میں ان کے ساتھ واپس جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس کے سامان میں پیالہ چھُپانے، پھر انہیں برادرانِ یُوسفؑ سے سزا پُوچھنے کی ساری تدبیر بنیامین سے مشورہ اور اطلاع کے بعد کی گئی تھی۔ اگرچہ اس تدبیر میں تھوڑی دیر کے لیے بنیامین کی سبکی تھی کہ اس پر چوری کا دھبّہ لگا۔ لیکن بعد میں جب دونوں بھائیوں نے حقیقتِ حال اور اصل مصلحت دنیا پر واضح کر دی تو یہ دھبّہ بھی دُھل گیا۔ چنانچہ اس راز میں حضرت یوسفؑ نے پیالہ تو خود رکھا مگر نکالا کسی دُوسرے نے اس طرح یہ راز راز ہی رہا۔

اب بات یہ رہ جاتی ہے کہ جب پیالہ خود حضرت یوسفؑ نے چھپایا تو اسے اللہ نے اپنی طرف کیوں منسُوب کیا؟ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو ہم دے چکے ہیں کہ یہ تدبیر اللہ ہی نے یُوسفؑ کو سجھائی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ ہی نے انجام تک پہنچایا: اگر برادرانِ یُوسف خود ہی اپنا مکمل قانون جو شریعت ابراہیمی پر مبنی تھا بیان نہ کرتے اور اس پر اپنی رضا مندی کا اظہار نہ کرتے تو پھر حضرت یوسف بنیامین کو اپنے پاس نہ رکھ سکتے تھے اور معاملہ کوئی اور صُورت اختیار کر جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بات یُوسفؑ کو سجھائی دُوسری برادرانِ یُوسفؑ کو۔ تو اس طرح معاملہ درست ہو گیا۔

اَب دیکھیئے اثری صاحب کو اس تفسیر پر یہ اعتراض ہے کہ اس طرح پیالہ چھُپانا جس سے اس کا بھائی چور ثابت ہو نبی کی شان کے شایان نہیں بلکہ وُہ تو اسے یہودیوں کی سازش قرار دیتے ہیں جس میں مسلمان مفسّرین شکار ہو گئے ہیں (ص ۷، حاشیہ)

سقایہ وصواع کی بحث:

(۶) اب جو اثری صاحب نے نئی تاویلات فرمائی ہیں۔ وُہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں:۔

(۱) جعل السقایۃ فی رحلِ اخیہ میں سقایہ سے مُراد پانی پینا پلانا ضیافت یا ٹی پارٹی ہے اور رحل کے معنیٰ ہیں کمرہ یا قیام گاہ۔ گویا یُوسفؑ نے جاتی دفعہ اپنے بھائی بن یامین کے کمرے میں ان سب بھائیوں کی ضیافت کی۔ چلئے یہ درست تسلیم کر لیتے ہیں کہ سقایہ اور رحل کے الفاظ میں لغوی لحاظ سے ان معنوں کی بھی گنجائش ہے مگر سوال یہ ہے کہ جب تلاشی لینے والے برادرانِ یوسفؑ سے چور کی سزا پُوچھتے ہیں تو وُہ کہتے ہیں کہ مَنْ وُجِدَ فِی رَحْلِہٖ فَھُوَ جَزَآءُہٗ تو اس موقعہ پر اثری صاحب خود ہی رحل کا معنیٰ "سامان (بوری)" (ص ۱۷۰) کر رہے ہیں۔ ان کی ضیافت کے دوران ہی (ان کی تفسیر کے مطابق سوال جواب ہو رہے ہیں تو رَحل کا معنیٰ اسی وقت بدل جاتا ہے۔

پیالہ کی گمشدگی کی وجہ: (۲) نفقد صواع الملک۔ آپ فرماتے ہیں کہ سقایہ کے معنیٰ ضیافت اور صواع کے معنیٰ ہیں۔ پیمانہ لہٰذا جعل السقایۃ" اور نفقد صواع کا آپس میں کچھ تعلق نہیں۔ اس طرح غالباً آپ یُوسفؑ کو پیالہ رکھنے سے بچانا چاہتے ہیں۔ یہ خیال تو اچھا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا صواع کے معنی پیمانہ ہے بھی یا نہیں؟ منجد اُٹھا کر دیکھئے "الصّاع والصّوع والصُّوْع۔ ایک پیمانہ ہے جو دو سیر چودہ چھٹانک چار تولہ کے مساوی ہوتا ہے اور اس کی جمع اَصْوَاعٌ، اَصْوُع، اَصْوُعٌ، صُوْعٌ اور صِیْعَانٌ آتی ہے لیکن صُوَاع کا معنی پانی پینے کا پیالہ ہے۔ اس کا دُوسرا کوئی معنیٰ نہیں (منجد) لہٰذا حافظ صاحب قبلہ کو غالباً صاع اور صُوَاع میں اشتباہ کی وجہ سے غلطی لگ گئی کہ ہر جگہ صواع کا معنیٰ پیالہ کے بجائے پیمانہ کرتے چلے گئے ہیں اور اسی وجہ سے غالباً آپ نے جعل السقایۃ اور نفقد صواع کا آپس میں ربط منقطع کر دیا ہے اور سقایہ کے معروف معنیٰ پیالہ کو چھوڑ کر پینے پلانے کے مقام تک چلے گئے ہیں۔ مشہور محقّق قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی تفسیر سورہ یوسف الجمال والکمال میں لفظ صواع پر اپنی لغوی تحقیق اس طرح پیش کی ہے:۔

"صواع۔ پانی پینے کا وہ برتن جو چاندی یا سونے کا ہو۔ اگر کانچ کا ہو تو اُسے قَدح، لکڑی کا ہو تو عُسّ، چمڑے کا ہو تو علبہ اور مٹی کا ہو تو مزکن کہتے ہیں۔ صواع وہی ہے جسے آیت بالا میں سقایہ کہا گیا تھا۔ وہ بلحاظ استعمال تھا یہاں صواع بلحاظ جنس ہے"

(الجمال والکمال ص۱۱۲ مطبوعہ مکتبہ دعوۃ فیصل آباد)

(۳)۔ آپ پیمانہ کی گمشدگی کی وجہ اب یہ بتلاتے ہیں کہ منڈی میں کوئی آڑھتی[1] بیٹھا دھاندلیں یا پیمانے

---

[1] یاد رہے کہ پہلے حافظ صاحب یہ فرما رہے تھے کہ لوگوں کو راشن، راشن ڈپوؤں سے ملتا تھا۔ اب پیمانہ گم ہونے پر کھلی منڈی کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

گن گن کر بوریاں بھر رہا تھا کہ اسے اچانک پیشاب آ گیا ہوگا یا کسی دُوسری ضرورت سے جانا پڑا ہوگا تو اس نے وُہ پیمانہ پھینکا بوری میں اور جب آیا تو اُسے وُہ پیمانہ نکالنے کا خیال نہ رہا۔ منڈیوں میں عام باٹ اور پیمانے پڑے ہوتے ہیں۔ اس نے اِدھر اُدھر کوئی دُوسرا پیمانہ پکڑا تو بوری پُوری کر کے اُسے سی دیا۔ شام کو جب پیمانے گِنے گئے تو ایک پیمانہ کم نکلا تو اس کی تلاش شروع ہوگئی۔ برادرانِ یوسف ابھی ضیافت ہی اُڑا رہے تھے کہ تلاشی لینے والے[1] آن پہنچے اور فریقین میں گفتگو شروع ہوگئی۔ اثری صاحب برادرانِ یُوسف کے اس جواب مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "جس کے سامان (بوری) سے پیمانہ برآمد ہو۔ اس پر آپ مقدمہ چلائیں اور وُہ خود اس مقدمہ کی اصالتاً پیروی کرے۔ دُوسروں کو اس سے کیا واسطہ"؟ (ص ۱۷۰)... "بھائیوں نے بعد میں پُوری کوشش کی کہ کوئی مختار بن کر وکالتاً مقدمہ کی پیروی کرے مگر چُونکہ وہ اقرار کر چکے تھے کہ ملزم اپنے مقدمہ کی خود پیروی کرے گا لہٰذا عدالتِ عالیہ نے صاف انکار کر دیا کہ ایسے فوجداری مقدمات میں کوئی مختاری نہیں"؟ (ص - ۱۷۱)

اب دیکھئے آیت مذکورہ کے ٹکڑا کے صرف چھ گنے چنے الفاظ ہیں جن کی اتنی لمبی چوڑی داستان آپ نے بنا دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر مقدمہ کا کھڑا ہونا پھر اس کی اصالتاً پیروی کرنا عدالتِ عالیہ تک مقدمہ کا پہنچ جانا۔ پھر عدالتِ عالیہ کا بھی وکالتاً پیروی سے صاف انکار کر دینا آخر کون سے الفاظ کا ترجمہ یا مطلب ہے۔ اس طرح کی داستان گوئی تو شاید صاحب قصص المحسنین نے بھی نہ کی ہوگی۔

(۴) "پھر مقدمہ مصری عدالت میں پیش ہُوا تو اگرچہ کارگذار نے اسے اپنے پُورے علم سے بنایا اور تیار کیا۔" (یہ لفظ اَخَذَ کی تفسیر ہو رہی ہے فرماتے ہیں) "اَخَذَ کے معنی ٹھہرنا نہیں بلکہ مقدمہ کی پختہ صُورت بنا کر عدالت (چھوٹی یا عالیہ) میں پیش کرنا مُراد ہے"؟ (ص ۱۷۱ حاشیہ)

اب دیکھئے کہ مُراد لینے کا یہی طریق گزید اختیار کر کے یہ کہتا ہے کہ اَخَذَ کے معنی پکڑنا یا لینا نہیں بلکہ اس سے "برادرانِ یوسف کی بوریوں میں گندم بھرنا اور انہیں جانبِ کنعان روانہ کرنا مراد ہے"۔ تو آپ اسے کیا جواب دے سکتے ہیں؟ قرآن کے ساتھ کھیلنے کا جیسا حق قبلہ حافظ صاحب کو ہے ویسا زید کو بھی ہے۔

---

[1] اثری صاحب کی علیحدہ اپنے کمرے میں ضیافت اڑانے اور وہیں تلاشی لینے والوں کے آ پہنچنے والی تاویل اس لحاظ سے غلط قرار پاتی ہے کہ جب برادرانِ یُوسف اس واقعہ کے بعد واپس کنعان جاتے ہیں تو اپنے باپ کو اس چوری کی یقین دہانی یوں کراتے ہیں کہ:

واسئل القريۃ التی کنا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانا لصادقون (۱۲/۸۲)	اور جس بستی میں ہم تھے وہاں سے (یعنی اہل مصر سے) اور جس قافلے میں ہم آئے ہیں اس قافلے سے دریافت کر لیجئے اور ہم (اس بیان میں) سچے ہیں۔

گر تلاشی کی واردات کمرۂ ضیافت میں ہوئی ہوتی تو برادران یوسف کو والعیر التی اقبلنا فیھا کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر قرآن کا جو حشر ہو سکتا ہے وہ سب سمجھ سکتے ہیں۔

(۵) آگے فرماتے ہیں: "یوسفؑ چونکہ اس ناگہانی مقدمہ سے سخت پریشان ہو رہے تھے۔ اللہ پاک نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اس مقدمہ کو کچھ ایسا مبہم اور کمزور کر دیا کہ اس میں جان ہی نہ رہی "کَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ" (۱۲: ۷۶) وہ کارگزار نہ تو کوئی ثبوت پیش کر سکا اور نہ کوئی موقع کی گواہی حاضر کر سکا اور اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ کوئی قانونی مواخذہ نہ کر سکا مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (۱۲: ۷۶) مگر ہاں وہی ایک بھاگ دوڑ اور ناکام کوشش کہ پیمانہ برآمد ہوا ہے۔ باربار پیش ہوتی رہی جس کے عدالت میں ایسے پرخچے اڑائے گئے کہ خوب گت بنی"۔ (ص: ۱۷۳)

اب دیکھیے اس تفسیر میں مندرجہ ذیل اُمور قابلِ توجہ ہیں:

(۱) شاید قبلہ حافظ صاحب کو خود بھی شرعی قانون کا پتہ نہیں کہ اگر کسی شخص سے چوری کا مال برآمد ہو جائے جبکہ کوئی شخص اس مال کا پہلے سے دعویدار بھی ہو تو یہ جُرم کا سب سے قوی ثبوت ہوتا ہے۔ گواہی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور مجرم قابلِ سزا سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ قانون صرف شرعی ہی نہیں بلکہ اکثر ممالک کا بھی یہی قانون ہے۔

(ب) وہ عدالت خواہ چھوٹی تھی یا بڑی بہرحال بُدھو ضرور تھی جو ایک شخص کے دعوٰی چوری اور دُوسرے سے بجنسہٖ مال برآمد ہو جانے کے بعد بھی گواہی طلب کرتی رہی اور اُلٹا دعوٰے پیش کرنے والے ہی کی گت بناتی رہی۔

(ج) کِدنا کا معنیٰ فرمایا ہے "ہم نے مقدمہ کو بے جان مبہم اور کمزور کر دیا"۔ لیکن اس معنیٰ کے لیے کسی لُغت سے حوالہ پیش کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ زید کہتا ہے کہ کِدنا کے معنی ہیں "ہم نے اس عمارت کو مسمار کر دیا" تو قبلہ حافظ صاحب اس کو کیا جواب دے سکتے ہیں؟ پھر اس مقام پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ بھی یاد آگئی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ تھی کیا؟ کیا یہ تھی کہ عدالت کی عقل پر پتھر پڑ جائیں اور وُہ مال کی بجنسہٖ برآمدگی کے بعد بھی گواہ طلب کرتی رہی اور بالآخر مقدمہ خارج کر دیا۔

مصری عدالتیں: اثری صاحب نے اس زمانہ کی مصری عدالتوں کے متعلق بہت اچھا تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ وہاں مصر میں چھوٹی عدالتیں بھی موجود تھیں۔ عدالت عالیہ بھی تھی۔ باقاعدہ مقدمات کی سماعت ہوتی تھی۔ وکیل کرنے اور بنانے کا رواج عام تھا۔ البتہ فوجداری مقدمات میں مجرم کی حاضری ضروری تھی لیکن ہمیں افسوس ہے کہ حقائق اثری صاحب کے بیان کا ساتھ نہیں دیتے۔ اثری صاحب کو یہ سب کچھ اپنی بات بنانے کے لیے لکھنا پڑا اور آپ نے بے دریغ لکھ دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں

مصر میں جنگل کا قانون رائج تھا۔ امراء مصر کو بہت ظالمانہ اختیار حاصل تھے۔ سوچئے حضرت یوسف کو کون سے جرم میں قید رکھا گیا تھا؟ کیا ان کی بے گناہی کی شہادت شاہد یوسف اور عزیز مصر خود بھی دے چکے تھے۔ پھر پھر یہ امراء اپنی بیگمات سے بھی مرعوب تھے۔ عزیز مصر کی بیوی اور چند بیگمات کی وجہ سے حضرت یوسف قید میں جا پڑے۔ اس سلسلہ میں ان پر عدالت کی طرف سے کسی مقدمہ کی سماعت ہوئی؟ فرد جرم عائد ہوا؟ سزا کے زمانہ کی تعیین ہوئی؟ کیا سزا یافتہ کو اپنے مقدمہ کی پیروی کا کوئی حق تھا؟ آخر اس زمانہ کی مصری عدالتوں میں وہ کون سی خوبی اثری صاحب کو نظر آئی کہ وہ مصری قانون کی ثنا میں رطب اللسان ہو گئے؟

حضرت یوسفؑ نے رہائی پانے والے ساتھی سے کہا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کر دینا کہ ایک بے گناہ مجرم قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں قیدیوں کے واسطے اپیل کرنے کا کوئی ضابطہ نہ تھا جس ظالم افسر نے چاہا کسی نا کردہ گناہ کو پکڑا اور قید میں ڈال دیا۔ نہ میعاد مقرر نہ عذر و فریاد کرنے کو کوئی چارہ کار تھا۔ مگر اثری صاحب کو تو اپنی باتیں جوڑنے سے غرض ہے۔ حقائق بے شک منہ چڑاتے رہیں۔

۷۔ حضرت یعقوب کی آنکھوں کا بے نور اور بعد میں روشن ہونا:

پھر آگے چل کر درج ذیل آیت کو اپنی تحقیق کا نشانہ بناتے ہیں:

وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ (۱۲/۸۴)	یعقوبؑ کی دونوں آنکھیں رنج و الم کی وجہ سے سفید ہو گئیں اور ان کا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ "یہ جو مشہور ہے کہ روتے روتے آپ اندھے ہو گئے تھے۔ یہ غلط ہے ایسی بے صبری سے تو مسلمانوں کو بھی روکا گیا ہے اور آپ تو پیغمبر تھے اور صبر جمیل کے پابند۔ لہٰذا یہ افواہ سراسر غلط ہے"....
پھر لغت کا حوالہ دے کر اس کا تحقیقی معنیٰ بتلاتے ہیں کہ "نگاہ کچھ کمزور ہو گئی ہو گی"۔ (ص ۱۶۷)

اب دیکھئے غم سے آنکھوں کا سفید ہو جانا یا غمگین رہنا یا آنسو جاری ہونا فطری اور بشری تقاضے ہیں اور یہ اضطراری امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ صبر جمیل یعقوبؑ کا اپنا ہی مقولہ ہے۔ اور اس کا خلاف صرف اس صورت میں ہو گا کہ انسان جزع فزع کرنا پھرے لیکن اس چیز کا کسی مفسر نے نام نہیں لیا۔

آپ نے فرمایا ہے کہ "نگاہ کچھ کمزور ہو گئی ہو گی"۔ حالانکہ ابیضت کا معنیٰ سفید ہونا یا بے نور ہونا ہے۔ اندھا ہونا (کہ آنکھیں بند ہو جائیں) یا کمزور ہونا نہیں۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیت بھی ان معانی کی ہی تائید کر رہی ہے:۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا (۹۶/۱۲) | پھر جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا تو کُرتہ یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دیا جس سے وہ بینا ہو گئے۔

اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبؑ کی آنکھیں کمزور نہیں بلکہ بے نور ہو گئی تھیں لیکن حافظ صاحب یہاں بھی اپنی عادت سے باز نہیں آئے لکھتے ہیں:

"ان کے ہاتھ والد صاحب کے لیئے ایک کرتہ بھی سلوا کر اپنی طرف سے بھیج دیا۔ تاکہ وہ اسے پہن کر خوش ہوں اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔" (ص ۱۸۰)

گویا فَارْتَدَّ بَصِیْرًا کے معنی "وُہ بینا ہو گیا" کے بجائے یہ ہدایت ہے کہ "آپ اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں"۔ یہ ترجمہ غالباً آپ کو اس لیے کرنا پڑا ہے کہ کُرتہ کے مُنہ پر ڈالنے سے کسی بے نور اور اندھے کا بینا ہو جانا ایک خرقِ عادت امر ہے۔ جو آپ کسی صُورت ماننے کو تیار نہیں۔ اس مقام پر آپ کو اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ بھی یاد نہیں آئی۔ اور ایک تو فعل ماضی کا ترجمہ فعل امر میں منتقل کر دیا۔ دُوسرے لغوی معنیٰ کا بھی ستیاناس کر دیا۔ تیسرے قرآنی آیات کا مفہوم بدل دیا۔ اور بزعم خویش ایک نبی کی عصمت بیان کرنے کی ذمّہ داری سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔

باب ۱۰

(۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام

ویسے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری زندگی میں بے شمار معجزات ظہور پذیر ہوتے رہے لیکن ہم یہاں صرف چند ایک زیادہ مشہور و معروف معجزات کا ذکر کریں گے۔

(۱) مچھلی کا دریا میں راستہ بنانا: جب حضرت موسیٰ اپنے ایک ساتھی کو لے کر خضر کی تلاش میں روانہ ہوئے تو اس سفر کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَاۗءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓي اٰثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ (۱۸: ۶۰-۶۵)

اور جب موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ جب تک میں دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ نہ پہنچ جاؤں ہٹنے کا نہیں خواہ برسوں چلتا رہوں۔ پھر جب وہ دریاؤں کے ملنے کے مقام پر پہنچے تو اپنی مچھلی بھول گئے اور مچھلی نے سرنگ بناتے ہوئے دریا میں اپنا راہ بنا لیا جب آگے چلے تو موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ہمارے لیے کھانا لاؤ اس سفر سے ہمیں تھکاوٹ ہو گئی ہے۔ اس ساتھی نے کہا دیکھیے جب ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا تو میں مچھلی (وہیں) بھول گیا اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔ (بات یہ تھی) کہ اس مچھلی نے وہاں عجب طرح سے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا۔ موسیٰ نے کہا یہی تو وہ مقام ہے جسے ہم تلاش کرتے تھے تو وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے واپس لوٹے۔ وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ (خضر) دیکھا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ جب موسیٰ اور ان کے ساتھی خضر کی تلاش کو نکلے تو ان کے ساتھ کوئی اپنی مچھلی بھی تھی۔

۲۔ خضر کی قیام گاہ کی علامت اُن کو یہ بتلائی گئی تھی کہ جس مقام پر یہ مچھلی مجمع البحرین کے کسی قریبی مقام پر جا کر اُچھل کر دریا میں چلی جائے وہی مقام ملاقات ہے۔

۳۔ ان لوگوں نے مجمع البحرین کے قریب ہی ایک چٹان کی اوٹ میں دم لیا۔ موسیٰ تو ستانے لگے ساتھی جاگتا تھا۔ دریں اثناء مچھلی تڑپی اور دریا میں چلی گئی۔

۴۔ یہ مچھلی دریا کے پانی میں اس طرح سرنگ بناتی جا رہی تھی جس طرح کسی جانور (چوہے یا سانپ) کا بل

ہوتا ہے یعنی پانی ملتا نہیں تھا۔

۵ ۔ جب موسیٰ علیہ السلام جاگے تو پھر آگے سفر شروع کر دیا۔ ساتھی کو مچھلی والا قصہ بتلانا یاد ہی نہ رہا۔

۶ ۔ جب آگے بڑھ گئے تو ایک مقام پر پہنچ کر پھر دم لیا اور موسیٰ نے ساتھی سے کہا۔ کھانا لاؤ تاکہ کھائیں تھکاوٹ بہت ہوگئی ہے ساتھی یوشع کو اس وقت بھولی ہوئی بات یاد آئی اور کہا کہ ہمارے پاس جو مچھلی تھی وہ تو ایسے عجیب طریقہ سے دریا میں چلی گئی جب کہ ہم چٹان کی اوٹ میں ٹھہرے تھے۔

۷ ۔ موسیٰ نے کہا اسی مقام کی تلاش میں تو ہم نکلے تھے چنانچہ وہ دونوں اسی مقام پر واپس آئے۔ چنانچہ اس مقام پر خضر سے ملاقات ہوگئی۔

اور بخاری کتاب التفسیر میں جو طویل حدیث آئی ہے اس میں مزید وضاحت ہے کہ:

(۲)۔ مردہ مچھلی کا زندہ ہونا: خُذْ نُوْنًا مَيِّتًا حَيْثُ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ (ترجمہ) ایک مردہ مچھلی لے لو تو جہاں اس میں جان پڑ جائے۔ (بس وہی مقام ہوگا)

چنانچہ موسیٰؑ نے ایک مچھلی توشہ دان میں رکھ لی اور اپنے ساتھی (یوشع بن نون) کو یہ تاکید کی کہ جہاں یہ مچھلی ٹوکری سے نکل کر چل دے تو مجھے اطلاع دینا۔ صخرہ کے مقام پر جب موسیٰؑ سو رہے تھے تو یہ مچھلی تڑپی اور دریا میں جا رہی۔ یوشع نے سوچا کہ موسیٰؑ کو جگانے سے کیا فائدہ۔ جب بیدار ہوں گے تو بتا دوں گا جب موسیٰؑ بیدار ہوئے تو یوشع کو یہ بات بتلانا یاد ہی نہ رہا۔ مچھلی تو تڑپ کر دریا میں چل دی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے دریا کی روانی اس پر روک دی۔ اس مچھلی کے گزرنے کا نشان اس پتھر پر بھی (جس کی اوٹ میں موسیٰ سو رہے تھے اور جس پتھر سے ہو کر دریا میں گئی تھی، طاق کی طرح گول نشان بن گیا (ساتھ ہی راوی عمرو بن دینار نے) دونوں انگوٹھوں اور کلمہ کی انگلیوں کو ملا کر حلقہ کی طرح اس کو بتلایا۔ الحدیث (بخاری۔ کتاب التفسیر)۔

اب دیکھئے کتاب وسنت کی اس وضاحت سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

۱ ۔ مردہ مچھلی کا زندہ ہونا اور (۲) دریا میں سرنگ کی طرح راستہ بنانا۔ اور یہ دونوں باتیں چونکہ خرقِ عادت ہیں۔ لہٰذا اثری صاحب اہلحدیث کہلانے کے باوجود ان دونوں باتوں کے منکر ہیں اور جس طرح تاویلات کے سہارے لینا شروع کر دیتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:۔

(۱) ۔ آپ نے بخاری کی کتاب التفسیر کی روایت جس میں "نوناً میتاً" کے واضح الفاظ موجود ہیں کو نظر انداز کر کے بخاری کے کسی دوسرے مقام سے روایت لی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:۔

احمل حُوْتًا فِيْ مِكْتَلٍ فَإِذَا فَقَدْتَهُ فَهُوَ ثَمَّهُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو جواب دیا کہ ایک مچھلی اپنے توشہ دان میں رکھ لو

جہاں یہ گم ہوجائے وہی اس بندے (خضر) کی جگہ ہے۔

تاویلاتِ اثری: لیکن آپ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ساحل بحر کا راستہ لے کر روانہ ہوں اور مچھلی پکڑتے اور کھاتے جائیں۔ پھر جہاں پر وُہ ختم ہوئی ٹھہر کر اور پکڑلی" (ص ۱۸۹)
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تعبیر سے ٹوکری میں رکھنے کی ضرورت کیسے پیش آسکتی ہے؟

(۲)۔ اب آگے چلئے:۔

حَيْثُ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ یعنی جب اس مچھلی میں رُوح پھونکی جائے (وُہ زندہ ہوجائے) کا مطلب آپ یہ بتلاتے ہیں کہ "اللہ پاک نے کافی مقدار میں اسے (مچھلی کو) دریا میں پیدا کیا ہوا ہے"۔ (ص ۱۸۸)۔ غور فرمایئے اس مطلب کا حدیث کے الفاظ سے کوئی تعلق ہے؟

(۳) آگے حدیث کے الفاظ درج کرتے ہیں:

فَكَانَ مُوسَىٰ يَتَّبِعُ أَثَرَ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ۔ یعنی موسیٰ مچھلی کے سمندر میں چلے جانے کی نشانی تک اس نشانی کا تتبع کرتے رہے۔

اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ: "چنانچہ مچھلی پکڑتے گئے اور کھاتے گئے۔ وہاں پہنچ کر بھی خادم یوشع نے مچھلی پکڑی اور کھائی۔ پھر آپ کو سلادیا اور دیگر مچھلی زادِ راہ کے لیے پکڑی اور ٹوکری میں رکھی اور یہ سمجھ کر کہ وُہ مرچکی ہے۔ کسی دوسرے کام میں مشغول ہوئے مگر وُہ چونکہ زندہ تھی تڑپ کر ٹوکری سے باہر آئی اور پھر فوراً دریا میں جا گری۔ وَاضْطَرَبَ الْحُوتُ فِي الْمِكْتَلِ فَخَرَجَ مِنْهُ فَسَقَطَ فِي الْبَحْرِ" (ص ۱۹۰)

ایک اور تاویل یہ فرمائی کہ بعض روائتوں میں آبِ حیات کا ذکر آیا ہے کہ جس پر پڑے وہ زندہ ہو جاتا ہے اور مچھلی کے لیئے دریائی پانی تو ویسے ہی آبِ حیات ہے کہ اس کے سوا اس کی زندگی نہیں۔ اس لیئے ممکن ہے کہ قرب وجوار سے کچھ پانی پڑا تو اس کی بے ہوشی ہوش سے بدل گئی اور وہ تڑپ تڑپ کر دریا میں جا پڑی" (پ ۱۵ ص ۲۰۲)

دیکھا آپ نے اسے کہتے ہیں ہاتھ کی صفائی۔ وُہ جو مُردہ مچھلی لے کر چلے تھے۔ اسے صخرہ کے مقام پر پکڑ کر مارا۔ پھر ٹوکری میں رکھا۔ لیکن اس مچھلی کے مُردہ ہونے کا بھی محض خادم کا خیال تھا ورنہ حقیقتاً وُہ زندہ ہی تھی جس طرح آپ نے بخاری کی واضح اور صاف احادیث پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ وہ آپ کے سامنے ہے۔ بہرحال مُردہ مچھلی کے زندہ ہونے کا قصّہ تو ختم ہُوا۔ باقی رہ گئی "مچھلی کے سرنگ بناتے ہوئے دریا میں چلے جانے والی بات"، تو اس کے متعلق حاشیہ میں فرماتے ہیں:

مچھلی کا سرنگ بنانا: "صرف قرآنی الفاظ اور سیاق ملحوظ رکھ کر اس کا دُوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مُوسیٰ کے کھانا طلب کرنے پر خادم نے کہا ۔ میں نے کھانا کھا کھلا کر وہاں (صخرہ کے پاس) ہی احتیاط سے رکھ دیا تھا ۔ مگر شیطان کا ستیاناس کہ آتی دفعہ مجھے ساتھ لانا یاد ہی نہ رہا ۔ اب آپ کے کھانا مانگنے سے مجھے یاد آیا کہ وہ تو میں صخرہ کے پاس ہی چھوڑ آیا ہوں ۔ دریں صُورت وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا اللہ کا کلام ہے جس کا مطلب اس نہج پر ہے کہ ان کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد دریا اسے اپنے مدّ وجزر اور جوار بھاٹا کے سلسلہ میں بہا کر لے گیا ۔" (ص ۱۹۱)

سو یہ ہے سربًا کا صحیح مطلب اور غالباً اس سلسلے میں آپ نے کوئی لغت دیکھنا گوارا نہیں فرمایا پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے ساتھ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد آپ یہ بھی فرماتے ہیں :-

"یہ مطلب میں نے ذی علموں کی ضیافتِ طبع (یہ ضیافت طبع ہے یا ذہنی انتشار اور خیانتِ طبع) کے لیے بیان تو کر دیا مگر میرے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ یہ صحیح حدیثوں کے خلاف ہے اور میں بفضلہٖ اہلحدیث ہوں ۔"

(ص ۱۹۱ کا حاشیہ)

گویا آپ نے اہلحدیث ہونے کی رعایت سے مدّ وجزر والی بات کو ٹھیک نہیں سمجھا ۔ لیکن یہ بات کہ یوشع نے صخرہ کے پاس دریا سے مچھلی کو پکڑ کر ٹوکری میں رکھ لیا اور سمجھا کہ وُہ مرگئی ہے مگر حقیقتاً" وہ زندہ تھی اور تڑپ کر دریا میں چلی گئی ، والی بات بالکل درست اور حدیث کے عین مطابق ہے اور قرآن و حدیث کا چونکہ ٹھیک مطلب بھی یہی ہے ۔ لہٰذا آپ نے مدّ وجزر والی بات کے مُقابلہ میں اسے اختیار فرمایا ہے ۔

(۲) **حضرت خضر کی شخصیت :** حضرت خضر کے متعلق بخاری کتاب الانبیاءؑ درج ذیل حدیث موجود ہے :-

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله علیه وسلّم قال: إِنَّمَا سُمِّيَ الْخَضِرُ لِاَنَّهٗ جلس علی فروةٍ بيضاء فاذا هي تهتزّ من خلفه خضراء	ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا حضرت خضر کا نام خضر اسلیئے پڑ گیا کہ اگر وہ سفید (بے آب گیاہ) زمین پر بیٹھتے ۔ تو وہ ہلنے لگتی اور بعد میں وہاں سبزی اُگ آتی ۔

یہ حدیث اثری صاحب کے لیئے ایک کھلے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی ، لہٰذا آپ نے اس حدیث کی چار پانچ توجیہیں پیش کر کے اس روایت کے معروف معنوں سے صاف انکار کر دیا ۔ چنانچہ مندرجہ بالا حدیث درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

"آپ قابل زراعت اور خشک زمینوں کو آباد کرایا اور باغ لگوایا کرتے تھے اور کہ پیش آمدہ مقدمہ کی

سماعت کے لیئے جہاں پر مجلس اور کچہری تجویز فرماتے تو وہاں پر آپ کے ارد گرد پھول پودے بیل بوٹے سجا کر لگا دیئے جاتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپؑ سبز رنگ کا لباس پہنتے ہوں اور سبز قالین بچھاتے ہوں اور ترکاری میں سبزی زیادہ استعمال فرماتے ہوں کہ آپ سبزی پسند تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ جہاں پر بیٹھتے وہاں سبزی خود بخود پیدا ہو جاتی۔" (ب ص۱۸۹)

خضرؑ اور موسیٰؑ کی ملاقات کے متعلق بخاری کی طویل روایت میں درج ذیل حصہ بھی خضر کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈالتا ہے:

قال یاموسیٰ اِنّی علی علمٍ من علم اللہ علمنیہ اللہ لا تعلمہ وانت علی علمٍ من علم اللہ علمکہ اللہ لا اَعْلَمُہٗ۔ (بخاری۔کتاب الانبیاء)	خضر نے کہا اے موسیٰ! میرے پاس اللہ کے علم سے ایک علم ہے جو اس نے مجھے سکھایا تو اسے نہیں جانتا اور تیرے پاس بھی اللہ کے علم سے ایک علم ہے جو اس نے تجھے سکھایا ہے اور میں اسے نہیں جانتا۔

اسی لیئے علمائے اُمت میں یہ اختلاف رہا ہے کہ خضر نبی تھے یا ولی؟ وہ جو کچھ بھی تھے انہیں بطور خاص اللہ کی طرف سے کچھ علم عطا ضرور ہوا تھا۔ مگر اثری صاحب خضر کو محض ایک مقامی اور واقف حالات شخص سے زیادہ کچھ حیثیت دینے کو تیار نہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا حدیث کو درج کرنے کے بعد گویا اس کا ترجمہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ:-

"خضر نے موسیٰ کو کہا) بھائی صاحب! آپ اپنے یہاں کے مقامی حالات سے واقف ہیں اور میں ان سے ہرگز واقف نہیں اور یہاں کے مقامی حالات سے میں واقف ہوں۔ آپ نو وارد ہونے کی وجہ سے واقف نہیں"۔ (ب ص۱۹۲)

اَب یہ مقامی واقفیت خضر کو کس وجہ سے تھی؟ یہ معلوم کرنے کے لیئے ہر سہ واقعات کی تاویل اب خضر کی زبانی سنیئے:-

"آپ ان ہر سہ امور کی تاویل سُنکر اپنی راہ لیں۔ اس علاقہ کا بادشاہ ظالم ہے جو کہ عمدہ کشتیوں کو بیگار پکڑ لیتا ہے تو میں نے اس کشتی کی تختی توڑی کہ افسر محکمہ اسے بیکار سمجھ کر چھوڑ دے گا...... اور لڑکے کی بابت معروض ہے کہ اس کے ماں باپ تو مسلمان ہیں مگر وہ لڑکا کافر، سرکش، شریر اور ناپاک تھا۔ ماں باپ کا عاق تھا اور ادھر اُدھر سے مال چُرا کر گھر میں لا رکھتا تھا اور ہمیں ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ گھر سے مال برآمد ہونے پر اسکے ماں باپ کہیں بدنام نہ ہوں۔ جب اس کا مقدمہ پیش ہو کر فیصلہ ہُوا کہ اسے قتل کیا جائے تو وہ مفرور ہو گیا جو آج ملا ہے (لہٰذا میں نے اسے عدالتی فیصلہ کے مطابق سزا دی ہے) اور دیوار کی بابت یہ عرض ہے کہ اس کے

نیچے ان یتیموں کا خزانہ دفن ہے جو کہ مجھے معلوم ہے۔ ان کا باپ مرحوم نیک اور میرا دوست تھا اور میں نے یہ سب کچھ اس کی وصیت کے مطابق محفوظ رکھا ہوا ہے کہ میں ان کا جائز متولیّ ہوں اور ان کے جملہ اخراجات کا حساب کتاب میرے پاس موجود ہے جو کہ میں ساتھ ساتھ لکھتا جاتا ہوں۔ جب وہ بالغ ہوں گے تو ان کا سارا مال انہیں نکال دوں گا...... اور یاد رہے کہ یہ سب کچھ جو میں نے کیا ہے۔ اپنے ان اختیارات کی رُو سے کیا ہے جو کہ مجھے حکومتِ وقت کی طرف سے حاصل ہیں۔ اپنی مملکت سے باہر اور اختیارات سے دُور ہو کر میں نے کوئی کام نہیں کیا اور نہ کر سکتا تھا۔" (ب ص ۱۹۴، ۱۹۵)

اثری صاحب کے اس بیان سے خضر کی مندرجہ ذیل حیثیتیں سامنے آتی ہیں :۔

(۱). خضر نہ نبی تھے نہ ولی بلکہ محض اپنے ماحول سے ایک واقف حال شخص تھے اور جو علم لدنی اسے دیا گیا تھا۔ اس کی بھی کوئی نمایاں خصوصیت نہیں کیونکہ علم جیسا بھی ہو بہرحال اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

(۲). خضر صرف واقف حال شخص ہی نہ تھے بلکہ علاقہ مجسٹریٹ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مُوسیٰ کو اس علاقہ مجسٹریٹ ہی کے پاس بھیجا تھا اور یہی اللہ کے "بندوں میں سے ایک بندہ" تھا۔ جب اسے مفرور مجرم ملا تو یہ مجسٹریٹ اتنا طاقت ور تھا کہ وہیں اس مجرم کو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ کے مار دیا۔

(۳). یہ مجسٹریٹ حضرت مُوسیٰ کو بس اپنے علاقہ اختیار میں ہی لیے پھرا۔ چنانچہ اثری صاحب اس کی تائید مزید میں لکھتے ہیں کہ :۔

"اصل بات یہ ہے کہ خضر اس علاقہ کے افسر تھے ملکی ضروریات کے لیئے وہ دورہ فرما رہے تھے (کہ حضرت موسیٰ ان کے پاس پہنچے اور اپنی صورت حال پیش کی تو خضر نے انہیں بھی اپنے ملکی دورہ میں اپنے ساتھ لے لیا۔) اسی سلسلہ میں قتل وقوع میں آیا اور اس بستی کے بڑے گھرانے سے کوئی سرکاری کام تھا۔ چونکہ کھانے کا وقت تھا لہٰذا اس وقت کا نیز انسانیت کا تقاضا تھا کہ انہیں کچھ کھلاتے۔ انہوں نے دوسری سب ضروری باتیں کیں مگر افسوس کہ کھانے کھلانے کا نام تک نہیں لیا۔"

(۴). خضر مقامی حالات سے واقف اور علاقہ مجسٹریٹ ہونے کے علاوہ بستی کے ان دو یتیم بھائیوں کے متولی بھی تھے۔

اب دیکھئے کہ اثری صاحب کس طرح خضر کو ایک عام آدمی یا علاقہ مجسٹریٹ کی سطح پر لے آئے ہیں۔ اس سے اعجازی حیثیت تو ختم ہوگئی مگر افسوس ہے کہ آپ کی اس تعبیر کا نہ قرآن ساتھ دیتا ہے نہ حدیث۔ حدیث کا جس طرح آپ نے صریح انکار کیا ہے وہ آپ دیکھ چکے۔ اب دیکھئے کہ جس شخص کے پاس اللہ تعالیٰ مُوسیٰ علیہ السلام کو بھیجتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اسے اپنی طرف سے علم بخشا تھا اور خضرؑ نے خود بھی مُوسیٰ

کو فرمایا تھا کہ مجھے ایک ایسا علم دیا گیا ہے جو آپ کو نہیں دیا گیا۔ کیا یہ تمام باتیں ایک عام آدمی یا علاقہ مجسٹریٹ سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ اللہ پاک تو ان یتیموں کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ " وہ بڑے ہو کر باپ کا خزانہ نکال لیں گے"۔ اور اثری صاحب یہ فرماتے ہیں کہ میں ان لڑکوں کا متولی ہوں۔ جب یہ لڑکے بڑے ہو جائیں گے تو ان کو خزانہ نکال دوں گا۔" اپنی بات کی پیچ میں آکر اس طرح قرآن و حدیث کی صریح مخالفت اثری صاحب کا حصہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۴)۔ **عصائے موسیٰ اور ید بیضا:** حضرت موسیٰ کے یہ دو معجزے ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں بیسیوں مرتبہ آیا ہے اور جو موسیٰ کو نبوت ملنے کے ساتھ ہی عطا کئے گئے تھے ان کے متعلق آپ نے کوئی آیت درج نہیں فرمائی۔ نہ ہی کہیں یہ ذکر فرمایا ہے کہ فرعون کے جادوگروں سے آپ کا مقابلہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔ جادوگر کیوں فوراً ایمان لے آئے؟ البتہ اس کے عوض اثری صاحب نے عصائے موسیٰ اور ید بیضا کے جو مطالب بیان فرمائے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیے اور ان کے ذی علم ہونے کی داد دیجئے :۔

"جانٌ، حَیّۃ، ثعبان اور ید بیضا کے ظاہر پر ایمان اور حقیقت خدا کے سپرد لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا (یعنی ممکن ہے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ مجھے اس کی کوئی نئی تاویل بھی سمجھا دے۔ مؤلف) ہاں یہ عرض کر دیتا ہوں کہ جانّ کی تہہ میں یہ اشارہ ہے کہ سیاسی ترقی مخفی طور پر کی جائے ایسا نہ ہو کہ فرعون جلد ہی کچل دے اور سر منڈاتے ہی اولے پڑیں۔"

"اور حَیّۃ کی تہہ میں اسلامی اور سیاسی زندگی کے آثار نمودار ہیں" (یاد رہے کہ جانّ کا تعلق سیاسی زندگی سے ہے اور حَیّۃ کا اسلامی اور سیاسی دونوں سے)۔

"اور ثعبان کی تہہ میں اسلام کا آخری غلبہ اور فرعون کی تباہی ہے۔"

"اور ید بیضا کی تہہ میں مستقل اسلامی حکومت جو کہ عدل اور انصاف کے ساتھ ایسی قائم ہوگی کہ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ اس میں جور و ستم اور بے دینی نہ ہوگی۔" (ص ۲۱۰)

غور فرمائیے کس طرح آپ نے باطنی فرقوں کی طرح ہر لفظ کی تہہ سے معانی نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔ قرآن و حدیث کے الفاظ کے ظاہری معانی پر اور نہ ہی کسی لغت کی کتاب پر اعتماد رہ گیا ہے۔ البتہ حواشی میں چند مزید تصریحات پیش کی ہیں۔ وہ بھی حاضر خدمت ہیں۔

"لہ جانّ چھوٹے اور باریک سانپ کو کہا جاتا ہے اور اصل اس کا جنّ ہے جس کے معنیٰ پردہ اور پوشیدہ کے ہوتے ہیں۔" (ص ۲۰۹)

غالباً اسی لحاظ سے اس کی تہہ سے مخفی ترقی کا مفہوم نکالا ہے. سوال یہ ہے کہ آیا جس لفظ کا مادہ بھی جنن ہو اس کا معنیٰ پردہ اور پوشیدہ ہی ہوگا. مثلاً جنت بمعنی باغ کا بھی یہی مادہ ہے. اس کے معنی میں کیا پردہ اور کیا پوشیدگی ہے؛ کیا باغ کا وجود لوگوں کو نظر نہیں آتا؟

"۲۔ حیّۃ. عمر دراز سانپ کو کہا جاتا ہے کہ جس کے کاٹنے سے زندگی زائل نہ ہو اور اصل اس کا حیّ اور حیاۃ ہے جس کے معنی زندگی کے ہوتے ہیں" (ص ۲۰۹) یہ معنی بھی لغوی لحاظ سے غلط ہیں. حَیَّۃٌ اسم جنس ہے اور اس کا اطلاق عمر یا قد کے لحاظ سے ہر چھوٹے بڑے اور نر و مادہ سانپ پر ہوتا ہے. خواہ وہ زیادہ زہریلا ہو یا کم. اس کے کاٹنے سے زندگی زائل ہو یا نہ ہو. ان غلط معانی کو بنیاد قرار دے کر پھر اس کی تہہ سے مزید پوشیدہ معانی تلاش کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟

"۳۔ ثعبان. اژدہا یا بڑے سانپ کو کہا جاتا ہے جو کہ سب کو ہڑپ کر جائے اس کا اصل ثعب ہے. جس کے معنی پانی کے سیلاب کے ہوتے ہیں" (ص ۲۰۹)

ثعب کے معنیٰ نالی یا پرنالہ میں پانی جاری ہونا ہے پانی کا سیلاب نہیں. ان دونوں میں بہت فرق ہے اب اس نالی یا پرنالہ کے پانی سے ثعبان یا اژدہا کا کیا تعلق ہوا؟ یہ فرض کر بھی لیا جائے اژدہا وہ ہے جو سب کو ہڑپ کر جائے اور اس کی تہ سے یہ معانی برآمد ہوں کہ آخر اسلام کا غلبہ اور فرعون کی تباہی ہے تو اس نے سب کو کیسے ہڑپ کیا؟ اس طرح تو ایک طبقہ 'ہڑپ' ہو جاتا ہے اور دوسرا باقی رہ جاتا ہے.

"۴۔ ید کے معنی ہاتھ اور قوت اور بیضا کے معنی سفید اور روشن مطلب صاف ہے کہ قانون ستھرا ہوگا اور قوت سے نافذ کیا جائے گا" (ص ۲۰۹)

مطلب تو واقعی صاف ہوگیا مگر سوال یہ ہے کہ وہ کونسی دو نشانیاں تھیں. جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو دیکر فرمایا تھا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے یہ دونوں نشانیاں دکھلاؤ. (۲۸-۳۱-۳۲) کیا یہ تہہ سے برآمد کئے ہوئے معانی دکھلانے کی چیزیں ہیں؟

یہ بھی خیال رہے کہ اثری صاحب یہ تہ سے برآمد کئے ہوئے معانی بتلانے سے پیشتر جانّ کے معنی سانپ بتلا چکے ہیں. مگر وہ آیت جس میں جانّ کا ذکر ہے وہ درج نہیں کی. شائد آپ بھی جانّ سے ڈر گئے چنانچہ لکھتے ہیں:

اثنائے گفتگو میں اللہ پاک نے فرمایا کہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اسے ذرا پھینک تو سہی پھینکا تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ سانپ بن کر تڑپ اور دوڑ رہا ہے. موسیٰ علیہ السلام خائف ہو کر ذرا پیچھے ہٹے تو فرمایا کہ تیرے جیسوں کے لیئے یہاں امن وامان ہے کوئی خوف وخطر نہیں. ذرا آگے بڑھ کر دیکھ کیا ہوتا ہے

يَامُوسَىٰ اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۲۸: ۳۱)" (ب ص ۲۰۶)

۵۔ دریا کا پھٹنا: موسیٰ علیہ السّلام کے ان بڑے بڑے معجزات سے جن کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات مصر سے بحکم الٰہی ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو دریا تک پہنچے ہی تھے کہ ان کے تعاقب میں فرعون کا لشکر بھی چڑھ آیا بنی اسرائیل سمجھے کہ اب تو پکڑے اور مارے گئے۔ ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السّلام کو وحی کی کہ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳) یعنی دریا پر اپنی لاٹھی مارو۔ اس طرح دریا کے درمیان خشک راستہ پیدا ہوگیا۔ اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ یُوں بیان فرماتے ہیں:

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ (۲۰/۷۷) | پھر ان کے لیئے دریا میں لاٹھی مار کر خشک راستہ بنا دو پھر تم کو نہ تو (فرعون کے) آ پکڑنے کا ڈر ہوگا اور نہ ڈوبنے کا۔

دُوسرے مقام پر فرمایا:

فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (۲۶/۶۳) | تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہوگیا جیسے ایک بڑا پہاڑ ہے۔

اَب ایسی خرقِ عادت بات بھلا عقل پرستوں کو کیسے گوارا ہوسکتی ہے؟ لُطف کی بات ہے کہ اثری صاحب جو ایک ایک واقعہ کے دس دس تک مطلب بیان کرنے کے عادی ہیں اور دور کی کوڑی لاتے ہیں اس واقعہ کو یُوں گول کر گئے ہیں جیسے یہ کوئی قابلِ توجہ واقعہ ہی نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ چند آیات درج بھی کی ہیں لیکن حاصل مطلب تو درکنار ترجمہ لکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی اور جو چند حروف لکھے ہیں وہ یہ ہیں "ساحل بحر پر یہاں سے وہاں تک اپنی لاٹھی مار کر نشان لگا دیئے۔ ان دونوں نشانوں کے اندر اندر اسرائیلی دریا میں داخل ہو کر پار ہوں کہ یہ راستہ اللہ پاک نے ان کے لیئے پہلے ہی تجویز فرمایا ہُوا ہے"۔ (ص ۲۱۴)

ہم یہ تو اثری صاحب سے پُوچھ سکتے ہیں کہ اس مطلب میں "ساحل" قرآن کے کون سے لفظ کا معنیٰ ہے اور "یہاں سے وہاں" کون سے لفظ کا؟ "ان دونوں نشانوں کے اندر" کون سے لفظ کا اور پہلے ہی تجویز فرمایا ہُوا' کون سے الفاظ کا؟ پھر قرآن کے الفاظ 'یَبَسًا' 'فانفلق' اور طود کا کیا معنیٰ ہے؟

(۶)۔ بارہ چشموں کا پھُوٹنا: اسی طرح کا ایک اور بڑا معجزہ جس کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے۔ وُہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے مُوسیٰؑ سے پانی مانگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پتھر پر اپنی لاٹھی مارو۔ پھر موسیٰؑ کے لاٹھی مارنے سے بارہ چشمے پھُوٹ کر بہنے لگے۔ بنی اسرائیل کے چُونکہ بارہ ہی قبیلے تھے تو ہر ایک قبیلہ نے ایک ایک چشمہ لے لیا۔ اس مقام پر بھی اثری صاحب نے بہت سی متعلقہ آیات تو درج

کر دی ہیں لیکن ان کے ترجمہ کی زحمت گوارا نہیں فرمائی اور نہایت مختصر اور گول مول سا مطلب جو بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے :-

"اور پانی کی بابت موسیٰ کو الہام ہوا کہ فلاں فلاں مقام پر لاٹھی مار کر[1] نشان لگا دو کہ وہاں پر چشمے بند پڑے ہیں جو کھودنے پر برآمد ہوں گے۔ چنانچہ کھدوائی ہونے سے اسرائیلی قبائل کی تعداد پر بارہ چشمے برآمد ہوئے" (ص : ۲۳۰)

یہ مختصر سا مطلب جو دو تین سطروں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اس میں آدھے سے زیادہ الفاظ اثری صاحب کی حسب منشا اختراع کا واضح ثبوت ہیں۔ ہم نے پانچ جگہ پر نیچے لکیریں لگا دی ہیں۔ آپ سارا قرآن چھان ماریں۔ اس واقعہ سے متعلق آپ کو قرآن سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جن سے یہ معنیٰ نکلتے ہوں قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں :-

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۲/۶۰)	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو (موسیٰ نے لاٹھی ماری) تو پھر اس پتھر میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا :

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۷/۱۶۰)	جب موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی پتھر پر ماریں۔ (موسیٰ نے لاٹھی ماری) تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اب دیکھئے ان آیات میں ایک مقام پر فَانْفَجَرَتْ کا لفظ آیا ہے اور دوسرے مقام پر فَانْۢبَجَسَتْ کا۔ اور ان کا لغوی فرق یہ ہے کہ جب چشمہ کا منہ تنگ ہو اور پانی زور کی وجہ سے اچھال کے ساتھ نکلتا ہے تو انبجس کا لفظ استعمال ہوگا اور جب چشمہ کا منہ کھل جائے اور پانی اچھال کے بغیر ہی بہنے لگے تو انفجر کا لفظ استعمال ہوگا (فقہ اللغۃ۔ ص ۲۵۹) مگر ان الفاظ کے معنیٰ "برآمد ہونا" ہم نے آج تک کسی لغت میں نہیں دیکھے اثری صاحب کو معلوم ہوں تو انہیں اس کا کوئی حوالہ بھی پیش کر دینا چاہیئے تھا۔

۷۔ **گوسالہ سامری :** گوسالہ سامری کا تعلق گو موسیٰ کے معجزات سے کچھ نہیں۔ تاہم اثری صاحب نے اس سلسلہ میں جو نکات بیان فرمائے ہیں ان کا لکھنا بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ حضرت موسیٰ اور

---

[1] واضح رہے کہ اگر موسیٰ اپنی لاٹھی کے بجائے کسی اور چیز سے نشان لگا دیتے تو یہ بند چشمے کھودنے پر بھی کبھی برآمد نہ ہوتے۔ لہٰذا اصل کرامت تو لاٹھی کی ہوئی۔

سامری کا یہ مکالمہ قرآن میں اس طرح مذکور ہے :۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (۲۰/۹۵-۹۶)

موسیٰ نے سامری سے پوچھا سامری! تمہاری کیا صورتحال ہے؟ وہ کہنے لگا میں نے ایسی چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی تو میں نے فرشتے کے نقش پا سے (مٹی کی) ایک مٹھی بھر کر اس کو بچھڑے کے قالب میں ڈال دیا اور میرے نفس نے اس کام کو اچھا بتایا۔

اب اس کی ماثورہ وضاحت تو یہی ہے کہ یہاں رسول سے مراد جبرئیل فرشتہ ہے مگر اثری صاحب یہاں:

(۱) بصر سے مراد اسرائیلیوں پر اپنا علمی تفوق لیتے ہیں۔

(۲) اثر سے مراد حدیث کی روایت (حدیث و آثار)

(۳) رسول سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور

(۴) نبذ سے مراد عمل بالحدیث کو چھوڑ دینا ہے (ب ص ۲۱۹) اور اس کا معنیٰ یوں بیان فرمایا کہ

"ادھر سامری نے موقع پا کر اسرائیلیوں میں ایک بچھڑا کھڑا کر دیا تاکہ وہ اس کی پرستش کریں۔ یہ شخص پہلے بظاہر اہلحدیث کہلاتا تھا اور موسوی حدیثوں اور فرامین پر عامل تھا مگر بعد میں بچھڑے کی طرف متوجہ ہو کر گدی نشینی شروع کر دی اور عبداللہ چکڑالوی کی طرح حدیث نبوی کا منکر ہو کر مرتد ہو گیا۔" (ب ص ۲۱۷)

اب دیکھئے کہ اس قصہ سے آپ نے خارق عادت بات کو تو فی الواقعہ خارج کر دیا مگر سوال یہ ہے کہ موسیٰ سے تو وہ خود مخاطب تھا پھر اسے غائب کا قائمقام بنا کر یہ کہنے کی کیا تک ہے کہ میں نے رسول کی حدیثوں کو تھوڑا تھوڑا قبول کیا پھر بعد میں ان کو ترک کر دیا؟

بصارت سے بصارت عینی کے بجائے بصیرت قلبی مراد لینا، اثر سے صرف اتباع سنت مراد لینا، رسول کو غائب کر کے پکارنا اور نبذ سے ترک اتباع مراد لینا، اگرچہ یہ سب کچھ علیحدہ علیحدہ جملہ کے اعتبار سے قابل قبول بھی ہو تو بھی یہاں طرز بیان اس کا ساتھ نہیں دے رہا تو اُسے کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ تاویل دراصل سب سے پہلے ابومسلم اصفہانی معتزلی نے پیش کی جس کو اثری صاحب نے اس لیے پسند فرمایا کہ اس سے خرق عادت امر خارج کیا جا سکے۔

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ماثورہ تشریح اثری صاحب کے نزدیک معتبر نہ بھی ہو تو پھر بھی اس کی نئی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ سامری کا اپنا قول ہے جسے خود اعتراف ہے کہ یہ بات میرے نفس نے گھڑ لی تھی۔ تو پھر اس میں صفائی کی ضرورت ہی کیا ہے؟

۷۔ حضرت یُونس علیہ السّلام

یُونس علیہ السّلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں کئی جگہ مذکور ہے۔ ہم یہاں سورۂ صٰفّٰت سے چند آیات درج کرتے ہیں :۔

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۔ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ (۳۷: ۱۳۹ تا ۱۴۸)

اور بے شک یُونس پیغمبروں میں سے تھے جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے۔ اس وقت قرعہ ڈالا تو انہوں نے زک اُٹھائی۔ پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا اور وہ قابلِ ملامت کام کرنے والے تھے۔ پھر اگر وہ خدا کی پاکی بیان کرتے، تو اس روز تک جب لوگ دوبارہ زندہ کیے جائینگے مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ پھر ہم نے ان کو جب کہ وہ بیمار تھے ایک فراخ میدان میں ڈال دیا اور ان پر کدو کا درخت اُگایا اور ان کو لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تو وہ ایمان لے آئے تو ہم بھی ان کو دُنیا میں ایک مقرّرہ وقت تک فائدہ دیتے رہے۔

یُونسؑ اور خرق عادت امور: اَب دیکھئے کہ ان آیات میں کئی باتیں خرق عادت ہیں مثلاً مچھلی کے پیٹ میں جاکر یُونس علیہ السّلام کا زندہ رہنا' یُونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں تسبیح بیان کرنا اور پھر مچھلی کا یُونس کو صحیح وسالم ساحل سمندر پر پھینک دینا اور اسی وقت کدو یا اس جیسے کسی دوسرے درخت کا پیدا ہو کر ان پر سایہ کرنا۔ لہٰذا ان خوارق عادت امور سے انکار کی راہ ہموار کرنے کے لیئے آپ کو اُور بھی بہت سے الفاظ کے دُور از کار معانی تلاش کرنے پڑے اور اصل معانی کو اس لیئے ردّ کر دیا کہ بزعم خود ان کے خیال میں معروف معنیٰ کرنے سے یُونسؑ کی عصمت واعذار ہوتی ہے کہ ان کی طرف کئی خرق عادت واقعات منسوب کیئے جا رہے ہیں۔

آپ نے مندرجہ بالا آیات کو کہیں مسلسل درج نہیں فرمایا نہ ہی ان کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ آپ کے بیان کا طریق کار یہ ہے کہ اپنا مطلب پہلے بیان کرتے جاتے ہیں اور بعد میں اس کی تائید میں آیت درج کر دیتے ہیں اب آپ نے جو یونسؑ کا واقعہ اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے :۔

تبصرہ و تنقید کی خاطر ان پر نمبر ہم نے خود لگائے ہیں :-

قصہ یونسؑ کی اثری ترتیب : (۱) "آپ برسوں کی کافی تبلیغ کے بعد قوم سے ناراض ہو کر ہجرت کے خیال سے بحکم الٰہی نکل پڑے کہ اللہ پاک بحسب وعدہ مجھے تنگی نہیں بلکہ فراخی سے کر ملے گا وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱/۸۷) اللہ پاک فرماتا ہے کہ یونسؑ ہمارے ہی بھیجے ہوئے مہاجرین کر کسی دوسری جگہ جا رہے تھے کہ راستہ میں کچھ سفر کشتی پر بھی طے کرنا پڑا۔ جس کے لیئے وہ بھاگے دوڑے بھی تھے ؛"

(۲) "اور یہ بھاگ دوڑ بھی محض اس خیال سے تھی کہ خدانخواستہ اگر کشتی بھر گئی یا نکل گئی تو پھر نہ معلوم مجھے کتنی مدت انتظار میں بیٹھنا پڑے۔ بہرحال آپ کے پہنچنے تک کشتی تو بھری جا چکی تھی مگر آپ کھینچا تانی سے شریک و شامل ہو ہی گئے[۵] اس بھیڑ بھاڑ میں آپ کو اندر سے نکال کر کنارے کی طرف دھکیل دیا گیا[۶] آپ کو ایسی خطرناک جگہ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھنا پڑا کہ مچھلیاں[۷] آکر آپ کے پاؤں کو چھونے اور بوسہ دینے لگیں۔"

(۳) آپ نے کشتی میں تبلیغ شروع کر دی۔ اللہ کی صفات بیان کیں اور انسانی کمزوریوں کو واضح کیا۔ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱/۸۷) آپ کی تقریر سے کشتی والوں کے قلبی اندھیرے[۸] دور ہوئے نہ ہوئے مگر انہوں نے آپ کے لیئے جگہ کشادہ کر دی ورنہ اگر وہ وہیں بیٹھے رہتے تو انہیں خطرہ تھا کہ وہ مچھلیوں کی خوراک نہ ہوں لَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ[۹] يُبْعَثُوْنَ (۳۷/۱۴۳، ۱۴۴)

(۴) جب کشتی سے اترے تو ساحل بحر ایک کھلا میدان اور ریگستان تھا۔ آپ کے ہمراہ کوئی ساتھی راستہ بتانے والا بھی نہ تھا۔ آپ[۱۰] حیران پریشان اور آزردہ خاطر تھے۔ فَنَبَذْنٰهُ[۱۱] بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ (۳۷-۱۴۵) یہاں پر بھی اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو انہیں یہاں بھی نہایت افسوس کے ساتھ رہنا پڑتا۔ "لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ" (۶۸ - ۴۹)۔ آخر آپ اللہ پاک کی دستگیری سے اہل قوم کے پاس جا پہنچے ..... یہ لوگ ایک لاکھ یا اس سے زائد تھے وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ. فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۳۷، ۱۴۷، ۱۴۸) پھر آپ نے ان لوگوں میں قیام فرمایا۔ یہاں پر اللہ پاک نے ہر طرح کی آسودگی نصیب فرمائی وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (۳۷-۱۴۶) کہ اس خطہ میں ترکاری، پھل پھول اور میوہ جات کی کثرت تھی۔" (بیان المختارص ۲۳۹ تا ۲۴۲)

تنقیدی مباحث : (۱) بحکم الٰہی ہجرت کرنے کے لیئے دلیل کے طور پر جو آیت اثری صاحب نے پیش فرمائی ہے۔ وہ ہے وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا۔ اور یونسؑ جب وہ قوم سے

غضبناک ہو کر چل کھڑے ہوئے۔

اس آیت میں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں جس میں بحکم الٰہی ہجرت کے لیے اشارہ تک بھی پایا جاتا ہو لیکن اس کے باوجود اثری صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ یونسؑ ہمارے ہی حکم سے مہاجر بن کر جا رہے تھے۔ اثری صاحب کا آپنی طرف سے بلا جواز اضافہ ہے۔ آیت کا کوئی لفظ اس کی تائید نہیں کرتا۔ بلکہ آیت سے تو الٹا یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونس قوم سے غضبناک ہو کر چل کھڑے ہوئے اور وحی الٰہی کا بھی انتظار نہ کیا۔

دوسری آیت جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونسؑ وحی کا انتظار کیے بغیر نکل کھڑے ہوئے تھے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ہے یعنی یونسؑ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ گئے۔ اَبَقَ کا معروف معنیٰ غلام کا اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جانا ہے۔ یہ لفظ یونسؑ کی اس صورت پر بالکل مطابق بیٹھتا ہے کہ آپ اپنے پروردگار کے بندے اور غلام تھے۔ بیشک آپ قوم کی نافرمانی کی وجہ سے غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ قوم کو عذاب اترنے کا وعدہ دیا اور خود وحی کا انتظار کیے بغیر ہی وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن اثری صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اَبَقَ صرف غلام کے بھاگنے کے لیے ہی نہیں۔ محض بھاگنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے ہم مانتے ہیں کہ اَبَقَ محض بھاگنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اثری صاحب کو آخر معروف معنوں سے اتنی نفرت کیوں ہے کہ وہ ہر وقت مجازی اور دور از کار معنوں کی تلاش میں سرگردان رہتے ہیں۔

تیسری آیت جو حضرت یونسؑ کے وحی کا حکم ہجرت کا انتظار کیے بغیر نکل کھڑے ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے:۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (۶۸/۴۸) (اے محمدؐ!) اللہ تعالیٰ کے حکم کے انتظار میں صبر کرو اور مچھلی والے (حضرت یونسؑ کی طرح بے صبر) نہ ہو جانا۔

اس آیت پر اثری صاحب نے یوں ہاتھ صاف کیا کہ:

"آیت کریمہ کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ آپ دلیر ہو کر اللہ پاک کے حکموں کی تبلیغ کرتے جائیں۔ یونسؑ کی طرح آپ کو بہت بڑی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔" (ب ص ۲۵)

گویا فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ کا معنیٰ ہے "آپ دلیر ہو کر تبلیغ کرتے جائیں"۔ ولا تکن کصاحب الحوت کا مطلب ہے "آپ کو یونسؑ کی طرح بہت بڑی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں"۔ غور فرمایئے قرآن کے کسی لفظ کا معنیٰ آپ کے ٹھیک مطلب کا ساتھ دیتا ہے؟

(۲)۔ اسی سرگردانی کا دوسرا ہدف لفظ سَاهَمَ ہے جس کے معنیٰ آپ نے فرمائے ہیں "شریک و شامل ہو گئے"۔

سہم بمعنی جوئے کا تیر یا وُہ تیر جس سے قرعہ ڈالتے ہیں اور ساھم فی الشئی بمعنی کسی چیز میں حصّہ دار بننا اور ساھم القوم بمعنی قوم کا قرعہ اندازی کرنا ہے (منجد) گویا سہم کا لفظ بُنیادی طور پر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) قرعہ اندازی (۲) حصّہ داری

اَب دیکھئے اثری صاحب نے دوسرے معنی حصہ دار بننا سے مراد لیا شریک. پھر شریک کیسا تھ لفظ 'شامل' کو ملایا. اور ساھم کا معنی کر لیا "شریک دشامل ہوگئے". حالانکہ اس میں شریک کا لفظ تو محض وزنِ بیت ہے. اثری صاحب کا اصل مطلب "شامل ہونا" ہی سے پُورا ہوتا ہے. آخر حضرت یونسؑ کی کشتی والوں سے کوئی حصّہ داری یا شراکت تو تھی نہیں. البتّہ ان کشتی کے مسافروں میں شامل ہی ہو سکتے تھے. اس ثنویت کو ساھم کے لفظ سے کشید کرنے کے لیئے جو چابک دستی دکھائی ہے. وُہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں.

(۳). اثری صاحب کا تیسرا ہدف لفظ دَحَضَ ہے. مِنَ المُدْحَضِيْنَ کے معنی آپ نے فرمائے ہیں دھکیل دیا گیا لہٰذا دَحَضَ کے معنیٰ دھکیلنا ہوا. یہ معنیٰ بھی لغوی لحاظ سے غلط ہے. دحض الحُجّة بمعنی دلیل کو باطل کرنا اور دَحَضَ الرِّجل بمعنی پاؤں کا پھسلنا ہے. اسی طرح ادحض الحجّة بمعنی کسی کی تاویل کو باطل کر دینا اور اَدْحَضَ الرجل بمعنی کسی کے پاؤں کو پھسلانا ہے (منجد) دھکیلنا نہیں. جیسا کہ اثری صاحب حضرت یونسؑ کو اندر سے نکال کر کنارے کی طرف دھکیل رہے ہیں.

اس میں پہلا معنیٰ درست ہے کیونکہ کشتی والوں میں قرعہ اندازی ہو رہی تھی لہٰذا من المدحضین کا معنیٰ موقع کے لحاظ سے بنتا ہے "بات کھا گیا یا مات کھانے والوں سے ہوگیا". لیکن اثری صاحب نے دوسرا معنیٰ 'پھسلانا' اختیار کیا لیکن اس میں بھی پھسلانا کے بجائے دھکیلنا کر کے اپنا اُلّو سیدھا کر لیا.

(۴). فالتقمہ الحوت کا ترجمہ فرمایا: "آپ کو ایسی خطرناک جگہ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھنا پڑا کہ مچھلیاں آآ کر آپ کے پاؤں کو چھُونے اور بوسہ دینے لگیں". زندہ باد! کیا کہنے ہیں اثری صاحب کے. اللہ پاک تو ایک مچھلی (حوت) کی بات کرتے ہیں. لیکن آپ بہت سی مچھلیوں سے یونسؑ کے پاؤں کو بوسہ دلوا رہے ہیں منہ کو نہیں دلواتے. فرماتے ہیں کہ التقم کے معنیٰ اگرچہ ابتلاع بھی آتا ہے یعنی کسی چیز کو مُنہ میں ڈال کر نگل لیا جائے مگر یہاں پر صرف مُنہ رکھنا ہی مُراد ہے" (ص ۲۴۵) اس لیئے کہ اگر یہاں التقم کے معروف معنیٰ ابتلاع یا نگلنا لیئے جائیں تو اثری صاحب کا بنا بنایا کھیل ہی بگڑ جاتا ہے. لہٰذا اثری صاحب کا مشورہ یہ ہے کہ یہاں صرف مُنہ رکھنا ہی مُراد لیا جائے. اب اس سے بھی آگے چلیئے. التقام کا معنی مُنہ رکھنے سے بھی بات نہیں بنتی تو بے دریغ اس کا معنیٰ مُنہ رکھنے کی بجائے چھونا اور بوسہ دینا بھی کیا جا سکتا ہے. اب چُونکہ یونسؑ ایک خطرناک جگہ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں لہٰذا التقم کے معنیٰ ہُوئے حضرت یونسؑ کے "پاؤں کو چھونا اور بوسہ دینا"

اور حُوت کے معنیٰ ہوئے "بہت سی مچھلیاں" جو شاید تبرّک سمجھ کر یہ فریضہ سرانجام دے رہی تھیں۔
اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ کو ذوالنون بھی کہا اور صاحب الحوت بھی اور دونوں کا معنیٰ ایک ہی ہے یعنی مچھلی والا کیونکہ آپ کو ایک مچھلی نے نگلا (فالتقمہ الحوت) لیکن اثری صاحب اپنے قصّہ میں جہاں بھی ذکر فرماتے ہیں تو ایک مچھلی کے بجائے کئی مچھلیوں کا ذکر فرمانے لگتے ہیں۔

(۵)۔ فنادٰی فی الظلمٰت۔ (یعنی حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں میں پکارا) مگر اثری صاحب کہتے ہیں کہ نادٰی کے معنیٰ پکارنا نہیں بلکہ تقریر کرنا ہے اور ظلمٰت سے مُراد مچھلی کے پیٹ کے اندھیرے نہیں بلکہ اس سے مُراد کشتی والوں کے قلبی اندھیرے ہیں۔ چنانچہ مطلب یُوں بیان فرمایا کہ "آپ کی تقریر سے کشتی والوں کے قلبی اندھیرے دُور ہوئے نہ ہوئے مگر انہوں نے آپ کے لیئے جگہ کُشادہ کر دی۔ ورنہ اگر وُہ وہیں بیٹھے رہتے تو انہیں خطرہ تھا کہ مچھلیوں کی خوراک نہ ہوں۔ لَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۳۷/۱۴۴)

اَب دیکھئے جو آیت اثری صاحب اپنے بیان کی تائید میں آخر میں لا رہے ہیں۔ اسی آیت میں اثری صاحب کا مکمل ردّ موجود ہے مثلاً:۔

(i)۔ اثری صاحب خطرہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کہیں یونسؑ مچھلیوں کی خوراک نہ ہوں۔ اور آیت میں مچھلی کے پیٹ میں جانے کی متعلق کوئی شک وشبہ نہیں۔ خطرہ اگر تھا تو یہ کہ اگر یُونسؑ تسبیح بیان کرنیوالے نہ ہوتے تو قیامت تک اُس کے پیٹ میں رہتے۔

(ii)۔ آیت میں فی بطنہٖ "(اس ایک مچھلی کے پیٹ میں)" ہے: لیکن اثری صاحب بہت سی مچھلیوں کی بات کر رہے ہیں۔

(iii)۔ سبّح کے معنیٰ بھی آپ نے تقریر کرنا فرمائے اور نادٰی کے معنیٰ بھی۔ گویا آپ کے خیال کے مطابق نادٰی اور سبّح ہم معنیٰ یا مترادف الفاظ ہیں جو ہر لحاظ سے غلط ہے۔

(۶)۔ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖ۔ (یُونسؑ اس مچھلی کے پیٹ میں رہتے)۔ اثری صاحب کے ترجمہ میں ہمیں نہ لبث کا کہیں ترجمہ یا مفہوم ملا ہے اور نہ بطن کا۔ اور نہ یوم یبعثون کا۔ ان حروف کا ترجمہ بیان کرنا آپ کے مخالف پڑتا ہے لہٰذا دیدہ دانستہ چھوڑ دیا۔

(۷)۔ سقیم کا معنیٰ آپ بتلاتے ہیں حیران پریشان اور آزردہ خاطر۔ یہ معنیٰ بھی لغوی لحاظ سے غلط ہے۔ پھر آگے چل کر ص ۲۴۹ پر آپ اسی کا دُوسرا معنیٰ بے قراری اور اضطرار بتلاتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے اور اس کا آپنے کوئی حوالہ بھی نہیں دیا کہ یہ معنیٰ آپ کو کون سے لغت میں دستیاب ہوئے۔ سقیم

کا معروف معنیٰ صرف بیمار (منجد) ہے اور یہ عام معنیٰ استعمال کرنے میں شاید آپ اپنی ہتک سمجھتے ہوں۔
۸ نَبَذَ کے معنیٰ کسی چیز کو درخورِ اعتناء سمجھتے ہوئے پھینک دینا، ڈال دینا یا پسِ پُشت ڈالنا ہوتا ہے۔
(مفردات امام راغب۔ فقہ اللغۃ ص ۱۹)

قرآن میں فنبذنٰہ بالعراۗء (پس ہم نے یونسؑ کو کھلے میدان میں ڈال دیا) آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی نے ساحل پر آکر اُگل دیا لیکن آپ اس کا مطلب بیان کر رہے ہیں کہ "جب کشتی سے اُترے"۔

۹ اس آیت کو آپ نے دیدہ دانستہ پیچھے کر دیا ہے اور پچھلی آیت کو پہلے لائے ہیں اگر ایسا نہ کرتے تو آپ کی بات نہیں بنتی تھی۔ اصل ترجمہ تو یُوں بنتا ہے کہ "(مچھلی کے ساحل پر اُگلنے کے بعد) پھر ہم نے یُونسؑ پر ایک کدو کا درخت اُگا دیا۔ (پھر جب آپ کی صحت بر قرار ہو گئی) تو ہم نے انہیں ایک لاکھ یا زیادہ آدمیوں کی طرف بھیجا لیکن آپ نے آیتوں کی تقدیم تاخیر کرکے یہ مطلب بیان فرمایا ہے۔ پھر آپ اللہ کے حکم سے اس قوم کے پاس پہنچے۔ یہ لوگ ایک لاکھ یا اس سے زائد تھے اس خطہ میں ترکاری۔ پھل، پھُول اور میوہ جات کی کثرت تھی"؛ یہ سب کچھ شجرۃ من یقطین کا ترجمہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یونسؑ پر اُگایا تھا۔

یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ابھی ایک کام باقی تھا۔ درج ذیل آیت

لولا انہ کان من المسبحین للبث فی بطنہٖ الیٰ یوم یبعثون۔ اگر وُہ مچھلی کے پیٹ میں خدا کی پاکیزگی بیان نہ کرتے تو قیامت تک اس کے پیٹ میں رہتے۔

سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تھے۔ خُدا کی پاکیزگی بیان کرتے رہنے کی برکت سے وہاں سے نکلنے کی صُورت اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دی ورنہ تا قیامت مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ اس مفہوم کو آپ نے اپنے بیان سے حذف کر دیا ہے۔ پھر آپ ماشاءاللہ اہلحدیث بھی ہیں۔ لہٰذا خود ہی درج ذیل حدیث بھی فرماتے ہیں:۔

یُونسؑ مچھلی کے پیٹ میں ایک حدیث اور اس کی تاویل:

دعوۃ ذوالنون اذ ھو فی بطن الحوت لا الٰہ الا انت سُبحانک انی کنت من الظّلمین	حضرت یُونسؑ کی مچھلی کے پیٹ میں دُعا یہ تھی لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہ

پھر اس حدیث کے مطلب پر یُوں ہاتھ صاف کرتے ہیں:۔

"اگر حدیث سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس سے مچھلی کے پیٹ میں چلے جانا ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ فی بطن الحوت جار مجرور مل کر ساقط کے متعلق ہے جو کہ ھو مبتداء کی خبر

محذوف ہے کہ وُہ مچھلیوں کے پیٹ میں گرنے کو تھے کہ اس مضمون پر تقریر فرمائی تو اللہ پاک نے ان کے لیئے آسانی پیدا کر دی ۔ جیسے کہ میں بیان کر آیا ہوں " (ایضاً ص ۲۴۷)

اُب دیکھئے اثری صاحب کونہ تو حضرت یُونسؑ کا قرآن کے الفاظ للبث فی بطنہ سے مچھلی کے پیٹ میں جانا ظاہر ہوتا ہے اور نہ حدیث کے الفاظ اذ ھو فی بطن الحوت سے ۔ اور اثری صاحب کی عادت ہے کہ جب انہیں انکار کی کوئی وجہ نظر نہ آرہی ہو اور قرآن وحدیث کی بات تسلیم کرنے کو جی بھی نہ چاہتا ہو تو قاری کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں کچھ اس طرح ڈال دیتے ہیں کہ وُہ سر پیٹ کے رہ جائے اور خاک بھی نہ سمجھے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں یُوں کہیئے کہ اگر اثری صاحب کو خود اس کی تشریح کرنے کو کہا جائے تو وہ خود بھی سر تھام کے بیٹھ جائیں...... فرما رہے ہیں کہ فی بطن الحوت جار مجرور مل کر ساقط کے متعلق ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ " ساقط " کدھر سے آگیا ؟ اس کے لیئے کوئی دلیل بھی ہے یا فقط آپ کی آرزو کے مطابق ساقط کو محذوف تصور کر لیا جائے ۔

پھر آگے چل کر مزید توضیح فرماتے ہیں کہ :۔

" یونسؑ بھی اگر مچھلیوں کی خوراک بن کر ان کے پیٹ میں چلے جاتے تو اللہ پاک انہیں بھی برآمد کرا لیتا مگر بفضلہٖ تعالیٰ موصوف کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا " (ایضاً ص ۲۴۹)

ہم حیران ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ایک مچھلی اور اس کے پیٹ کا ذکر فرماتے ہیں لیکن اثری صاحب بار بار مچھلیوں اور ان کے پیٹ کا ذکر کیوں فرماتے ہیں ۔ خدا تو یوں فرمائے ۔ اگر یونسؑ تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک اسکے پیٹ میں پڑے رہتے اور آپ یُوں فرمائیں کہ اگر مچھلیوں کے پیٹ میں چلے جاتے تو بھی خدا انہیں برآمد کرا لیتا ۔ کیا قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا یہی طریق ہے ؟

اب ایک دوسرے پہلو سے حافظ صاحب کی اس کاوش اور محنت کی داد دیجئے جس کی بنا پر انہوں نے ابق ، ساھم ، مدحضین ، التقام ، حوت ، مُسَبِّح ، نادیٰ ، ظلمت ، سقیم بغرضیکہ تقریباً تمام الفاظ کے معروف معنیٰ سے گریز اور بعض دفعہ مجازی اور کنائی معنیٰ اختیار کیئے اور بعض دفعہ غلط معنیٰ کر لیئے ۔ پھر بھی بات نہ بنی تو آیات کے تقدیم وتاخیر سے بھی دریغ نہ کیا اور یہ بار بھی گردن پر اُٹھایا ۔ پھر بھی بات نہ بنی تو کچھ قرآنی الفاظ کے ترجمہ یا مطلب کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا ۔ پھر بھی جب فی بطن الحوت کے الفاظ آڑے آئے تو جار مجرور کو ملا کر اس کا محذوف ساقط تلاش کر لیا ۔ اب حافظ صاحب جن جن حربوں میں اپنی مہم میں کامیاب ہوئے اور جس حد تک کامیاب ہوئے وُہ ظاہر ہے ؟ اور جس قدر امانت ودیانت کے ساتھ انبیاءؑ کی عصمت بیان ہو رہی ہے وُہ بھی سب کے سامنے ہے ۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ۔

انبیاء کی حضرت یونسؑ پر تفضیل: بخاری مسلم میں مرفوعاً آیا ہے :۔

ماینبغی لعبدٍ ان یَقُوْلَ انی خیر من یُونس بن مَتّیٰ	کسی شخص کو نہ چاہیئے کہ وہ یوں کہے کہ " میں (رسولِ اکرمؐ) یونس بن متیٰ سے بہتر ہوں ۔

یہی مضمون دُوسری روایت میں اس طرح بھی آیا ہے :۔

لَا تُفَضِّلُوْنِی علیٰ یونس بن متیٰ	مجھے یونس بن متیٰ پر فضیلت نہ دو ۔

اب سوال یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے صرف حضرت یونس کا نام کیوں لیا اور یہ کیوں کہا کہ مجھے اس پر فضیلت نہ دی جائے ؛ حالانکہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ آپ افضل الانبیاء تھے ۔ ایسا بیان کبھی پسند نہ فرماتے تھے جس سے کبھی دوسرے نبی کی خفت یا تحقیر کا پہلو نکلتا ہو ۔ گروہِ انبیاء میں سے حضرت یُونس ایسے نبی ہیں جو اللہ کے حکم کے بغیر ہجرت کے ارادہ سے قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہُوئے تھے ۔ اس لحاظ سے چُونکہ حضرت یُونس کی خفت کا پہلو نکلتا ہے لہٰذا آپ نے حکماً کہہ دیا کہ اس طرح کوئی نہ کہا کرے ۔

اب دیکھئے کہ اثری صاحب جمہور مفسّرین بلکہ قرآنی دلائل کے علی الرغم حضرت یونس کی ہجرت " بحکم الٰہی " قرار دیتے ہیں ۔ اور اس مفروضہ کی وجہ وہی ایک مشکل یا خرقِ عادت امر ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے بعد زندہ کیسے نکل آئے ۔ اس مشکل نے آپ کو ہر مقام پر تاویل کے ذہن میں اُلجھا دیا ۔ اس " تفضیل " کے معاملہ میں بھی یہی صُورت ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ فی الواقعہ حضرت یونس کو اس لحاظ سے تمام انبیاء سے افضل سمجھتے ہیں کہ انہیں ہجرت کے دوران بھی تبلیغ کا موقعہ ملا جو کسی دوسرے نبی کو نہیں ملا ۔ (ب ص ۲۵۴) گویا جو بات رسول اللہؐ نے از راہ انکساری و تواضع فرمائی تھی اسے اثری صاحب نے حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے ۔

حضرت یونسؑ کو ہجرت کے دوران تبلیغ کا موقع بھی اثری صاحب نے خود ہی مہیا فرمایا ہے ۔ اور اس تبلیغ کے موقع کی قائل بھی صرف آپ کی ذات بابرکات ہے ۔ اگر اثری صاحب تسبیح اور تقریر میں تمیز نہ کرسکیں اور تسبیح کو تقریر و تبلیغ کا نام دیتے جائیں تو دوسرے کیسے آپ کے ہمنوا بن سکتے ہیں ۔ بہرحال آپ نے اپنی اسی قائم کردہ بنائے فاسد پر دُوسری بنیاد یہ کھڑی کی کہ چونکہ ہجرت کے دوران کسی دُوسرے نبی کو تبلیغ کا موقع نہیں ملا ۔ لہٰذا آپ سے فی الواقع کوئی بھی افضل نہیں اور حضور اکرمؐ کا ارشاد از راہِ تواضع و انکساری نہیں بلکہ فی الواقعہ حضرت یُونس حضور اکرمؐ سے کسی صورت کم نہیں ۔

۸۔ حضرت داؤد علیہ السّلام

حضرت داؤد وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن پر زبور نازل ہوئی۔ آپ کو معجزہ یہ عطا ہُوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انکے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا تھا۔ جب وہ زرہ بناتے تو پگھلانے کی سخت مشقت اور آلات حدیدی کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے۔ لوہا اور فولاد ان کے ہاتھ میں بآسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

اور ممتاز فضیلت جو آپ کو عطا ہوئی وہ حُسنِ صوت اور خوش الحانی ہے جب آپ زبور پڑھتے اور خدا کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہوتے تو ان کے وجد آفرین نغموں سے نہ صرف انسان بلکہ وحوش و طیور بھی وجد میں آجاتے اور آپ کے ارد گرد جمع ہو کر حمدِ خدا کے ترانے گاتے اور حضرت داؤد کے ساتھ ہمنوا ہو جاتے پہاڑ خدا کی حمد میں گونج اُٹھتے۔ اس طرح ساری فضا اور کائنات لحن داؤدی سے معمور ہو جاتی تھی قرآن کریم نے اس کیفیت کا تین مقامات پر ذکر فرمایا ہے:

(۱) وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ۔ (۲۱/۷۹)	اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا ہے کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم میں ایسا کرنے کی قدرت ہے۔
(۲) وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ (۳۴)	بیشک ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے یہ فضیلت بخشی تھی کہ (وہ یہ کہ ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو! اور پرندو! تم داؤد کے ساتھ مل کر تسبیح اور پاکی بیان کرو۔
(۳) إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ۔ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ ۔ (۳۸/۱۸-۱۹)	بیشک ہم نے داؤد کے لیئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ اس کے ساتھ صبح و شام تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کے ٹھٹھ بھی ان کے گرد جمع ہو جاتے وہ سب ان کے فرمانبردار تھے۔

اب دیکھیے پرندوں اور پہاڑوں کا تسبیح بیان کرنا۔ حضرت داؤد کی تسبیح کے ساتھ ہمنوا ہو جانا پرندوں کا حضرت داؤد کے گرد آکر جمع ہونا یہ سب باتیں عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہیں لہٰذا ان کا اثری مفہوم ملاحظہ فرمائیے:۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ (۳۸) | پہاڑوں کی کھدائی اور سنگ تراشی کا بہت بڑے شاہی پیمانے پر کام ہوتا تھا۔ تمام کاریگر اپنے اپنے کارخانوں میں اور کلرک

اپنے اپنے دفتروں میں اور جج اپنے اپنے محکموں میں اور فوجی اپنی سراؤں اور چھاؤنیوں میں اور پولیس اپنی اپنی چوکیوں میں باضابطہ کام کرتے تھے۔ اور طیاروں ہوائی جہازوں کا سلسلہ بھی ہر طرح سے اطمینان بخش تھا کہ وہ اپنے اپنے اڈوں پر اُتر کر جمع ہوتے تھے۔

اب اس اثری مفہوم میں پہاڑوں کی کھدائی اور سنگ، تراشی یا کارخانوں کے کلرک، چھاؤنیوں کے فوجی اور پولیس افسر قرآن کے کس لفظ کے معنی ہو سکتے ہیں یا کس لفظ سے یہ معنی مستنبط ہو سکتے ہیں؟ یہ تو اثری صاحب یا ان کے شاگرد ہی بتلا سکتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ اثری صاحب فرما رہے ہیں۔ وہ سب ان کا ایسا بیان ہے جس کا قرآن کی مندرجہ آیت سے اگر کچھ تعلق ہے تو اسقدر کہ اس اثری بیان میں جبال کا ترجمہ پہاڑ بھی آگیا ہے۔

آیت ۲ میں آپ نے طیر کے معنی ہوائی جہاز کر کے اور انہیں اپنے اڈوں پر اُتار کر تاریخ سے اپنی لاعلمی کا ثبوت مہیا کر دیا ہے کیونکہ ہوائی جہاز کی ایجاد ۱۹۰۳ء میں ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کم ازکم ہماری اس دنیا میں نہ کوئی ہوائی جہاز اُڑا اور نہ کوئی ہوائی اڈا تعمیر ہوا۔

علاوہ ازیں طیر کے معنی طیارہ کرنا لغوی لحاظ سے بھی غلط ہے۔ عربی زبان اثری صاحب کے اجتہاد کی ہرگز محتاج نہیں۔ وہ اہل عرب کی بول چال کے، تابع ہے اگر کوئی لغت ایسی ہے تو اثری صاحب کو اس کا حوالہ پیش کرنا چاہیئے۔

اثری صاحب کا دعوٰی ہے کہ وہ انبیاء وصالحین کے محاسن بیان فرما کر ان کی تمجید یا ان پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ کیا لحن داؤدی کا شمار محاسن میں نہیں ہو سکتا؟ اسی لحن داؤدی اور خوش الحانی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کی فضیلت بتایا ہے تو اثری صاحب کو یہ فضیلت بیان کرنے سے گھٹن کیوں محسوس ہوتی ہے اور اس کی اُلٹی سیدھی تاویلات پر اُتر آتے ہیں۔

۹۔ حضرت سلیمان علیہ السلام

(۱) بے مثال بادشاہی: حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ الٰہی! مجھے ایسی سلطنت عطا کر جو میرے بعد کسی کو سزاوار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دُعا قبول فرما کر بطور خاص چند چیزیں آپ کو عنایت فرمائیں جن کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِيٓ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْوَهَّابُ ۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ ٱلرِّيحَ تَجْرِى بِأَمْرِهِۦ رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ ۔ وَٱلشَّيَٰطِينَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَغَوَّاصٍ ۔ وَءَاخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِى ٱلْأَصْفَادِ هَٰذَا عَطَآؤُنَا فَٱمْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۸/ ۳۵تا۳۹)

(سلیمانؑ نے دُعا کی کہ) اے میرے پروردگار! مجھے بخش اور مجھے ایسی بادشاہی عطا کر کہ میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو۔ بیشک تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔ پھر ہم نے ہوا کو ان کے زیر فرمان کر دیا کہ جہاں وہ پہنچنا چاہتے ان کے حکم سے نرم نرم چلتی اور دیوؤں کو بھی ان کے زیر فرمان کر دیا جو عمارتیں بنانے والے اور غوطہ زن تھے اور کچھ دوسروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے (ہم نے کہا) یہ ہماری بخشش ہے! پھر چاہو تو احسان کر دیا چاہو تو روک لو۔ کوئی حساب نہیں

اور دُوسری چند باتوں کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:۔

وَقَالَ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ ٱلطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَىْءٍ ۖ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْفَضْلُ ٱلْمُبِينُ ۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمَٰنَ جُنُودُهُۥ مِنَ ٱلْجِنِّ وَٱلْإِنسِ وَٱلطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۷/ ۱۶-۱۷)

اور سلیمانؑ نے کہا لوگو! ہمیں جانوروں کی بولی سکھلائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز عطا فرمائی گئی ہے۔ بیشک یہ اس کا صریح فضل ہے اور سلیمان کے لیے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔

گویا آپ کی دُعا کی قبولیت کی شکل یہ نہ تھی کہ دنیا کا زیادہ سے زیادہ علاقہ آپ کے زیر نگین آ گیا ہو۔ بلکہ اس کی صورت یہ تھی کہ مخلوقات میں سے چند ایسی چیزیں آپ کے تابع فرمان تھیں جو کسی دُوسرے بادشاہ یا نبی کے حصہ میں نہ آئیں مثلاً:۔

(۱)۔ آپ کے لشکر میں انسان اور جن بھی تھے۔ جنوں سے آپ تعمیراتی کام لیتے تھے اور دریاؤں میں غوطہ زنی کے کام پر بھی جنّ مامور تھے نیز پرندے بھی تھے جو پیغام رسانی کا کام کرتے تھے۔ ان کی بولی آپ سمجھتے تھے۔ اور

پرندے بھی آپ کی بات سمجھ کر احکام بجا لاتے تھے۔

(۲) ہوا آپ کے زیرِ فرمان تھی۔ آپ کے بحری بیڑے، اور ہوائی جہاز انتہائی تیز رفتاری سے سفر کرتے یہ ہوا آندھی سے بھی زیادہ تیز چلتی تھی۔ وَالرِّيحَ عَاصِفَةً (۲۱/۸۱) لیکن آپ کی سواری کو ہچکولے نہیں لگتے تھے اس لحاظ سے وہ نرم اور آرام دہ تھی جیسا کہ مندرجہ بالا آیات سے واضح ہے۔

اثری صاحب کے دل کی گھٹن: اب دیکھئے اثری صاحب کو حضرت سلیمانؑ کی اس دعا پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے ایسی بادشاہی کیوں طلب کی جو دوسروں کو سزاوار نہ ہو کہ یہ اللہ کی وسیع رحمت میں بندش ہے لہٰذا شانِ نبوت کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر نبی کو چند ایسی باتیں یا معجزات عطا ہوئے جو دوسروں کو نہیں ہوئے۔ اور یہ خرقِ عادت اُمور کبھی تو نبی کے طلب کرنے پر عطا ہوئے اور کبھی بلا طلب ملے۔ پھر اگر سلیمان نے یہ دُعا کی تھی اور خدا نے وُہ دُعا منظور بھی فرمالی تو اس میں کسی کو گھٹن کیوں محسوس ہو؟ چنانچہ اثری صاحب لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي کی تفسیر یُوں فرماتے ہیں کہ "لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يُفْسِدَ فِيهِ. مِنْ بَعْدِ إِصْلَاحِي"

"یعنی میں اپنے ملک میں اسلامیات کو لازم قرار دے کر اس کی اصلاح کر چکا ہوں۔ اب کوئی شخص میری اصلاح کے بعد فساد اور بے چینی نہ پھیلا سکے" (ص ۲۸۲)

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کی یہ دُعا قبول بھی ہوئی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اگر دُعا کا یہی مطلب ہو جو اثری صاحب فرما رہے ہیں تو یہ دُعا قبول نہیں ہوئی۔ ورنہ بعد میں انبیاء کی بعثت کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا۔ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اثری صاحب کی اس تفسیر کی کوئی بنیاد بھی ہے؟ کیا اس تفسیر کے لیئے وہ کوئی دلیل پیش فرما سکتے ہیں؟

پھر اس تفسیر پر غالباً آپ خود بھی مطمئن نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ایک دُوسرا مطلب بھی پیش فرماتے ہیں کہ "خدایا! میری توجہ کسی ایسے شاندار ملک کی طرف پھیر، جس کی طرف کوئی بڑے سے بڑا تاک لگائے بیٹھا ہے کہ اسے فتح کرلے مگر اس سے پہلے میں فاتح ہو کر اسے دارالاسلام بناؤں پھر وُہ میرے فتح کئے پیچھے اس سے بالکل مائیوس ہو جائے"۔ (ص ۲۸۲)

اس مطلب کے بیان کرتے وقت غالباً ملک سبا آپ کے پیشِ نظر تھا۔ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وُہ بڑے سے بڑا کون تھا جو آپ سے پہلے اس ملک کی تاک لگائے بیٹھا تھا؟ تاریخ سے اس کا کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ سُلیمانؑ کی فرمانروائی کا زمانہ ۹۶۵ ق م سے لے کر ۹۲۶ ق م تک تقریباً ۴۰ سال ہے۔ اس دُور میں اہلِ سبا کی حکومت بڑی متمدن اور بڑی مالدار تھی اور ملکہ سبا کی حکومت جنوبی یمن،

حضرموت اور حبشہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ذرائع آب پاشی کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے بند تعمیر کئے تھے لیکن اس دور میں کسی ایسی بڑی حکومت کا سراغ نہیں ملتا جو سبا پر تاک لگائے بیٹھی ہو اور حضرت سلیمان سے پہلے اسے فتح کرنے کی خواہشمند ہو مگر اثری صاحب کو ایسی تاریخی باتوں سے کیا سروکار ؟

ہوا کی تسخیر: اور سلیمانؑ کے لیئے اللہ تعالیٰ نے ہوا کو جو مسخر کیا تھا تو اس کے متعلق فرمایا : "اور ہم نے ایسے تیز رفتار ہوائی جہازوں کا بھی اضافہ کر دیا جو کہ دو مہینوں کے پیدل سفر کی آمدورفت تک کی مقدار تک کسی طرف جہاز پہلے پہر روانہ ہوتے تو اسی دن پچھلے پہر واپس بھی ہوائی اڈے پر اُتر آتے۔" (ب صـ۲۹۲)۔ بتلایئے اس مطلب میں تجری بامرہ یعنی ہوا سلیمانؑ کے حکم سے چلتی تھی"۔ کا شائبہ تک بھی ملتا ہے۔ ہوائی جہازوں کو ان کے اڈوں سے چڑھا کر اور اُتار کر آپ نے سلیمانؑ کی اعجازی حیثیت کو تو ختم کر دیا اور غالباً ان کی عصمت بیان کر دی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس دور میں ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے تھے یا ان کے اڈے تعمیر ہو چکے تھے ؟ اگر ایسی صورت ہو تو پھر عام لوگ بھی یقیناً ہوائی سفر کرتے ہونگے پھر اس میں حضرت سلیمانؑ کی کیا خصوصیت رہی اور ان پر بالخصوص انعام الٰہی کیا ہوا ؟ لیکن اثری صاحب تو اس زمانہ میں جمہوری انتخابات بھی کروا سکتے ہیں اگر ہوائی جہاز اڑا دیئے تو پھر کیا ہوا ؟

جنات پر غلبہ: آگے لکھتے ہیں : "اور مجرموں کے لیئے جیلوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ بھی بہت پختہ کر دیا" (ب صـ۲۹۲) (یہ غالباً وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ کی تفسیر شروع ہو رہی ہے)۔ علاوہ اس کے لوہا، تانبہ، پیتل، قلعی، شیشہ، سکہ، چاندی، سونا وغیرہ دھاتوں کے پگھلانے اور مختلف چیزوں کے بنانے کے لیئے علیحدہ علیحدہ کارخانے جاری کرائے۔ جن میں زیور، برتن تلوار چھری، چاقو و دیگر سامان ضرورت وحرب، نقشہ جات کے مطابق تیار ہوتا اور تعمیری انجنیئروں کا کام بھی نقشوں کے مطابق ہوا کرتا اور غوطہ زنی سے دریائی چیزوں کو حاصل کرنے کا بھی انتظام موجود تھا۔" (صـ۲۹۲)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ معمار اور غوطہ زن کون لوگ تھے ؟ قرآن نے ان کی جنس بتلا دی ہے کہ وہ جن تھے تو پھر اثری صاحب کو یہ بتلاتے ہوئے کیوں جھجک محسوس ہوتی ہے اور ان معماروں، کاریگروں اور غوطہ زنوں کی جنس بتلانا کیوں گوارا نہیں کرتے۔

سلیمانی عہد: اثری صاحب ترمذی اور ابوداؤد کی ایک مرفوع حدیث نقل فرماتے ہیں :-

اذا ظهرت الحية فی المسكن فقولوا لها انا نسئلك بعهد نوح وسليمان	اگر کسی گھر میں سانپ نظر آئے تو اسے نوحؑ اور سلیمان بن داؤدؑ کا عہد یاد دلا کر کہو کہ ہمیں تکلیف

بن داود ان لا تؤذ ینا فان عادت فاقتلوھا   نہ پہنچائے۔ پھر اگر دوبارہ ظاہر ہو اسے مار ڈالو۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ جن بھی مختلف جانداروں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں لہٰذا گھروں میں سانپ دیکھو تو مارنے سے قبل اسے یہ الفاظ کہہ دو۔ اگر تو وُہ فی الواقع جن ہوگا تو چلا جائے گا۔ اور اگر وُہ جن نہیں بلکہ سانپ ہی کی جنس ہے۔ تو پھر اس پر اس بات کا کچھ اثر نہ ہوگا اور وہ دوبارہ سہ بارہ بھی نظر آسکتا ہے لہٰذا وہ فی الواقع حقیقتہً سانپ ہے اسے مار ڈالو۔

اب اثری صاحب زبان سے گو ہزار بار جنوں کے الگ مخلوق ہونے کا اقرار کریں مگر جب جنوں سے متعلق کوئی معاملہ درپیش ہو تو فوراً سرسیّد کے ہمنوا بن کر ذہنی طور پر جنوں اور ان کے کاموں سے منکر بن جاتے ہیں۔ اور ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی ہے۔ اب دیکھئے اس سلیمانی عہد کی کیا تعبیر پیش فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اسے (سانپ کو) کیا یاد دلانا ہے۔ بلکہ یہ خود اپنے لیے استحضار و استذکار ہے کہ سانپ کبھی گھر کی راہ لے کر کہیں جا رہا ہوتا ہے تو اسے مارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خطرہ ہے کہ وُہ بھی حملہ کر دے کہ اسے خواہ مخواہ چھیڑا گیا ہے۔ گویا ایک گھر میں باہم مخالف دو گھرانے آباد ہوئے۔ جن میں سے ایک کی خیر نہیں تو اب اس کا مارنا ضروری ہوا کہ اپنی جان بچائی جائے بس یہی نوحی اور سلیمانی عہد ہے کہ انہوں نے سانپوں و دیگر سب موذیوں سے خواہ وہ ناطق ہوں یا غیر ناطق یہی معاملہ کیا ہے۔" (ب ص۲۸۵)

اب دیکھئے کہ

(۱) رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جب گھروں میں سانپ دیکھو تو انہیں کہو کہ نوحؑ اور سلیمانؑ کا عہد یاد کرو اور ہمیں تکلیف نہ دینا۔ یہ الفاظ دیکھنے والے کو اپنی زبان سے سانپ کو مخاطب کر کے ادا کرنا چاہئیں لیکن اثری صاحب فرماتے ہیں کہ اگر گھر میں سانپ کو پہلی بار دیکھو تو اُسے کچھ نہ کہو چھوڑ دو اور اپنی راہ جانے دو۔

(۲) رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جب گھر میں سانپ دیکھو تو یُوں کہو اور اثری صاحب کہتے ہیں کہ "انہوں نے (؟) سانپوں اور دیگر سب موذیوں سے ناطق ہوں یا غیر ناطق یہی معاملہ کیا ہے۔" انہوں نے کیا معاملہ کیا ہے؟ انہوں نے غالباً معاملہ یہ کیا ہے کہ بچھو یا اس جیسے کسی دیگر موذی جانور ناطق یا غیر ناطق کو پہلی بار دیکھو تو چھوڑ دو۔ یہ چھوٹ حافظ اثری صاحب اپنی طرف سے دے رہے ہیں۔ رسول اللہؐ نے قطعاً ایسا نہیں فرمایا۔

(۳) نوحی اور سلیمانی عہد یہ نہیں کہ سانپ کو پہلی بار دیکھنے پر اسے مخاطب کر کے عہد یاد دلا کر کہا جائے۔

کو ہمکو تکلیف نہ دینا بلکہ نوحی اور سلیمانی عہد یہ ہے کہ پہلی بار دیکھو تو چھوڑ دو ۔ دوبارہ سہ بارہ دیکھو تو مار دو" اب الفاظ فرمائیے کہ جو کچھ اثری صاحب فرما رہے ہیں یہ تو ایک ہدایت ہے ؟ یہ عہد کیسے ہو گیا اور تذکیر کیسے ہوئی ؟

بہرحال اس تاویل سے اثری صاحب کو چیونٹی کی مافوق الفطرت باتوں کی تردید مقصود تھا۔ وہ آپ نے کر دی

منطق الطیر اور اثری صاحب کی طنز: سلیمانؑ کے پرندوں کی بولی سمجھنے پر بھی اثری صاحب کو سخت اعتراض ہے ۔ آپ ایک سوال اُٹھا کر یوں فرماتے ہیں کہ :-

"منطق الطیر جو سلیمان علیہ السّلام کو سکھلائی گئی تو کیا آپ کوّوں کی طرح کائیں کائیں اور چڑیوں کی طرح چوں چوں کیا کرتے تھے ؟ جو کہ شانِ نبوّت کے بالکل خلاف ہے ۔" (ب ص ۲۹۷)

عُلِّمنا منطق الطیر کا یہ مطلب کسی نے ہرگز بیان نہیں کیا بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ پرندوں کی بولی سمجھ جاتے تھے اور اگر آپ انہیں اپنی زبان میں کچھ سمجھاتے تو پرندے بھی سمجھ جاتے ۔ جیسا کہ ایک دفعہ رسول اللہؐ نے بھی ایک اُونٹ کی شکایت سُن کر رفع فرمائی لیکن جب کسی کا ذہن ایسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو تو وُہ ایسے بیہودہ سوال اُٹھا دیتا ہے جس سے کچھ کراہت اور نفرت پیدا ہو۔

منطق الطیر کے مختلف مطالب: اثری صاحب نے یہ سوال اُٹھانے کے بعد منطق الطیر کے کئی مختلف مطالب بیان فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں :

مطلب ۱ : ہر کسی کو اپنی مادری بولی کے علاوہ دوسری بولی جسے وُہ جانتا نہیں۔ گویا پرندوں کی ایک آواز ہے ۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ۔ ہاں جب وہ اسے لے تو وہ اس کے حق میں بولی ہے ۔"

بجا فرمایا آپ نے لیکن یہ نہیں بتلایا کہ حضرت سلیمان کو کون سے ملک کی غیر ملکی زبانیں سکھلائی گئیں تھیں ۔ جن میں وُہ خود ترجمان تھے ۔ قرآن نے اگر یہ بتلایا کہ سلیمانؑ پرندوں کی بولی جانتے تھے تو ساتھ کم از کم دو واقعات سے چیونٹی کی زبان اور ہُدہُد کی زبان سمجھنے کا بھی ذکر فرما دیا ہے ۔ اثری صاحب کو بھی کچھ نہ کچھ تو بتلانا چاہیئے تھا ۔

مطلب ۲ : "کہ ہماری ہوائی طاقت بھی کافی ہے اور اس میں دن بدن اضافہ بھی ہو رہا ہے اور ہوا باز بھی ہمارے مطیع ہیں ۔" (ص ۲۹۸)

زندہ باد ! سمجھے آپ منطق الطیر کا مطلب چونکہ اسس میں لکھا ہے کہ النطق کے معنی طاقت میں زیادہ ہونا ہے ۔ لہٰذا منطق کے بھی یہی معنی ہیں اور طیر کے معنی ہیں ہوائی جہاز ۔ گویا طیر اور طیارہ اثری لغت کے

لحاظ سے دونوں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔

مطلب ۳: "سلیمانؑ نے حسب ضرورت اشاروں پر مشتمل کوئی فرضی بولی تجویز اور ایجاد فرمائی جو ان خاص لوگوں کے سوا جن کو وہ سکھلائی جاتی دوسروں کے لیے گویا پرندوں کی بولی کی طرح ایک ناقابلِ فہم بات تھی جیسے ٹیلیگراف کی ٹک ٹک وغیرہ" (ص ۲۹۹)

ٹیلیگراف کی ٹک ٹک اور ٹن ٹن وغیرہ کو تو ٹیلیگراف ہی کہا جاتا ہے۔ اگر اس ایجاد کا نام پہلے سے ہی منطق الطیر موجود تھا تو نیا نام رکھنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ کم ازکم اہلِ عرب کو تو آج بھی تلغراف کے بجائے منطق الطیر کا لفظ ہی استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ اور اگر وہ کوئی اور ایجاد تھی تو صفحۂ ہستی سے گم کیسے ہو گئی؟

مطلب ۴: اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شارٹ ہینڈ کی کوئی صورت ہو۔"

مطلب ۵: اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہوائی جہازوں کو بنانے اور چلانے کے اُصول سکھائے جاتے ہوں۔

مطلب ۶: "جنگی شعار بھی مُراد ہو سکتا ہے۔"

مطلب ۷: ترخیم کی صورت بھی ہو سکتی ہے جیسے ایم اے۔ ڈی سی۔ اور این ڈبلیو آر وغیرہ

مطلب ۸: "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گونگوں کو اشاروں سے علوم وفنون سکھائے جاتے ہوں"۔

مطلب ۹: "کسی پرندے یا جاندار کی طبعی حرکت اور ظاہری حالت سے اندازہ کر لینا بھی اس سے مراد ہو سکتا ہے۔"

مطلب ۱۰: اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان مشق کر کے پرندوں کی بولیاں سیکھ لے مگر یہ عامی لوگوں کا کام ہے۔ موصوف کے شایانِ شان نہیں۔"

گویا یہ دس مطلب منطق الطیر کے ہو سکتے ہیں لیکن صرف وہ مطلب نہیں ہو سکتا جو عام فہم ہے یعنی پرندوں کی بولی سمجھنا اور یہی مفہوم قرآن کے ربط آیات سے واضح ہوتا ہے۔

۲۔ منطق الطیر اور وادئ نمل:

ارشادِ باری ہے:۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ	یہاں تک کہ چیونٹیوں کے میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان

سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ (۲۷ / ۱۸-۱۹) | اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو تو سلیمان اس چیونٹی کی بات سے ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ اے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کرسکوں جو تو نے مجھ پر کی ہے۔

اَب دیکھئے کہ اس کا ٹھیک ترجمہ آپ یوں بیان فرماتے ہیں:۔

اثری تاویل: "آپ وادی النمل کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا اور خط بھیج کر وہاں کی رانی کو آگاہ فرمایا۔ جس رانی نے ارکانِ دولت کے مشورہ سے حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو کر دروازے بند کر دیں تاکہ سلیمانؑ کو معلوم ہو جائے کہ ہم جنگ کے لیئے تیار نہیں۔ ورنہ اگر مقابلہ ہُوا تو اس کا لشکر بہت جرار ہے وہ ہم سب کو کچل دے گا۔ پھر یہی مضمون لکھوا کر اور چند تحفے دیکر قاصد بھیجا۔ جسے دیکھ کر آپ مُسکرائے اور خوش ہوئے اور جواباً فرمایا کہ ہم بھی امن و صلح چاہتے ہیں۔ اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ جنگ کے بغیر یہ مرحلہ بھی طے ہُوا۔" (ص ۲۹۶ - ۲۹۷)

دیکھا آپ نے اثری صاحب چیونٹی کے بولنے اور اس بات کو حضرت سُلیمان کے سمجھنے کے قصہ کو کیسے گول کر گئے اور قصہ کی صورت ہی بدل دی۔ اس تبدیلی کی وجہ وہ خود بھی حاشیہ میں درج فرما رہے ہیں کہ "چیونٹیوں کی کوئی آواز ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو کان لگا کر بھی مسموع نہیں پھر ایک چیونٹی کی بات کو سلیمانؑ اور دُوسری چیونٹیوں نے اپنی جگہ پر سُن لیا کوئی قرینِ قیاس بات نہیں۔"

اگر یہی بات تھی جیسا کہ اثری صاحب کا خیال ہے تو سلیمانؑ نے یہ کیوں کہا تھا:۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ (۲۷ / ۱۶) | اے لوگو! ہمیں جانوروں کی بولی سکھلائی گئی ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے آخر میں حضرت سلیمان اور ان کے لشکر کے متعلق یہ مقولہ منقول ہے وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ یعنی ایسا نہ ہو کہ وُہ تم کو پیس ڈالیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو کہ تمہاری جانوں پر کیا حادثہ گزر گیا۔ لہٰذا نملہ سے انسانوں کا گروہ مُراد لینا آیت کی تفسیر نہیں تحریف ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ سلیمانؑ اس نملہ کی بات سے ہنس پڑے۔ اگر یہ انسانوں کا گروہ تھا تو انکے اس کلام میں ایسی تعجب کی کیا بات تھی جس سے سلیمانؑ ہنس پڑے اور خدا کا شکر یہ بھی ادا کرنے لگے۔

یہ توجیہہ دراصل احمد ذکی پاشا مصری نے اپنے ایک مقالہ میں پیش کی اور اثری صاحب تو ایسے ہی عقل پرستوں کے مقلد ہیں۔ ان کو کہیں سے اور کسی سے بھی کوئی ایسی بات مل جائے جو کسی خرقِ عادت امر کے خلاف ہو وہ انہیں قابلِ قبول ہوتی ہے خواہ اس پر عقلی اور نقلی لحاظ سے کیسے ہی اعتراض

وارد ہوں۔

عام فہم ترجمہ پر دُوسرا اعتراض آپ کو یہ ہے کہ "آپ کا یہ سفر تین حالتوں سے خالی نہیں۔

(۱) چیونٹیوں کی زیارت کے لئے ہو۔ یہ مقصد شانِ نبوّت ومملکت کے خلاف ہے۔ پھر چیونٹیوں کے بل توہر جگہ ہوتے ہیں جہاں سے آپ روانہ ہوئے وہاں بھی تھے۔راستہ میں بھی تھے پھر سفر کی ضرورت کیا تھی؟

(۲) اگر یہ کام ضمنی ہے اور اصل مقصد کسی قوم پر چڑھائی ہے تو یہ قرآن کی شان کے خلاف ہے کہ اصل مقصد کا تو ذکر تک نہ کرے اور ضمنی کام کی تفصیل بیان کرے۔

(۳) اگر اسی قوم پر چڑھائی اصل مطلوب ہے جس کا ذکر ہے تو پھر معلوم ہوا کہ یہ عرفی چیونٹیاں نہیں بلکہ ایک حربی قوم ہے۔" (ص ۲۹۳ حاشیہ)

بات تو صرف اتنی ہی تھی کہ آپ اپنے لشکروں سمیت جارہے تھے۔ راستہ میں ایک ایسا مقام آیا جہاں چیونٹیوں کے بل بکثرت موجود تھے۔ وہاں ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹی کو پکارا جسے حضرت سلیمانؑ نے بھی سُن لیا اور چیونٹی کے یہ الفاظ سُن کر مُسکرائے بھی اور اللہ کا شکر بھی ادا کیا۔ مسکرائے اس بات پر کہ ہر جاندار خواہ وُہ کتنا چھوٹا اور حقیر کیوں نہ ہو اسے اپنی جان کس قدر عزیز ہے اور شکر اس بات پر کہ اللہ نے مجھے ایسے بے زبان جانوروں کی بولی بھی سمجھنے کی توفیق عطا کی ہوئی ہے۔ تو قرآن کا اصل مقصد یہی منطق الطیر کا مفہوم سمجھانا اور اس پر سلیمانؑ کا کبر ونخوت کے بجائے عجز و نیاز سے اللہ کا شکر ادا کرنا تھا۔ رہا جہاد اور جنگ کا ذکر تو ایسے واقعات بادشاہوں کو اور اسی طرح سلیمانؑ کو کئی بار پیش آئے ہوں گے۔ قرآن کس کس کا ذکر کرے۔ قوم سبا کا قصہ قابلِ ذکر تھا۔ وہ قرآن نے بیان ہی کر دیا ہے۔

پھر آپ نے کتب لغت اور تفاسیر کے حوالہ سے بتلایا ہے کہ وادی النمل ایک مقام کا نام ہے اگر فی الواقع وادی النمل کسی مقام کا نام ہو تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اب ہم چیونٹیوں کی کسی وادی کو وادی النمل نہیں کہہ سکتے۔ اگر عرب میں ایک قبیلہ کا نام کلاب ہے تو کیا ہم کتوں کو کلاب نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ کلاب قبیلہ کے سردار کو کلب ہی کہیں۔ جیسا کہ آپ کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نملہ ان کی رانی تھی۔ نملہ نمل کی واحد ہے۔ اور اس کے آخر کی ۃ کو تائے تانیث قرار دیکر شاید راجہ کی بجائے رانی کا نام پسند فرمایا ہے۔ اب یہ رانی پکارتی ہے یاایھا النمل۔ اے نملو، نملیو!

دُوسرا اعتراض آپ کے ترجمہ پر یہ وارد ہوتا ہے کہ واقعہ آپ خواہ کسی دَور کا بیان کر رہے ہوں

شریعت اس پر محمدی یا رسول اکرمؐ کا اسوہ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

اکثر ہوتا تو یوں ہے کہ اگر دشمن گھروں میں گھس جائے تو حملہ آوروں کو ان کا کچومر نکالنے کا زیادہ بہتر موقع مل جاتا ہے۔ اس بات کا خیال جب حافظ صاحب کو آیا تو حاشیہ میں فرماتے ہیں :

"یہ اسلامی قانون ہے معلوم نہیں یہ اسے (نملہ رانی) کو کیسے معلوم ہُوا۔ شاید اس نے مطالعہ کیا یا اسے کسی نے بتا دیا ہو گا"! (ص ۲۹۶ حاشیہ)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ تو اسلامی قانون ہے (آدمؑ سے لے کر قیامت تک دین اسلام ہی رہا ہے) اور نہ شریعت محمدی کا قانون ہے۔ البتہ رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ ضرور ہے جس کا مظاہرہ آپ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر کیا کہ "جو کوئی اپنے گھر میں بند ہو جائے اس کو بھی امان ہے ... الحدیث۔

کیا رسُولِ اکرمؐ نے خیبر کے موقعہ پر قلعہ بند یہودیوں سے جنگ نہیں کی؟ پھر یہ اسلامی قانون کیسے ہُوا؟

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر حافظ صاحب کے پاس وہ کون سے ذرائع اور دلائل ہیں جن کی بنا پر آپ نے لکھا ہے کہ نملہ رانی نے سلیمانؑ کو تحائف بھیجے اور تحریر نامہ روانہ کیا۔ جس کے جواب میں آپ نے بھی اس کو خط لکھ کر مطلع فرمایا کہ اگر آپ دربند ہو جائیں تو ہم بھی امن وصلح چاہتے ہیں۔ آخر ان کی ایسی معلومات کے ماخذ کیا ہیں؟ قرآن تو کہتا ہے کہ سلیمانؑ اس چیونٹی کی بات (مِنْ قَوْلِهَا) پر ہنس پڑے لیکن اثری صاحب سلیمانؑ کو تحائف اور تحریروں سے خوش کر رہے ہیں۔

۴۔ ہُدہُد کی پیغام رسانی اور ملکۂ سبا

ملکہ سبا کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ اس قصہ میں قرآن کے جن جن مقامات کو آپ نے اپنی تاویل کا ہدف بنایا ہے۔ ہم صرف انہیں کا ذکر کریں گے۔ درج ذیل آیات کا اثری ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۲۷ ۲۰-۲۱	"آپ نے طیاروں کا ملاحظہ فرمایا تو دیکھا کہ ہُدہُد نامی طیارہ[ؒ] غائب ہے۔ فرمایا اگر وہ پیش ہو کر معقول وجہ بیان کر دے تو خیر ورنہ میں اسے بلے اجازت غیر حاضری پر مناسب سزا دوں گا"۔ (ص ۳۰۳)

ؒ "ہدہد کا کلام کرنا بھی چونکہ عقل کے خلاف اور خرقِ عادت امر ہے لہٰذا عقل پرستوں نے یہ تاویل کی کہ پہلے زمانہ میں دستور تھا کہ مُشرکین اکثر اپنی اولاد کے نام دیوتاؤں اور دیویوں کے نام پر رکھ لیا کرتے تھے جن میں حیوانات کے نام بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا اس جگہ بھی ہدہد سے پرندہ مُراد نہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ

کا قاصد انسان مراد ہے جس کا نام غالباً ہدہد ہوگا۔ اس پر اعتراض وارد ہوا کہ قرآن نے جب وتفقد الطیر کہا ہے تو پھر اس ہدہد کو انسان سمجھنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ تب مولوی چراغ علی نے اس کی یہ توجیہہ بیان کی کہ اس جگہ طیر کے معنی فوج کے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ لغت اس معنی کی تائید نہیں کرتی اور نہ ہی لغت میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ زبان تو اہل زبان کے استعمال کے تابع ہوتی ہے اور طیر کا لفظ عربی میں حقیقی یا مجازی کسی معنی کے اعتبار سے بھی فوج کے لیے مستعمل نہیں۔

اب اثری صاحب کو یہ سوجھی کہ طیر کے معنی طیارہ کر لو اور اس طیارہ کا نام رکھ لو ہدہد۔ یہ بھی مولوی چراغ علی کی طرح ایسی تاویل ہے جسے لغت سے تائید حاصل نہیں۔ اور دوسری مشکل یہ پیش آئی کہ طیارہ بول نہیں سکتا۔ جبکہ ہدہد کا حضرت سلیمانؑ سے ہم کلام ہونا قرآن میں مذکور ہے لہٰذا اثری صاحب کی آشفتہ دماغی ان سب سے بڑھ کر ہے وہ کبھی ہدہد سے مراد طیارہ لیتے ہیں، کبھی طیارے کا پائلٹ جو قاصد کے فرائض بھی سرانجام دے رہا ہو اور کہیں کوئی عام انسان۔

اب اثری صاحب نے خود ہی ایک دوسرے مقام پر ہدہد سے مراد طیارہ ہونے سے تو بہرحال انکار کر دیا ہے لکھتے ہیں:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہدہد کوئی کٹر قسم کا موحد ہے، جس نے نبی کے سامنے یہ جملہ بولا اور پھر جو ملک سبا کا حال بیان کیا اور ساتھ ہی شرک کا رد بھی شروع کر دیا" (پ صـ311 کا حاشیہ)

اور یہ تو ظاہر ہے کہ طیارہ موحد نہیں ہو سکتا۔ نہ بول سکتا ہے نہ شرک کا رد کر سکتا ہے۔

ہُد ہُد کون؟ پرندہ یا انسان یا طیارہ؟

ان آیات کے ترجمہ میں آپ نے (۱) طیر کا معنیٰ طیارہ بیان فرمایا ہے جس کی کوئی گنجائش نہیں نہ لغوی لحاظ سے نہ عقلی اور نہ نقلی لحاظ سے۔ پرندہ کی نوع کے لیے طیر اسم جنس ہے۔

(۲)۔ اس طیارہ کا نام "ہدہد" تجویز فرمایا ہے۔ حالانکہ ہدہد ایک مخصوص پرندہ کا نام ہے۔

(۳)۔ سلیمانؑ نے بطور سزا کے "سخت سزا دینے کے علاوہ" اَوْ لَاَذْبَحَنَّهٗ بھی فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ پرندہ کو تو ذبح کیا جا سکتا ہے لیکن طیارہ کو ذبح نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہاں ہُدہُد کا مفہوم متعین ہو گیا کہ یہ ہدہد کوئی پرندہ ہے طیارہ نہیں۔ غالباً اسی لیئے اثری صاحب لَاَذْبَحَنَّهٗ کا ترجمہ یا مطلب چھوڑ گئے ہیں۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ (27/22-23)

"پھر جب وہ (طیارہ) حاضر ہوا تو اس نے معذرت بیان کی۔ میں ادھر سے اڑتا ہوا آ رہا تھا کہ ایک جگہ اترنا پڑا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں

ایک رانی حکومت کر رہی ہے" (ص ۳۰۳)

اس آیت میں آپ اسی ہدہد نامی طیارہ سے معذرت کروا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اب وہ ہدہد نامی طیارہ، ہدہد نامی انسان بن گیا ہو یا اس ہدہد نامی طیارے کے پائلٹ کا نام بھی ہُدہُد ہی ہو۔ یہ تو اثری صاحب ہی بہتر جانتے ہیں۔ اب اس ہدہد نامی طیارے نے اُتر کر لوگوں سے حالات دریافت کئے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حالات دریافت کرنا کس لفظ کا معنیٰ ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۷ / ۲۷-۲۸)	سلیمانؑ نے کہا۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تو نے سچ بولا ہے یا غلط بیانی کی ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور ان لوگوں کی طرف ڈال دے۔ پھر ان سے الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردعمل کرتے ہیں۔

اب ان آیات کا اثری ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"آپ نے فرمایا کہ تو راستہ سے آگاہ ہے اور تجھے یہ لگن بھی ہے۔ میں تجھے ایک خط لکھ دیتا ہوں۔ اسے لے جاکر اسے پہنچا۔ پھر اس کے جواب کے بعد کوئی مناسب قدم اُٹھایا جاسکتا ہے" (ص ۳۰۴)

اس ترجمہ میں (۱) خطِ کشیدہ الفاظ قرآن کے کسی لفظ کا ترجمہ نہیں اور جو قرآن کے الفاظ ہیں کہ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ "تو سچا ہے یا جھوٹا"۔ وہ آپ چھوڑ گئے ہیں۔ پرندے کی جگہ ہوائی جہاز یا اس کے پائلٹ ہُدہُد نامی کو مخاطب کرنے کی مناسبت سے یہ ردوبدل آپ کو کرنا پڑا۔

(۲) قرآن کے الفاظ ہیں فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ۔ میرا رقعہ اُن کے آگے ڈال دے یا پھینک دے۔ ان الفاظ سے پرندہ کو تو ہدایت دی جاسکتی ہے لیکن ہُدہُد نامی قاصد کو ایسی ہدایت نہیں دی جاسکتی۔ کسی قاصد انسان سے یہ کہنا کہ میرا یہ خط رانی یا درباریوں کے آگے ڈال دو یا پھینک دو۔ حد درجہ کی بدتمیزی ہے اسی وجہ سے آپ کو ترجمہ یوں کرنا پڑا۔ "اسے لے جاکر اسے پہنچا"۔ اَلْقِہْ کے معنی پہنچانا کر دینا حافظ صاحب جیسے عالم فاضل ہی کرسکتے ہیں۔

(۳) آگے قرآن کے الفاظ ہیں فتول عنهم فانظر۔ ان لوگوں سے پیچھے الگ ہٹ کر دیکھتا رہ۔ ایسے الفاظ سے پرندہ کو تو ہدایت دی جاسکتی ہے۔ ایک قاصد انسان بھلا یہ خدمت کیونکر سرانجام دے سکتا ہے۔ غیر ملکی قاصد کے سامنے بھلا کون سی حکومت اپنے جوابی مشورے کرسکتی ہے؟

۵۔ ملکہ سبا کا تخت: ملکہ سبا اپنے سرداروں سمیت وہاں سے روانہ ہو کر سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہونے کو روانہ ہوئی۔ جس کی آپ کو اطلاع مل چکی تھی۔

ابھی اس کے پہنچنے میں ایک دو دن کا سفر باقی تھا کہ آپ نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ۔ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ (۲۷ : ۳۸ تا ۴۲)

سلیمانؑ نے کہا اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اس کا عرش میرے پاس لاتا ہے۔ پہلے اس کے کہ وُہ مطیع ہوکر میرے پاس آئیں۔ ایک قوی ہیکل جن نے کہا۔ میں اس کو آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے پہلے لا سکتا ہوں۔ میں اس بات کی طاقت بھی رکھتا ہوں اور امین بھی ہوں۔ اب اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا، کہا کہ میں اسے آپ کی پلک جھپکنے سے پیشتر لا سکتا ہوں۔ جونہی سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو سلیمانؑ کہنے لگا یہ میرے پروردگار کا فضل ہے کہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت؟ جو کوئی شکر کرے تو اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور بزرگ ہے۔ سلیمانؑ نے کہا۔ اس کے تخت کی شکل بدل کر عجیب سی بنا دو۔ ہم دیکھیں گے کہ وُہ کچھ سوجھ رکھتی ہے یا ان لوگوں سے ہے جو سوجھ نہیں رکھتے جب وہ آپہنچی تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کا تخت بھی اسی طرح کا ہے کہنے لگی یہ تو گویا وُہی ہے اور ہمیں اس سے پہلے ہی (سلیمانؑ کی عظمت کا) علم ہوگیا تھا اور ہم فرمانبردار ہیں۔

اب ان آیات کا اثری ترجمہ یا مطلب یا مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

ٹھیکیدار اور ان کے ٹینڈر: "سلیمانؑ نے اپنے ٹھیکیداروں کے نام ٹینڈر جاری فرمائے کہ ہمیں ہدہد کے بیان کردہ طرز و صورت پر ملک کے لیے ایک خوبصورت پائیدار تخت اتنی جلدی مطلوب ہے کہ اس کے آنے سے پیشتر تیار ہوکر ہمارے تجویز کردہ کمرہ میں سجا دیا جائے۔" (ص ۳۰۵)

گویا کہ سلیمانؑ کو ملکہ سبا کا عرش مطلوب نہ تھا بلکہ اس کی طرز کا تخت مطلوب تھا۔ اب دیکھیے قرآن میں لفظ ہے بعرشھا (اس کا عرش) لہٰذا آپ اس کی تاویلات یوں فرماتے ہیں:۔

عرشہا کی مختلف تاویلات: (۱) "عرشہا میں لام جارہ محذوف ہے یعنی عرشہا کو عرش لہا سمجھنا چاہیئے جیسے کہ ھُمْ دَرَجٰتٌ میں لہم درجات مراد ہے" (ص ۳۱۲)

اب سوال یہ ہے۔ ہُم درجات عندربہم پڑھ لیا جائے یا لہم درجات عندربہم کہا جائے۔ سمجھنے والا دونوں کا مفہوم ایک ہی سمجھتا ہے۔ لیکن عرشہا اور عرش لہا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عرشہا بمعنی اس عورت کا اپنا تخت اور عرش لہا بمعنی کوئی بھی تخت جو اس کے لیئے ہو یا بنایا جائے۔ لہٰذا یہاں لام جارہ محذوف قرار دینا تحریف لفظی بھی ہے اور معنوی بھی۔ اس تاویل کے غلط ہونے کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ سلیمانؑ آگے چل کر فرماتے ہیں۔ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا۔ اگر یہ تخت ملکہ کا اپنا نہ تھا۔ بلکہ اس کے لیئے کوئی نیا تخت بنوایا گیا تھا تو اس کا حلیہ بگاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ پہلے ہی بدلی ہوئی شکل کا تیار کروا لیا جاتا۔ ملکہ کے لئے نیا تخت بنوانا پھر فوراً اس کی شکل بدل دینے کا حکم دینا آخر کون سی عقلمندی ہے؟

(۲)۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ "عرشہا سے مراد بعرشہا الذی یصنع لھا۔ اور اگر مثل مقدر مان کر مثل عرشہا کہا جائے تو بات اور صاف ہوجاتی ہے یا یوں کر لیا جائے کہ یاتینی بعرش یتشبہُ بعرشہا۔"

(ص ۳۱۳)

یعنی آپ چاہتے یہ ہیں کہ یا تو ملکہ کے تخت کی بجائے "ملکہ کے لئے تخت" کہا جائے یا اس کی مثل کہا جائے یا اس سے ملتا جلتا تخت کہا جائے تو تب بات اور بھی صاف ہوتی ہے اور اگر عرشہا ہی پڑھا جائے جیسا کہ قرآن میں ہے تو بات صاف نہیں ہوتی۔ اس پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ نیا ہی تخت بنوانا تھا جو اس کے لئے ہو یا اس کا ہم شکل یا ملتا جلتا ہو تو پھر اس کی تنکیر کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پہلے ہی ایسا بنوا لیا جاتا۔

اور جو بات اثری صاحب صاف کرنا چاہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ واقعہ خرقِ عادت نہ رہے۔ اسی صفائی اور اپنے دل کی گھٹن دُور کرنے کے لئے آپ تاویل کے اتنے طریقے پیش فرما رہے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں "آپ نے ٹھیکیداروں سے ٹینڈر طلب فرمائے۔" اب یہ آپ کو کون بتلائے کہ مَلَأُ کے معنی سرکاری۔ درباری لوگ ہوتے ہیں۔ ٹھیکیدار نہیں ہوتے اور ٹینڈر طلب فرمانے کی بات بھی کیا خوب بنائی ہے۔ کیا آپ کوئی تاریخی شہادت پیش فرماسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں ٹینڈر طلب فرمانے کا دستور تھا؟ آپکا کمال یہ ہے کہ بات ایک ہزار سال قبل کی کرتے ہیں اور دستور موجودہ دُور کا اس پہ فٹ کرنا چاہتے ہیں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: "ایک ٹھیکیدار نے کہا کہ میں اتنی جلدی تیار کر سکتا ہوں کہ اس کے آنے پر جب آپ استقبال کے لیئے کھڑے ہوں تو بیشک اسے اپنی جگہ پر بچھا سجا ہوا ملاحظہ فرمالیں۔ دُوسرا بولا میں

اس سے بھی جلدی تیار کر سکتا ہوں"۔ (ص ۳۰۵)

اس ترجمہ یا مطلب یا مفہوم میں آپ نے کئی باتوں میں دھوکہ دہی کی کوشش فرمائی ہے ، مثلاً

(۱) ۔ قرآن کے الفاظ ہیں قَالَ عِفْرِیْتٌ مِنَ الْجِنِّ ۔ یعنی ایک دیو ہیکل جن نے کہا ۔ لیکن آپ اس کا ترجمہ ایک عام ٹھیکیدار بتلا رہے ہیں ۔ کیا اسی کا نام قرآن فہمی اور اس کو ماننا ہے ؟

(۲) ۔ اس دیو ہیکل جن نے یوں کہا کہ " اَنَا آتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَقَامِکَ یعنی میں اس تخت کو اس سے پہلے لا سکتا ہوں کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوں" ۔ اور یہ وقت زیادہ سے زیادہ دربار برخاست ہونے تک یا پانچ چار گھنٹے ہی ہو سکتا ہے ۔ اتنے وقت میں آپ کو نیا تخت بننا ناممکن نظر آیا ۔ تو آپ نے اس کا ترجمہ یوں کر دیا کہ جب آپ اس (بلقیس) کے آنے پر استقبال کے کھڑے ہوں ۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ استقبال اور اس کی درمیانی مدت کہاں سے آگئی ؟ بہرحال کھڑے ہونے کی بات تو آپ نے پوری کر ہی دی ہے ۔

(۳) دوسرے نے کہا ۔ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِنَ الْکِتَابِ کا ترجمہ ہے ۔ " قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ۔ یعنی تیری نگاہ تیری طرف پلٹنے یا پلک جھپکنے سے پیشتر ملکہ کا تخت لا سکتا ہوں" ۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ " میں اس سے بھی جلدی (یعنی آپ کے ملکہ کے استقبال سے بھی پہلے) تیار کر سکتا ہوں ۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یرتد الیک طرفک کے معنی " اس سے بھی جلدی " ہیں ۔ اور کیا آتیک کے معنی " تیرے پاس لانا " ہے یا " تیار کرنا " ہے ۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حافظ صاحب اس الفاظ کے لغوی معنیٰ نہ سمجھتے ہوں ۔ باقی دوسری ہی صورت رہ جاتی ہے ۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے ۔

(۴) ۔ " مستقرا عندہٗ " ۔ دوسرے شخص کا کلام ہے جسے کتاب کا علم دیا گیا تھا مگر اس کا ترجمہ آپ نے " بچھا سجا کر " کر کے پہلے ٹھیکیدار کے جواب میں فٹ کر دیا ہے جو لغوی لحاظ سے بھی غلط ہے ۔

اب آگے چلئے ۔ قرآن کے الفاظ ہیں کہ جب تخت سلیمانؑ کے پاس پہنچا دیا گیا تو آپ نے کہا کہ اس کی شکل و ہیئت میں کچھ تبدیلی کر کے اسے عجیب سا بنا دو ۔ لیکن اثری صاحب اس کا ترجمہ فرماتے ہیں ۔ (جب سلیمانؑ ٹھیکیداروں کو تخت بنانے کے متعلق ہدایات دے رہے تھے)

" جلدی کے خیال سے کہیں تخت خراب نہ ہو جائے ہمیں تو ایسا عمدہ تخت مطلوب ہے ۔ جسے دیکھ کر وہ (ملکہ سبا) ایسی خوش ہو کہ اس کے مقابلہ میں اپنے تخت کو ناپسند کرے اور وہ اس کی نگاہوں سے گر جائے " ۔ (ص ۳۰۶)

واضح رہے کہ (۱) آپ اس سے پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ نیا تخت ملکہ کے تخت جیسا ، اس کی مثل اور اسکے

مشابہ ہونا چاہیئے اور اب فرما رہے ہیں کہ وُہ ایسا اعلیٰ ہونا چاہیئے کہ ملکہ اپنے تخت کو ناپسند کرنے لگے۔ شاید آپ کو پہلی بات یاد نہیں رہی۔

(۲)۔ نکّروا کا ترجمہ آپ نے اَنکرُوا سے فرما دیا ہے۔ نکّرَ بمعنی تبدیل کرنا اور معرفہ سے اسم نکرہ بنانا (منجد) اور اَنکرَ بمعنی عیب دار ہونا، کرنا، ناپسندیدہ بنانا وغیرہ (منجد) ہے۔ اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قبلہ حافظ صاحب اَنکرَ اور نکّرَ کا فرق نہ سمجھتے ہوں۔ پھر امام بخاری نے بھی نکّروا کا معنی غیّروا کیا ہے (ب ص۳۲۲) یعنی اس کو تبدیل کر دو، تو آپ کو بھی تسلیم کر لینا چاہیئے تھا۔

آگے ارشاد باری ہے:۔

قِیۡلَ لَهَا ادۡخُلِی الصَّرۡحَ فَلَمَّا رَاَتۡهُ حَسِبَتۡهُ لُجَّةً وَّ کَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَیۡهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ وَاَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَیۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۲۷/۴۴)

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ جب اس نے دیکھا تو اسے گہرا پانی سمجھا اور اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اُٹھایا سلیمانؑ نے کہا یہ تو شیشے کا جڑاؤ محل ہے۔ کہنے لگی۔ پروردگار! میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی اور اب مَیں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کرتی ہوں۔

شاہی محل اور لجّہ کی لغوی تحقیق:

اب اس آیت کا اثری مفہوم بھی ملاحظہ فرمایئے:

"پھر کبھی (ملکہ نے) اس کے شیش محل کو اُوپر نیچے دیکھ کر اندازہ لگایا، کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا برف کی طرح منجمد پانی کا مکان کی شکل میں ایک تودہ کھڑا ہے جو کہ اپنی جگہ پگھلا ہُوا پانی ہو تو بہت گہرا ہوگا اور پھر کبھی اس نے اس کی بنیادوں کی بابت دریافت کیا کہ اندر اور باہر دونوں طرف کیا لگا ہُوا ہے تو بتایا گیا کہ وہ سنگِ مرمر اور بلّور وغیرہ ہے جس پر نقش و نگار ہو رہے ہیں اور جس طرح ایسے نقش و نگار پر مکمل جالی ڈال دی جاتی ہے کہ اندھے اور خراب نہ ہوں۔ اسی طرح آپ نے بھی اس کے دونوں طرف حفاظت اور نفاست کے لیئے پردہ لٹکایا ہُوا تھا جسے رانی نے اُلٹا کر دیکھا تو آپ نے بتا دیا کہ یہ فلاں فلاں چیز کا بنا ہُوا ہے" (ص ۳۰۷)

اِس مطلب میں آپ نے کئی الفاظ کو اپنی تحقیق کا ہدف بنایا ہے مثلاً فرماتے ہیں:۔

لُجّۃ کے معنی اکثر کتب لغت میں گہرا پانی ہے۔ جس میں جہازرانی ہو سکے یا کم از کم کشتی چل سکے مگر یہ معنی آپ کو پسند نہیں لہٰذا کئی لغتوں کا چکر لگاتے ہوئے اس کا معنی چاندی۔ شیشہ۔ تلوار۔ پانی۔ برف وغیرہ سب کچھ بتلاتے ہیں کہ ان میں ایک طرح کا تشابہ ہے۔

اور آخری فیصلہ یہ ہے کہ لُجّۃ سے شیش محل مراد ہے جس میں ملکہ سبا کو ٹھہرایا گیا تھا" (ص ۳۱۴)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر لُجّۃ سے یہی مُراد ہے تو پھر صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ سے کیا مُراد ہے؟ انزی صاحب نے یہ فرق واضح نہیں فرمایا۔

لُجّۃ دراصل اسمائے نسبتی سے ہے۔ جس کی تصریح آپ نے خود بھی فرما دی ہے کہ جس میں جہاز رانی ہو سکے یا کم از کم کشتی چل سکے۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ کشتی چلنے کے لئے جتنے گہرے پانی کی ضرورت ہے۔ جہاز رانی کے لئے اس سے چار یا پانچ گنا زیادہ گہرے پانی کی ضرورت ہے مگر دونوں طرح پر لُجّۃ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک جگہ پانی پایاب مثلاً پانچ چھ انچ گہرا ہے۔ اور دُوسری جگہ ایک فٹ گہرا ہے تو ایک فٹ پانی پایاب پانی کے مقابلہ میں لجّۃ کہلائے گا۔ پھر اگر ایک دوسرے مقام پر پانی تین فٹ گہرا ہے تو اب ایک فٹ پانی لُجّۃ نہ رہے گا بلکہ ۳ فٹ لجۃ کہلائے گا۔ گویا لجۃ میں پانی کی گہرائی کا تعین موقع اور مقام کی مناسبت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ گویا سلیمانؑ کے محل میں لجّۃ کا نقشہ صرف اتنا ہی تھا کہ صاف فرش پر شیشے کا جڑاؤ یُوں کیا گیا تھا کہ روشنی سے وُہ گہرا پانی معلوم ہوتا تھا جس طرح لب ساحل پڑی ہوئی ریت پر ایک خاص زاویہ سے۔ اب صحن میں جتنا گہرا پانی ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر کوئی اپنی عقل سے لگا سکتا ہے۔

پنڈلیاں ملکہ کی یا محل کی؟

دوسرا لفظ جس پر آپ نے تحقیق فرمائی ہے وہ عَنۡ سَاقَیۡہَا ہے۔ ساق پنڈلی اور درخت کے تنا کو کہتے ہیں۔ اب آپ نے مختلف کتب لُغت کی ورق گردانی کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ساق سے محل کی چار دیواری کا نچلا حصّہ مراد ہے اور لجۃ سے مُراد ہے شیش محل۔ جس کے تقریباً تین تین فٹ تک اندر اور باہر دونوں طرف سنگ مرمر اور بلّور اور زمرّد و دیگر ہیروں قسم قیمتی پتھر لگا ہوا تھا۔ پھر اس کے اُوپر چھت تک لکڑی کا کام تھا جس میں شیشے جڑے ہُوئے تھے۔" (ص ۳۱۲)۔

یہ منظر کشی آپ ایسے فرما رہے ہیں گویا وہ محل آپ نے بچشم خود ملاحظہ فرمایا تھا۔ نہیں معلوم کہ آپ نے زمرّد اور سنگ مرمر وغیرہ کن الفاظ کا معنیٰ فرمایا ہے رہا اصل معاملہ تو آپ فرماتے ہیں ساقیہا میں ضمیر کا مرجع ہے لُجّۃ اور لُجّۃ کے معنی ہیں شیش محل۔

اَب دیکھئے ساقیہا میں ساقی (ساقین) تثنیہ کا کلمہ ہے اور ھا ضمیر مؤنث تو اس کا معنیٰ ہُوا کسی مؤنث چیز کی دو پنڈلیاں"۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) محل کی دیواریں چار ہیں۔ اگر اندرونی اور بیرونی پردے سے دونوں طرفین بھی مُراد لئے جائیں تو یہ آٹھ

پردے بنتے ہیں جو تشبیہ نہیں جمع ہے اور اگر ایک ہی دیوار کے کسی حصے کے اندرونی اور بیرونی پردے مراد ہوں تو دونوں کو بیک وقت اٹھایا نہیں جا سکتا۔

(۳)۔ ھا کی ضمیر مؤنث کے لیے ہے۔ اب دیکھئے قرآن میں ہے فلما راتہُ حَسِبَتۃُ لُجَّۃً وَّ کَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْھَا۔ جس چیز کو ملکہ نے دیکھا خواہ وہ صرح ممرد من قواریر بمعنی شیش محل تھا یا وہ لجۃ بمعنی شیش محل تھا اس کے لیئے مذکر کا صیغہ استعمال ہُوا ہے لیکن ساقیھا میں مؤنث کی ضمیر مستعمل ہوئی ہے۔ فلہذا ساقیھا سے مُراد صرف اور صرف اس کی (ملکہ سبا کی) اپنی پنڈلیاں ہی ہو سکتی ہیں۔

اب دیکھئے۔ اس واقعہ کے بعد ملکہ سبا فوراً یہ کہنے لگتی ہے۔ رب انی ظلمت نفسی۔ یہ واقعہ دراصل ملکہ سبا کا ایک عقلی امتحان تھا جس میں وہ ناکام رہی۔ لُجّۃً اور صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ من قواریر میں دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ صحن میں ایک شیشے کا حوض بنایا گیا تھا جس میں مچھلیاں تیرتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ اس کے اوپر شیشے کا تختہ ایسا جڑا ہوا تھا کہ جوڑ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صحن کے کچھ حصہ میں شیشہ ہی ایسا لگا ہُوا تھا کہ جس پر روشنی پڑنے سے وہ لہریں مارتا پانی معلوم ہوتا تھا جیسا کہ سراب کی صورت میں ہوتا ہے۔ ملکہ کو جب محل میں داخل ہونے کو کہا گیا تو اس نے فی الواقع اسے پانی ہی سمجھا اور اپنے پائینچے اوپر چڑھا لیئے۔ وہ دھوکا کھا گئی تو اسے اس بات پر مطلع کر دیا گیا۔ یہ نظیر اسے پیش کی گئی جس سے اس کو معلوم ہو گیا کہ مذہب کے معاملہ میں بھی دھوکا کھا گئی ہے۔ لہٰذا اس واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے وہ بول اُٹھی رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمَانَ۔ الآیۃ

اثری صاحب فرماتے ہیں کہ بعض مفسرین نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ وہ آپ کی پنڈلیاں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور آپ نے اس الزام کو دُور کرنے کے لیئے یہ تاویل فرمائی ہے۔ آپ کا جذبہ تو اچھا ہے لیکن اس الزام کو دُور کرنے کے لیئے آپ نے جو نئی تاویل پیش فرمائی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قرآن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی۔

قرآن کے چند مشکل ترین مقامات میں سے ایک مقام درج ذیل ہے:

سلیمانی دُور میں جمہوریت کے دھندے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔ فَسَخَّرْنَا لَہُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ وَ

اور ہم نے سلیمانؑ کو آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد ڈال آیا پھر سلیمانؑ نے رجوع کیا سلیمانؑ نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے بخش اور ایسی بادشاہی عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایان نہ ہو۔ بیشک تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ وَ اٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ.
(۳۸ / ۳۶ - ۳۹)

پھر ہم نے ہوا کو اس کے تابع فرمان کر دیا۔ جہاں وہ پہنچنا چاہتے ان کے حکم سے نرم نرم چلنے اور دیوؤں کو بھی ان کے زیر فرمان کر دیا جو عمارتیں بنانیوالے اور غوطہ زن تھے اور کچھ دوسرں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے (ہم نے کہا) یہ ہماری بخشش ہے۔ پھر چاہو تو احسان کرو۔ چاہو تو روک لو۔ کوئی حساب نہیں۔

ان آیات میں اصل مشکل مقام تو پہلی آیت ہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو کونسی آزمائش میں ڈالا گیا۔ اور تخت پر کون سا جسد ڈالا گیا تھا۔

ان دونوں باتوں کی قرآن و حدیث میں کوئی تصریح نہیں۔ تاہم اگلی آیات سے درج ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) وہ آزمائش کچھ ایسی تھی جس کا تعلق کرسی پر القائے جسد سے تھا۔
(۲) یہ آزمائش پڑی تو آپ فوراً اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور مغفرت طلب کی۔
(۳) اور مغفرت طلب کرنے کے ساتھ ہی بے مثال بادشاہی کی دعا کی۔
(۴) اس بےمثال بادشاہی کی غرض سے ہی ہواؤں اور جنوں اور دوسرے چرندوں پرندوں کو آپ کے تابع کیا گیا اور پرندوں کی بولی بھی آپ کو سکھلائی گئی۔

گویا یہ سب نعمتیں اس آزمائش سے بچ نکلنے اور انابت الی اللہ کے عوض آپ کو عطا ہوئی تھیں۔

اب مفسرین نے اس آزمائش کے متعلق طرح طرح کے قصے بیان کئے مثلاً حضرت سلیمان کے پاس ایک انگشتری تھی جس کے ذریعے جنوں کو قابو میں رکھتے اور حکومت کا کاروبار کرتے تھے .... (تا آخر)۔ یہ قصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے اور اس لحاظ سے غلط ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق اس واقعہ آزمائش کے بہت عرصہ بعد جن آپ کے لیے مسخر کیے گئے۔

بعض مفسرین اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں حضرت سلیمانؑ سے متعلق ایک مرفوع حدیث جو بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہے لائے ہیں۔ جس میں یہ وضاحت ہے کہ سلیمانؑ نے ایک دفعہ کہا کہ میں آج رات میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا ... (تا آخر) لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت سے منسلک نہیں ہے نہ ہی احادیث میں کوئی ایسا اشارہ ملتا ہے بلکہ یہ واقعہ مستقل بالذات ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر بھی ناقابل اعتماد ہے۔

تیسرے فخر الدین رازی اپنی توجیہہ میں منفرد ہیں جو کہتے ہیں کہ آزمائش سے مراد حضرت سلیمانؑ کو بیماری

کا لاحق ہونا ہے۔ اس بیماری سے وہ اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ جیسے بے رُوح جسم یا جسد ہوتا ہے اور اس جسد کے کرسی پر القا سے مُراد ان کا اپنا اس لاغری کی حالت میں تخت پر بیٹھنا ہے۔ رازی کی اس توجیہہ کو عقل تسلیم نہیں کرتی اور نہ ہی قرآن کے الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے۔

اثری صاحب نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگرچہ سلیمانؑ نے اپنے عہد میں حکومت (کرسی) کو بہت کچھ مستحکم کر لیا ہُوا تھا۔ تاہم مخفی بغاوت اندر ہی اندر جاری رہی۔ ایک بے دین چالاک سیاسی لیڈر (یہ جسد کا ترجمہ ہے جس میں اسلامی رُوح نہیں ب صہ ۲۸۱)۔ اس کوشش میں تھا کہ ایک آزاد جمہوری حکومت قائم ہو جس سے اسلامیات خارج ہوں۔ یہ شخص قانون شکنی کی صورت میں نہیں بلکہ حق طلبی کی صُورت میں خناس بن کر اپنا مقصد بیان کرتا تھا۔ اس لیئے کئی ایک اس کے ہم خیال ہو گئے اور جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کی ٹھان لی۔ اب سلیمانؑ شش و پنج میں پڑ گئے (یہ فتنا کا ترجمہ ہے) کہ خدایا اَب میں کیا کروں (ثمّ اَناب کا ترجمہ ہے) گرفتاری شروع کر دوں تو رعایا میں ہیجان پیدا ہو گا اور خاموش رہوں تو تحریک پھیل کر ملک تباہ ہو گا۔ اب کروں تو کیا کروں۔ تب اللہ پاک نے فرمایا۔ آپ طیاروں کا سلسلہ اور بڑھا کر ہوائی طاقت پہلے کی نسبت زیادہ مستحکم کریں (یہ فسخّرنا لہ الرّیح کا ترجمہ ہے) اور جیل خانوں اور پولیس چوکیوں میں بھی اضافہ کریں تا ایسے لوگ فوراً گرفتار ہو کر سزا پائیں (غالباً یہ وَآخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الاصفاد کا ترجمہ ہے) پھر جو تائب ہو انہیں احساناً چھوڑ بھی دیں ورنہ دائم الحبس میں پڑا رہنے دیں۔ نیز جو خیر خواہ ہوں ان پر طرح طرح کے انعامات کریں تاکہ محروم بھی اس طرف متوجہ ہو کر خیر خواہی پر آمادہ ہوں"

(یہ غالباً فامنن او امسک بغیر حساب کا ترجمہ) ہے۔ (ب صہ ۲۸۱)

مزید تشریح کے لئے آپ نے فتنّاہ۔ کرسیّ۔ جسدٌ اور غفرٌ کے الفاظ انتخاب فرمائے ہیں پہلے تین الفاظ کا حوالہ تو اقتباس میں ہی درج کر چکے ہیں۔ غفر کے معنی آپ بتلاتے ہیں "ایسے شیطانوں کی شرارتوں سے حفاظت کی جناب الٰہی میں استدعا ہے۔" (ب صہ ۲۸۱)

اب دیکھئے کہ اثری صاحب نے جو تفسیر فرمائی ہے تو یہ لغوی لحاظ سے بھی غلط ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی۔

اثری لُغت: آپ نے جن چار الفاظ پر لغوی تحقیق فرمائی ہے۔ ان میں سے تین غلط ہیں۔ البتہ کرسی بمعنی حکومت مستعمل ہے۔ باقی تین الفاظ درج ذیل ہیں۔

۱۔ غفر۔ کا معنی چھپانا، ذنب کے ساتھ گناہ کو چھپانے یا معاف کرنے کے معنی دیتا ہے۔ لیکن جو معنی اثری صاحب نے بتلائے ہیں یعنی "شیطانوں کی شرارتوں سے حفاظت کی جناب الٰہی

استدعا"۔ یہ تو استعاذہ کے معنی ہیں۔ یہ تجاہل عارفانہ اثری صاحب نے دانستہ طور پر کیا ہے۔

(۲)۔ جسد: کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ بدن سے جب رُوح نکل جائے تو باقی جسد ہے یعنی ہر ایسا بدن جس میں خون خشک ہو چکا ہو۔ اب اثری صاحب اس کا معنیٰ یہ بتائیں کہ "دنیا دار سیاسی لیڈر جس میں اسلامی رُوح نہیں"۔ تو یہ ان کا اپنا اجتہاد ہے جس کی زبان پابند نہیں۔ زبان تو اہلِ زبان کی بول چال کے تابع ہوتی ہے نہ کہ اثری اجتہاد کے۔ جسد کے لغوی معنوں میں وجہ مشابہت رُوح نکلنے کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس طرح سارے کافر ہی اجساد ہُوئے۔ اکیلا سیاسی لیڈر ہی اس کی زد میں کیوں آئے؟

(۳)۔ فَتَنَّا: کے معنی بتلاتے ہیں "ہم نے اسے کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔ پھر ہم نے اسے خود ہی تدبیر بھی بتا دی کہ ایسا کر دو تاکہ مخفی بغاوتوں کا پورا پورا انسداد ہو سکے"۔ یہ ساری عبارت فتنّا کا معنیٰ ہے

تاریخی لحاظ سے: یہ تفسیر اس لئے غلط ہے کہ سلیمانؑ کا عہد ایک ہزار قبل مسیح ہے۔ اس وقت دنیا جمہوریت کے نام تک سے واقف نہ تھی۔ جمہوریت ابتداءً یونان کی بعض ریاستوں میں ۵۰۰ ق م رائج ہوئی لیکن اپنے گوناگوں مفاسد کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ چنانچہ ارسطو نے بھی اس نظام سیاست کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ بعد ازاں یہ نظام سیاست دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک اس خطۂ زمین سے معدوم رہا۔ پھر اٹھارویں صدی کے اواخر میں انقلاب فرانس کے بعد اس کا دوبارہ احیاء ہُوا۔ اسی جمہوریت فرانس کی ایک شق "حریت رائے و خیال" بھی ہے۔ جس کے تحت عوام کو پُرامن طور پر جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کا حق دیا گیا ہے۔ اب اثری صاحب کا کمال یہ ہے کہ ایک ہزار قبل مسیح میں ایک دُنیادار سیاسی لیڈر سے ایک آزاد جمہوری ریاست قائم کروا رہے ہیں اور اس کے پیروکار جلسے جلوس نکالتے اور ہڑتالیں بھی کرتے ہیں۔

۸۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد کے انتخابات:

حضرت سلیمانؑ کی وفات قرآن کریم میں اس طرح مذکور ہے:۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۳۴/۱۴)	پھر جب ہم نے ان کے لئے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔ جب عصا گر پڑا تب جنوں کو معلوم ہوا (اور کہنے لگے) کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو ذلت کی تکلیف میں نہ رہتے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) جس وقت سلیمانؑ پر موت وارد ہوئی اس وقت آپ اپنی لاٹھی سے ٹیک لگائے کھڑے یا بیٹھے ہوئے تھے۔

(۲)۔ آپ کی وفات کا لوگوں کو (اور بالخصوص ان جنوں کو جو تعمیر بیت المقدس کے کام پر لگے ہوئے تھے) اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک کہ عصا کو دیمک نے چاٹ کر کھا نہ لیا۔ یہ سہارا ختم ہوا تو آپ گر پڑے۔

(۳)۔ جن خود بھی غیب دانی کا دعویٰ کرتے تھے اور لوگ بھی انہیں غیب دان سمجھتے تھے۔ اس واقعہ نے یہ ثابت کر دیا۔ کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ کیونکہ ان کی وفات کے بعد بھی جن کام میں لگے رہے۔ اودھر تعمیر بیت المقدس کا کام پورا ہُوا۔ ادھر سلیمانؑ کی لاش گر پڑی۔

(۴)۔ قرآن نے اس آیت میں جس بات کو زیادہ اہمیت دی ہے وُہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کا واقعہ نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ جن غیب نہیں جانتے۔ ورنہ وہ وفات کے بعد بھی یہ مشقت کیوں برداشت کرتے رہتے۔

اب اثری صاحب کو اس بات پر یہ اعتراض ہے کہ اگر اس آیت کا ترجمہ صاف سیدھا کیا جائے تو کئی باتیں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً اگر سلیمانؑ اپنی وفات کے دو چار ماہ بعد لاٹھی کے سہارے کھڑے یا بیٹھے رہے۔ تو کسی جن یا اپنے بیگانے کو یہ خیال نہ آیا۔ اب حضرت سلیمانؑ روز مرّہ کے معمولات بجا نہیں لاتے۔ نماز نہیں پڑھتے روٹی نہیں کھاتے۔ بولتے نہیں۔ کاریگروں کو نہ ہدایت دیتے ہیں نہ اُجرت وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ شاید مر چکے ہوں۔ اور اگر بات سمجھے تو اس طرح کہ ایک مدت بعد لاٹھی ٹوٹی اور لاش گر پڑی تو تب معلوم ہُوا۔

گویا جس بات کو اللہ نے مجمل طور پر ذکر کیا۔ اثری صاحب اسی کی تفصیل کے پیچھے پڑے ہیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ وضاحت سے بتلانا چاہتے ہیں۔ اس کا اثری صاحب نام نہیں لینا چاہتے۔

بہر حال یہی ذہنی خلفشار تھی جس کی وجہ سے اثری صاحب نے سوچا کہ اس آیت کو نئے معانی کا جامہ پہنانا ضروری ہے چنانچہ آپ نے اس کا مطلب یہ بتلایا کہ:۔

"جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو کچھ دنوں تک ملک کا انتظام والضرام ان کے طریقہ پر بدستور چلتا رہا۔ پھر جب نیا قانون بنا کر نافذ کیا گیا اور جدید انتظامات شروع ہو گئے تو ملک چونک پڑا۔ کہ یہ کیا ہُوا۔ اگرچہ سابق بادشاہ کبھی کا فوت ہو چکا مگر ہمارے لئے تو گویا وُہ آج ہی فوت ہُوا کہ ہم موجُودہ حکومت کے ظالمانہ رویہ سے مصیبت میں پڑ گئے۔ اگر ہمیں انتخاب کے وقت معلوم ہوتا تو اس کے لئے بھاگ دوڑ کر ووٹ پیدا نہ کرتے۔ بلکہ تمام محکموں اور کارخانوں میں ہڑتال اور جلسوں جلوسوں اور قرار دادوں کے ذریعے

اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے کہ ہمیں ایسی حکومت منظور نہیں مگر اب اپنے کئے پر رونے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے " یہ غالباً مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ کا ترجمہ ہے ۔جس میں جن مبتلا تھے ۔(اب ص۲۹)

اس اقتباس میں آپ نے :۔

(۱)۔ موجودہ دور کی جمہوری حکومت کے جو ہتھکنڈے اور انتخابی سرگرمیاں پیش کی ہیں یہی اس تفسیر کے غلط ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۔

(۲)۔ اثری صاحب کا معمول ہے کہ اپنا ٹھیک مطلب پیش کرنے کے بعد کچھ الفاظ حل لغات کے طور پر بھی دیتے ہیں مگر اس مقام پر انہوں نے حل لغات کے بجائے اپنی عربی تفسیر سے قارئین کو مشرف فرمایا ہے ۔اس میں "مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ"۔ قرآن کے ان لفظوں کا معنی لکھتے ہیں ۔

"الحکومۃ الظالمۃ" اور تبینت الجن ان لو کانوا یعلمون الغیب کے معنی ہیں ۔الجور والطریق الذی ظهر الآن (وہ ظلم اور طریق جو اب ظاہر ہوا) اب دیکھئے اس معنی میں جن کا یا غیب کا ذکر آیا ہے ۔پھر مالبثوا فی العذاب المهین کے معنی لکھتے ہیں ماسعوا فی اقامتها سعیًا ولا عملوا بها فی حاکمها اعمالاً ۔(یعنی وہ اس نظام کے بپا کرنے کے لئے بھاگ دوڑ نہ کرتے)۔ گویا لبثوا کا معنی ہوا سعوا اور عذاب المهین کا معنی ہوا سعیاً ۔

جنوں کی غیب دانی : اب دیکھئے اس واقعہ میں جس خاص بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس واقعہ موت سے جنوں کو خود بھی اور دوسرے لوگوں پر بھی یہ بات واضح ہو گئی کہ جنوں کا دعویٰ غیب دانی باطل ہے ۔لیکن اثری صاحب جنوں یا ان کی غیب دانی کی بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے ۔اور جمہوری انتخابات میں ووٹروں کی ناعاقبت اندیشی اور کم عقلی کے پیچھے پڑ گئے ہیں خدا جانے یہ ناعاقبت اندیش اور کم عقل ووٹر اثری صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق جن ہوں ۔اثری صاحب کے پیشوا سرسید تو جنوں سے دیہاتی لوگ مراد لیتے ہیں ۔بالخصوص وہ دیہاتی جو قدوقامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے مضبوط ہوں ۔ایسے ہی دیہاتی لوگوں سے سلیمان علیہ السلام اپنے کام کرواتے تھے جنہیں اللہ نے قرآن میں جن کہا ہے ۔مگر اثری صاحب کی اس تاویل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقل کے

بدھو اور ناعاقبت اندیش لوگ ہی دراصل جنّ ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ اثری صاحب نے یہ معمّہ تو بہرحال حل کر ہی دیا ہے کہ جس لاٹھی کے ساتھ سلیمان علیہ السّلام ٹیک لگائے ہوئے تھے موت کے بعد اس لاٹھی کو کیا ہوا کہ سلیمانؑ گر پڑے۔

باب ۱۱

۱۰۔ حضرت ایوب علیہ السلام

قصۂ ایوبؑ پر اثری اعتراضات: حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر دو مقام پر قرآن کریم میں مذکور ہے۔ بخاری کی حدیث میں ان پر سونے کی ٹڈیوں کی بارش کا ذکر ہے۔ باقی تفاصیل کتب تفاسیر میں موجود ہیں۔ ان سب اجزاء سے مل کر حضرت ایوبؑ سے متعلق یہ واقعہ جسطرح مشہور ہے۔ اس پر اثری صاحب کو دو قسم کے اعتراض ہیں:۔

(۱)۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ کسی نبی کو ایسی بیماری ہرگز لاحق نہیں ہوسکتی۔ جو اس کی تبلیغ میں حارج ہو۔ (ص ۳۳۲)

(۲)۔ اور دُوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ نے جو کسی معمولی سی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوکر یہ قسم اٹھائی تھی کہ میں تندرست ہوکر تجھے سو کوڑے ماروں گا۔ یہ واقعہ غلط اور جھوٹا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "کیا عورت کی خدمت کا یہی صلہ ہے"۔ (ص ۳۳۲)

ایسے اعتراضات کی ضرورت آپ کو اس لیئے پیش آئی کہ اس قصہ میں چند ایک خرق عادت امور یا معجزات کا ذکر ہے مثلاً:۔

۱۔ حضرت ایوبؑ کا زمین پر پاؤں سے ٹھوکر مارنا اور اس سے ایسا چشمہ جاری ہونا' جس میں نہانے سے آپ شفایاب ہوگئے۔ علاوہ ازیں اس چشمہ کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پینے کے لئے بہت خوشگوار تھا۔

۲۔ بخاری میں مذکور ہے کہ جب آپ اس چشمہ میں نہا رہے تھے تو اللہ نے آپ پر سونے کی ٹڈیوں کی بارش نازل فرمائی۔

یہ دونوں باتیں قصۂ ایوبؑ کی جان اور ان کے بے نظیر صبر کا ثمر ہیں اور یہی دو باتیں عقل پرستوں اور ایسے ہی اثری صاحب کے لیئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ لہٰذا اثری صاحب کو یہ دونوں امور حذف کرنے کے لیئے قصۂ ایوبؑ کو از سر نو خود بنا کر پیش کرنا پڑا۔

قصۂ ایوبؑ کی نئی ترتیب: آپ کے اس مخترعہ قصہ کے اہم نکات درج ذیل ہیں:۔

(۱)۔ "حضرت ایوبؑ یہاں کے شیطانوں اور مشرکوں اور کافروں سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے" (ص ۳۳۳)

یہ نکتہ غالباً درج ذیل آیت کے ترجمہ کے قائمقام ہے:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (۴۱/۳۸)	اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔ جب اس نے اپنے ربّ کو پکارا کہ الہٰی! شیطان نے مجھ کو ایذا اور تکلیف دے رکھی ہے۔

مگر یہاں اس آیت میں صرف لفظ شیطان (واحد) استعمال ہُوا ہے۔ آپ نے اسے پہلے "شیطانوں" بنایا اور پھر مشرکوں اور کافروں کو ساتھ ملا لیا ہے۔ اب آگے بحث مشرکوں اور کافروں سے ہی چلے گی۔ "شیطانوں" کا بھی قصہ یہیں ختم ہُوا۔

(۲)۔ حضرت ایوبؑ نے کافی تبلیغ اور جان توڑ کوشش کے بعد اللہ سے استدعا کی کہ اشرار کا انکار بلکہ اضرار آخر حد تک پہنچ چکا ہے۔ اب میرے لیئے کیا حکم ہے؟

یہ غالباً رَبِّ اِنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ (۸۳/۲۱) اے میرے پروردگار مجھے بیماری لگ گئی ہے۔ کا مفہوم آپ نے بیان فرمایا ہے ضُرّ کا استعمال بالعموم جسمانی تکلیف پہ ہوتا ہے اور انہی مندرجہ دونوں آیات سے حضرت ایوبؑ کی بیماری ثابت ہوتی ہے اور احادیث میں اس بیماری کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ اثری صاحب نے خود بھی مختلف روایات کا تذکرہ کر کے ۱۲ سال والی روایت کو ترجیح دی ہے (ص ۴۴۲) مگر اس مقام پہ اس سے مراد محض کفار کی ایذارسانی سے رہے ہیں جو کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہوتا۔

(۳)۔ "اللہ پاک" نے فرمایا۔ حکم یہی ہے کہ آپ یہاں سے سوار ہو کر جہاں میں بتاتا ہوں چل پڑیں"۔ (ص ۴۴۳)

یہ غالباً اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ کا ترجمہ ہے۔ پھر ایک دُوسرے مقام پہ اس کی مزید تشریح فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں "فرق صرف اتنا ہے کہ مفسّرین نے زمین کو مفعول بنایا اور اس پر ایڑی مار کر چشمہ نکالا۔ اور مَیں نے گھوڑے وغیرہ کو مفعول قرار دیا اور اسے ایڑی مار کر دوڑایا ہے" (ص ۴۳۸)

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ کے مختلف مطالب: پہلے آپ نے اس کا مطلب بتلایا تھا سوار ہو کر چل پڑنا اور دُوسرا مطلب ہُوا گھوڑی کو ایڑ لگا کر دوڑانا لیکن ابھی انہی دو الفاظ کے اور بھی بہت سے مطالب بیان کرنا باقی ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:-

تیسرا مطلب ہے پاؤں کو حرکت دینا۔ لکھتے ہیں:-

"اللہ پاک نے الہام فرمایا ہو گا کہ کسی خاص چشمہ میں پہاڑی بوٹیوں کے اثرات اور معدنی اجزا بہہ کر آرہے ہیں۔ آپ اس میں داخل ہو کر پہلے پاؤں کو حرکت دیں: تاکہ اس میں ان کے ذرّات گھل کر پھیل جائیں پھر اس میں آپ غوطہ لگا کر خوب غسل کریں اور اس کا پانی پی کر سیراب ہوں۔ اس طرح پر متواتر عمل سے

صحت ہوگی۔ انشاءاللہ" (ص ۳۳۵)

اس لحاظ سے تو وُہ چشمہ عام انسانوں کی جلدی امراض کا علاج تھا اور ایسی جگہیں بالعموم لوگوں میں پہلے ہی مشہور ہوتی ہیں۔ پھر اس تاویل میں حضرت ایوب کی تخصیص اور خدا کی طرف سے الہام کی ضرورت ہی کہاں رہ جاتی ہے؛ ایسا علاج تو عام لوگ بھی ایک دُوسرے کو بتلا دیتے ہیں۔

چوتھا مطلب اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ کا یہ ہے کہ "پانی کی اشد ضرورت کے تحت اللہ پاک کی طرف سے آپ کو الہام ہوا ہوگا کہ اس جگہ نہایت عمدہ چشمہ مدفون ہے آپ ایڑی مار کر اپنے خادموں کو نشان لگا دیں تاکہ کھودا جا سکے۔" (ص ۳۳۷)

کیا اثری صاحب بتلا سکتے ہیں کہ اس مطلب میں خادموں کو نشان لگانے اور کھودنے کی ہدایات قرآن کے کون سے الفاظ کے معنی ہیں؟

پانچواں مطلب اس جملہ کا یہ ہے کہ "شیطان کے اضرار پر غم و غصہ کی روک تھام کے لئے استعاذہ پڑھ کر ایسے لوگوں کے سروں پر جوتا ماریں اور ٹھنڈا پانی پی کر غسل کریں تاکہ غصہ دُور ہو سکے۔" (ص ۳۳۶)

فوری غصہ کا علاج پانی پینا تو رسُولِ اکرمؐ نے بتلایا ہے مگر نہانا کسی نے نہیں بتلایا۔ پھر ایسا غم و غصہ جو طویل دور پر منحصر ہو اور کفار کے اضرار کے نتیجہ میں ہو۔ اس کا علاج پانی پینا اور نہانا اثری صاحب جیسے حکیم ہی تجویز فرما سکتے ہیں۔

اَب دیکھئے اثری صاحب نے اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ کے کتنے مفعول ڈھونڈ نکالے ہیں پہلے تو صرف گھوڑا مفعول بتلایا تھا۔ اب اس کا مفعول گھوڑا وغیرہ بھی ہے اور جڑی بُوٹیوں کے پانی میں بیٹھے ہوئے ذرات بھی اور لوگوں کے سر بھی ہیں۔ لیکن جس بات کی طرف قرآن نے واضح اشارہ کر دیا ہے۔ وہ انہیں اسلیے نظر نہیں آتا کہ یہ خرقِ عادت بات بن جاتی ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (۳۸/۴۲) | زمین پر ایڑی مارو۔ یہ نہانے اور پینے کو ٹھنڈا پانی ہے۔

اس آیت میں ھٰذا کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ اس اُرْکُضْ کا مفعول زمین ہے اور یہ وہی زمین ہے جہاں آپ کھڑے یا بیٹھے تھے اور آپ پر یہ وحی ہوئی۔

(۴)۔ جب اثری صاحب نے حضرت ایوب کو سوار کرا دیا تو آگے لکھتے ہیں:۔

"چنانچہ آپ (ایوبؑ) ضروری ہدایات دے کر چل پڑے جب اکثر حصہ سفر طے ہو چکا تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اب وہ جگہ قریب ہے جہاں پہنچ کر آپ کی ساری کلفت دُور ہو جائے گی" (ص ۳۳۳)

یہ غالباً فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ (۲۱/۸۴) کا ترجمہ ہے جس کا عام ترجمہ یُوں ہے تو ہم نے ایوب

کی دُعا کو قبول کر کے اس کی تکلیف دُور کر دی۔

(۵) "یہ کہ یہاں کی آب و ہوا نہایت بہتر اور خوشگوار.... خوراک نہایت اعلیٰ اور نہانے دھونے اور پینے کیلئے چشموں کا پانی موسم کے مطابق سرد و گرم بر وقت موجود ہے" (ص ۳۳۶)

گویا اثری صاحب حضرت ایوبؑ کو سوار کر کے ایڑی چلاتے چلاتے ایسے صحت افزا مقام پر لے آئے ہیں جہاں کے عام لوگ پہلے ہی ان نعمتوں سے مستفید ہو رہے تھے۔ یہی مقام ہے خدا کا ٹھیک مطلب۔ اور یہی ہے حضرت ایوبؑ کی ارحم الراحمین (۳۸/۴۲) کی بارگاہ میں دُعا کا ماحصل۔ اب سوال یہ ہے کہ صحت افزا مقام کی ضرورت کسی کفار کے ستائے ہوئے کو ہوتی ہے یا کسی بیمار کو؟

(۶)۔ "پھر کچھ عرصہ تک قیام کے بعد جب آپ کا استحکام ہو گیا تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اب اپنے اہل و عیال کو یہاں بلا لو اور جماعت کے دیگر لوگ بھی جو اسلام کے حامی ہیں۔" (ص ۳۳۴)

یہ غالباً وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ (۳۸/۴۳)(اور ہم نے ایوبؑ کو اس کے اہل و عیال اور اُن کے ساتھ ان کے برابر اور بھی بخشے) کا ترجمہ اپنی زبان میں بیان فرمایا۔ وَهَبَ کا معنی بُلانا کرنا اثری صاحب کو ہی زیب دیتا ہے۔ پھر اگر وہی پہلے اہل و عیال بلائے گئے تھے۔ تو "ان کے ساتھ اتنے اور" جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ کہاں سے آ گئے؟

(۷)۔ "پھر جب رفتہ رفتہ مسلمان بھی پہنچ گئے اور ادھر ادھر سے قبائل بھی آپ کے پاس حاضر ہو گئے تو آپ کو حکم ہُوا کہ ان پراگندہ لوگوں کو اپنے ہاتھ پر بیعت لے کر اپنی نگرانی میں جہاد کے لئے جمع کریں کہ وُہ کفار پر بیک وقت حملہ کریں اور لوٹ پڑیں۔" (ص ۳۳۴)

اس اقتباس کا آخری جملہ جو نشان زدہ ہے وُہ :-

خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ (۳۸/۴۴) اور اپنے ہاتھ میں جھاڑو لو اور اس سے مارو۔

کا اثری صاحب نے اپنی زبان میں ترجمہ فرمایا ہے اور اس سے پہلے جو خُدا کی طرف سے احکام بیان کئے گئے ہیں وُہ فقط اثری صاحب کی طرف سے تمہید ہے۔

پھر آگے چل کر مطلب ۵ کے تحت لکھتے ہیں کہ "اگر ضغث کا معنیٰ جھاڑو ہی کرنا ہے تو معابد الٰہی کو جھاڑو مار کر اور پھیر کر صاف کیا کرو (یعنی گھروں میں بھی نہ مارا کرو۔ مؤلف) بہر حال جھاڑو اپنی جگہ ہی ماری جائیگی۔ عورت کو جھاڑو مارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" (ص ۳۳۶) ..... ضغث۔ جھاڑو اور اس کے تنکوں کو کہا جاتا ہے مگر یہاں بطور تمثیل جماعت کے پراگندہ افراد مراد ہیں۔ جن کو اپنے ہاتھ پر بیعت لے کر اپنی زیر نگرانی جمع کرنا ہے۔" (ص ۳۳۸)

(۸) "لیکن یاد رکھو کہ زیادتی ہرگز نہ ہونے پائے وَلَا تَحْنَثْ (۳۸/۴۴) کہ یہ زیادتی سراسر گناہ ہے اور اگر کسی سے

عہد و پیمان ہے تو اسے بھی جائز طور پر پورا کرو کہ عہد شکنی بھی گناہ ہے"۔ (ص ۳۳۵) ..... پھر حنث کے تحت فرماتے ہیں: "حنث کا معنیٰ عام مفسرین نے قسم توڑنا بتلایا ہے اور میں نے عہد شکنی اور زیادتی سے رُکا ہے"۔

یہاں بھی حافظ صاحب جابکدستی دکھلا گئے ہیں۔ انہوں نے خود ہی فتح البیان کے حوالہ سے لکھا ہے: الحنث نقض العهد المؤكد باليمين" (ص ۳۳۹) یعنی حنث کا معنیٰ اس عہد کو توڑنا ہے جو قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ یعنی عام عہد کو توڑنا حنث نہیں کہلائے گا۔ پھر مزید یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عہد شکنی کرنا اور چیز ہے اور 'عہد شکنی یا زیادتی سے روکنا' اور چیز ہے۔

حضرت ایوبؑ کی بیوی: اب قرآن کی تاویلات تو ختم ہوئیں اب حدیث کی باری آتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"عام مفسرین نے فَاضْرِبْ بِهٖ میں ضرب کا مفعول عورت کو بتا کر اسے کوڑے لگوائے ہیں جس کا موقوفات اور مقطوعات میں بیان ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اور میں نے اس کا مفعول حربی کا فروں کو بتایا ہے" (ص: ۳۳۹) /

اب دیکھئے کہ مرفوع حدیث وُہ ہے جس کی سند رسول اللہؐ تک پہنچتی ہو

اور موقوف " " " کسی صحابی تک پہنچتی ہو

اور مقطوع " " " " تابعی تک پہنچتی ہو

گویا موقوفات اور مقطوعات بھی حدیث کی ہی اقسام ہیں۔ جسے آپ فرما رہے ہیں کہ قرآن و حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔

صحابی یا تابعی کے اقوال و افعال کو آثار (واحد اثر) کہا جاتا ہے اور قرآن کی تفسیر کا بیشتر حصہ انہیں اصحاب سے منقول ہے۔ اور اثری وُہ ہوتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کو تسلیم کرتا ہو۔ حافظ صاحب ماشاء اللہ اثری کہلاتے ہیں مگر اثر سے جس نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ اسی نفرت کے نتیجہ میں آپ اثر کو حدیث میں شمار ہی نہیں کر رہے ہے۔

پھر حضرات مفسرین نے جو حضرت ایوب کی بیوی کو کوڑے لگوائے۔ ان کے پاس آثار سے ہی سہی کوئی دلیل تو ہے۔ آپ کے پاس اس مقام پر ضرب کا مفعول حربی کافروں کو منوانے کے لئے کیا دلیل ہے؟ آگے چل کر آپ حضرت انسؓ سے طویل حدیث ذکر کرتے ہیں۔ جس میں معروف قصۂ ایوبؑ کا پورا ذکر موجود ہے لیکن آپ اس پر محدثانہ نگاہ ڈال کر اس کے مرفوع ہونے کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں:

"جب یہ ثابت ہو چکا کہ روایت مرفوع نہیں موقوف ہے تو پھر اس کا ترجمہ بھی جو کہ عام طور پر شائع و ذائع ہے قابلِ اصلاح ہے۔" (ص ۳۴۷)

اس اقتباس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں آثار کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں اپنے ترجمہ اور مطلب کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ہیں پھر بھی اثری کے اثری۔ چنانچہ اس کے بعد اس حدیث کا بھی ویسے ہی تیا پانچہ کیا ہے جیسے قرآنی آیات کا۔ اور وہی اپنا اختراعی قصہ دہرایا دیا ہے۔ جسے ہم نکتہ دار بیان کر آئے ہیں۔

سونے کی ٹڈیوں کی بارش: البتہ آپ کو بخاری کی ایک مرفوع حدیث قابلِ تسلیم نظر آتی ہے۔ ہم اس حدیث کا متن اور اس کا ترجمہ حافظ صاحب کے الفاظ میں نقل کر رہے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس قابلِ تسلیم حدیث کو آپ نے کہاں تک تسلیم کیا ہے۔

بَیْنَمَا اَیُّوبُ یَغْتَسِلُ عُرْیَانًا خَرَّ عَلَیْهِ رِجْلُ جَرَادٍ مِنْ ذَهَبٍ فَجَعَلَ فِی ثَوْبِهٖ فَنَادَاهُ رَبُّهٗ یَا اَیُّوبُ اَلَمْ اَکُنْ اَغْنَیْتُکَ عَمَّا تَرٰی قَالَ بَلٰی یَارَبِّ وَلٰکِنْ لَا غِنٰی عَنْ بَرَکَتِکَ۔

(بخاری۔ کتاب الانبیاء)

"ایوبؑ تنہائی میں عریاں غسل کر رہے تھے کہ اعلیٰ قسم کے سونے کے رنگ کی ٹڈی اڑتی ہوئی وہاں پر گرنے لگی تو آپ نے غسل سے فارغ ہو کر کپڑا پہنا اور اسے پکڑ کر اپنے کپڑے میں جمع کرنے لگے تو اللہ پاک نے فرمایا کہ ایوب میں نے تو تمہیں بکروں، مرغوں تک کا گوشت دیا ہوا ہے تو اسے پکڑ کر کیا کرے گا؟ عرض کی خدایا! تیرا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے مگر یہ بھی تیری بھیجی ہوئی اور حلال بنائی ہوئی نعمت ہے پھر میں اسے کیوں چھوڑ دوں۔" (ص ۳۵۰)

آپ اس حدیث کے متن کو بار بار پڑھیے اور دیکھیے کہ کسی لفظ کا وہ مفہوم بھی نکلتا ہے جن پر ہم نے نشان کر دیا ہے۔ اب اس حدیث کا اصل ترجمہ ہم نیچے درج کرتے ہیں:۔

"ایوبؑ ننگے نہا رہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں بہت گرنے لگیں تو آپ انہیں کپڑے میں جمع کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ایوبؑ کیا میں نے تمہیں غنی نہیں کر دیا ہوا۔ حضرت ایوبؑ کہنے لگے۔ یا اللہ کیوں نہیں مگر میں تیری برکت سے بے نیاز نہیں۔"

تاویلات کا دھندا: اثری صاحب نے سونے کی ٹڈیوں کے بجائے 'اعلیٰ قسم کے سونے کے رنگ کی' اور 'اڑتی ہوئی' کا اضافہ کر کے اس خرقِ عادت واقعہ کی حیثیت کو ختم کرنا چاہا ہے۔ اور اپنے افسانہ کی تائید میں مرغوں، بکروں کا گوشت اور حلال بنائی نعمت کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں

لیکن ابھی تاویل سازی سے آپ کی طبیعت مطمئن نہ تھی۔ لہٰذا چند اور تاویلات بھی "ضیافتِ طبع" کے لیئے پیش فرمادی ہیں مثلاً:

(۱) "ممکن ہے کہ کوئی چیل کہیں سے سونے کا زیور اٹھا لائی ہو اور اس کے پنجے سے وہاں گر پڑی اور ٹوٹ کر بکھر گئی ہو" یہ بات واقعی آپ کے حسب پسند ہے۔

(۲)۔ "محاورہ ہے کہ فلاں شخص کا دل سونے کا ہے۔ جس کا مطلب بہت عمدہ اور اعلیٰ ہے۔ اسی طرح سونے کی ٹڈیوں کا یہ مطلب ہے کہ وہ بہت اعلیٰ قسم کی ٹڈیاں تھیں۔"

یہ مفہوم بھی غلط ہے کیونکہ سونے کا دل ہونے سے مراد نیت کا خالص ہونا ہوتا ہے۔

(۳)۔ "رجل الجراد ایک ترکاری کا بھی نام ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی دوست اسے بطور تحفہ ایسے وقت میں لایا ہو جبکہ آپ ننگے نہا رہے ہوں اور وہ جلدی سے یوں آواز دے کر کہ میں نے آپ کے لیئے ترکاری یہاں رکھی ہے۔ چلا گیا۔ پھر جب آپ فارغ ہوئے تو اسے قبول فرما کر بہت بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔" (ص ۳۵۳)

یہ ممکنات پیش کرنے کے بعد تاکید مزید کے طور پر فرماتے ہیں:۔

"اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سچ مچ سونے کی بنی ہوئی ٹڈیوں کی آسمان سے بارش ہوئی تھی کہ یہ نظامِ الٰہی کے خلاف ہے۔ پھر اس میں کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو گلی کوچوں اور بازاروں میں بھی اور گھر کے صحن اور چھتوں پر بھی بارش ہوئی ہوگی۔ تو پھر اسے پکڑ پکڑ کر سنبھالنے کی ضرورت کیا تھی؟" (ص ۳۵۲)

اثری صاحب کو سونے کی ٹڈیوں کے بے فائدہ ہونے کی غلط فہمی یوں پیدا ہوئی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ

(۱)۔ حضرت ایوبؑ کسی شہر میں بستے تھے جس میں گلیاں، کوچے اور بازار بھی موجود تھے۔

(۲)۔ سنہری ٹڈیوں کی بارش برسانے پر اللہ قدرت نہیں رکھتا کیونکہ یہ اس کے نظام یا عادت جاریہ کے خلاف ہے پھر یہ بات انہیں اور بھی ناممکن نظر آتی ہے کہ اگر سونے کی ٹڈیوں کی بارش ہو بھی تو وہ حضرت ایوبؑ کے مقام پر ہو، اور خصوصاً اس وقت جبکہ وہ بالکل اکیلے ہوں۔

سو یہ ہے وہ بخاری کی ابوہریرہؓ سے منقول مرفوع حدیث جسے آپ نے قابلِ قبول سمجھا اور جس کے متعلق آپ خود لکھتے ہیں۔ "یہ وہی حدیث ہے جس کی بابت میں ابن حجر کا قول نقل کر آیا ہوں کہ ایوبؑ کے قصہ میں امام بخاری کے نزدیک اس کے سوا اور کوئی روایت ثابت نہیں اور اس کا مطلب بھی میں نے بصورت ترجمہ ٹھیک طور پر بیان کر دیا ہے جس کی موجودگی میں کسی خلافِ عقل ترجمہ کی ضرورت نہیں۔" (ص ۳۵۰)

آپ نے اس روایت کا ٹھیک ترجمہ ایک تو نہیں کیا بلکہ کئی ٹھیک ترجمے کر دیئے۔ کاش! یہ بھی بتا دیتے کہ سب سے زیادہ ٹھیک ترجمہ کون سا ہے؟

حضرت ایوبؑ کی ناکامی کا اصل سبب: حضرت ایوبؑ اٹھارہ سال یا بروایتے ۱۳ سال قوم کو تبلیغ کرتے رہے۔ مخالفت ہی مخالفت بڑھی اور ایک آدمی بھی ایمان نہ لایا۔ اب اثری صاحب اس ناکامی کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ایک دن یا تو بیوی کہیں گئی ہوئی تھی یا آپ کہیں تشریف لے گئے ہوئے تھے کہ تنہائی میں وحی ہوئی کہ یہاں سے بخیال ہجرت اس طرف کوچ کرو۔ جو کہ قریب ہے کوئی بہت دور نہیں۔ وہاں کی آب و ہوا بہت خوشگوار ہے۔ نہانے دھونے اور پینے کے لئے چشموں کا نہایت لذیذ پانی جو کہ موسم کے مطابق سرد گرم ملتا ہے۔ چنانچہ آپ مزدوری ہدایات[1] دے کر وہاں چلے گئے۔ جہاں اللہ پاک کا حکم ہوا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد آپ نے وہاں قیام فرما کر اپنے اہل و عیال[2] کو بھی بلا بھیجا کہ یہاں چلے آؤ۔ جگہ بہت اچھی ہے۔ تبلیغ جاری ہے۔ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔" (ب ص۳۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حضرت ایوبؑ پہلے اٹھارہ سال یا ۱۳ سال تبلیغ کرتے رہے وہ جگہ آب و ہوا کے لحاظ سے خوشگوار نہیں تھی۔ لہٰذا آپ کی تبلیغ کا خاک بھی اثر نہ ہوا۔ پھر جب آپ نے بحکم الٰہی ایک قریبی خوشگوار مقام پر جا کر تبلیغ شروع کی تو تبلیغ کا اچھا خاصا اثر ہوا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔ کاش! ایوبؑ کو یہ نکتہ پہلے ہی معلوم ہو جاتا تو وہ اتنی طویل مدت اتنا دکھ نہ اٹھاتے

---

[1] یہ ہدایات غالباً بیوی کے لئے ہی ہو سکتی ہیں کیونکہ کوئی بچہ تو تھا نہیں اور کوئی آدمی اسلام بھی نہ لایا تھا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ کے ساتھ کوئی تھا ہی نہیں تو آپ نے یہ ضروری ہدایات دیں کس کو؟

[2] بیوی کے سوا اور کون سے عیال تھے اور کس کے ہاتھ بلا بھیجا۔

۱۱۔ حضرت زکریّا علیہ السّلام

(۱) کفالتِ مریمؑ: حضرت مریمؑ کی کفالت و تربیت کے متعلق قرآن کریم میں ہے:-

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ

اے پیغمبر! جب وہ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے۔ اسوقت آپ تو اُن کے پاس نہیں تھے کہ مریمؑ کا کفیل کون بنے اور نہ ہی تم اس وقت پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

اس آیت سے بس اتنا ہی ثابت ہے کہ جب حضرت مریمؑ کی سرپرستی کے متعلق مجاورینِ مسجد میں جھگڑا ہوا تو قرعہ اندازی کی نوبت آئی اور قرعہ اندازی کی شکل قلمیں پھینکنے سے تعلق رکھتی تھی۔ البتہ جمہور مفسّرین نے یہ لکھا ہے کہ آپس میں طے یہ ہوا تھا کہ قلمیں بہتے دریا میں پھینکی جائیں۔ جس کا قلم دریا میں تھم جائے اور پانی کے بہاؤ کے رُخ بہنے نہ لگے۔ وہی مریمؑ کا کفیل ہوگا۔

قلمیں پھینکنے کے ذریعہ قرعہ اندازی کا یہ طریق غالباً حافظ صاحب موصوف کو پسند نہیں آیا۔ شاید اس وجہ سے کہ بہتے پانی میں قلم کا تھم جانا خرقِ عادت ہے۔ لہٰذا آپ نے قلمیں پھینکنے کے ذریعہ قرعہ اندازی کے چند اور طریق بتلائے ہیں یا ان کے اپنے الفاظ میں مطلب بیان کئے ہیں۔ یہ مطالب جہاں "تاویلات" کے میدان میں آپ کے تخیّل کی پرواز کا پتہ دیتے ہیں وہاں ہمارے لیئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں لہٰذا ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مطلب ۱: "انہوں نے قلموں کے زور سے مضمون لکھے کہ اس وجہ سے ہمارا استحقاق ہے۔ حضرت زکریا نے موضوع "مخلوط تعلیم" اختیار کر کے اس کا رد پیش کیا۔ لہٰذا وہ کامیاب ہوئے۔" (ص ۳۹۳)

اب ظاہر ہے کہ اس طریق کو قرعہ اندازی تو نہیں کہا جا سکتا یہ تو مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا پھر اس کے مضمون پڑھنے اور نتیجہ نکالنے کے لئے کوئی بورڈ بھی بیٹھا ہوگا۔ جس نے حضرت زکریا کو پاس کیا پھر موضوع کے لئے "مخلوط تعلیم" کا انتخاب بھی اثری صاحب کی روشن ضمیری کا پتہ دے رہا ہے۔

مطلب ۲: "انہوں نے مذکورہ بالا طریق پر مضامین لکھ کر قلموں کو پھینک دیا (یاد رہے کہ پہلے مطلب میں قلموں کو پھینکا نہیں تھا) کہ ہم نے جو کچھ کرنا تھا کر دیا ہے۔ اب تقدیر کا قلم جن کے ہاتھ میں ہے وہ غالب ہوگا۔" (پھر تقدیر کے قلم کے بے ضرورت اور لاحاصل حوالے بھی درج فرما دیئے ہیں)۔ (ص: ۳۹۴)

اب سوال یہ ہے کہ اگر تقدیر ہی کے سپرد کرنا تھا تو پھر مضمون نویسی کی ضرورت ہی کیا تھی؟

مطلب نمبر۳ : " انہوں نے کسی نہ کسی طرح سے قرعہ اندازی کی ہوگی۔ جس سے زکریا کے نام قرعہ نکل آیا۔"
(ص ۳۹۵)

کیا اچھی بات فرمائی ہے حافظ صاحب نے۔ اگر صرف ایک یہی مطلب درج فرما دیتے۔ تو باقی مطالب کی ضرورت ہی کیا تھی؟

مطلب نمبر۴ : اگر معروف ومشہور مطلب ہی لینا ہے تو اس صورت میں یہ ہرگز نہ ہوگا کہ قلم پانی کی روانی کے خلاف اوپر بلندی کی طرف بہہ نکلے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض موقعہ پر کچھ پانی بھنور کی طرح کسی جگہ پر پھیل کر تھوڑا یا بہت پیچھے کی جانب رواں ہونے لگتا ہے تو اس طرح پر جس کی جانب کا قلم ادھر کو بہنے لگے تو وہ مستحق ہے۔ اگر متعدد قلم بہنے لگیں تو دوبارہ سہ بارہ قرعہ ڈال لیا جائے... مگر یہ چوتھا مطلب ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔" (ص ۳۶۵)

سچ فرمایا آپ نے ان لوگوں کے کیا کسی کے شایانِ شان نہیں۔ کیونکہ بھنور کی صورت میں یا خالی جگہ کی صورت میں بھی سب کے قلم پانی کے بہاؤ ہی کے پابند ہوں گے اور دوسری، تیسری بار بھی قلمیں ڈالنے سے کچھ نتیجہ نہ نکل سکے گا اور یہ تماشا لگا ہی رہے گا۔

(۲) حضرت مریم اور بے موسم پھل :

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ :

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا سے مفسرین نے یہ استدلال کیا ہے کہ مریم کے پاس بے موسم پھل آیا کرتا تھا کیونکہ زکریا نے ایسے پھل دیکھ کر ہی اللہ سے اولاد کے لئے دعا کی ہے اگرچہ اس پھل (اولاد) کا بھی وقت نہیں رہا۔ مگر اللہ پاک مریم کی طرح مجھے بھی عطا فرمائے تو قادر ہے ...... یہ خیال کوئی غلط اور ناممکن نہیں کیونکہ کسی موسم کے آخر میں اس کے پھل کا آخری اُتار گویا بے موسم پھل ہی کہلاتا ہے اور آئندہ موسم کے شروع تک اسے کسی نہ کسی طرح محفوظ رکھ کر عمدہ طریقے سے رکھا بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے تاجر اسے محفوظ رکھ کر دوسرے وقت میں گراں فروخت کرتے ہیں۔" (ص: ۳۶۷)

اب سوال یہ ہے کہ پھل کا آخری اُتار تو آخری اُتار ہی کہلاتا ہے جسے ہم اپنی زبان میں جانے والی بہار کا میوہ کہہ دیتے ہیں۔ اسے بے موسم پھل کوئی نہیں کہتا اور اگر پھلوں کو دوسرے موسم میں محفوظ کرنے کا طریقہ معلوم ہو، تو اس میں حیرت کی بات کیا ہوئی۔ یہ تو دستور ہوا کہ یوں پھلوں کو محفوظ کیا جا سکتا ہے جیسے لوگ

جانتے ہیں۔ حضرت زکریاؑ آخر کس بات پر حیران ہوئے تھے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت یاد آگئی تھی؛ بہرحال حضرت زکریاؑ کے متعلق یہی دو قابلِ ذکر اتہام تھے۔ جن کو آپ نے دُور فرما کر آپ کی عصمت بیان کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔

۱۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰؑ کی تمام تر زندگی معجزات سے بھرپور ہے۔ سب سے بڑا معجزۂ قدرت تو آپ کی بن باپ پیدائش ہے۔ جس کے لئے اثری صاحب کو ایک مستقل اور علیحدہ کتاب ترتیب دینا پڑی۔ چنانچہ اس مستقل کتاب کا جواب بھی ہم نے علیحدہ اور مستقل طور پر ہی لکھا ہے۔ اسی کتاب میں ضمناً تکلم فی المھد یا آپ کے گود میں کلام کرنے کا ذکر آگیا ہے۔ پھر آپ کا بھرپور جوانی کے عالم میں آسمانوں کی طرف اُٹھایا جانا۔ وہاں ملاءِ اعلیٰ میں تاحال آپ کا زندہ ہونا اور پھر قیامت کے قریب زمانہ میں دوبارہ دُنیا میں نزول یہ سب معجزات ہیں مگر ان معجزات کی طرف اثری صاحب نے توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جب مرزا قادیانی یہ کارنامہ سرانجام دے چکا ہے۔ تو اب اس کے تکرار کی ضرورت بھی کیا ہے۔ باقی کچھ معجزات آپ کی زندگی سے متعلق ہیں، وہ قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمائے ہیں۔

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۴۹)

اور (عیسیٰؑ) بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر ہوں گے (اور کہیں گے) میں تمہارے پاس پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی کی مورت بصورت پرند بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے سچ مچ جانور ہوجاتا ہے۔ اور میں مادر زاد اندھے اور پھلبہری والے کو تندرست کر دیتا ہوں اور خداؐ کے حکم سے مردے میں جان ڈال دیتا ہوں اور جو کچھ تم کھاکر آتے ہو اور جو گھروں میں جمع رکھتے ہو، سب تم کو بتا دیتا ہوں۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو تمہارے لئے ان باتوں میں نشانی ہے ۔

مندرجہ بالا خرقِ عادت امور کی تاویلات اور مختلف تعبیرات تلاش کرنے میں جناب حافظ صاحب نے جو ذہنی کاوش فرمائی ہے وہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) **پرندوں کی شکل اور نفخہ**: فرماتے ہیں:۔

میرے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے غور و فکر اور تفہیم کے لئے تمہاری فطرت

اور جبلت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر بیان کرتا ہوں کہ جیسے پرندوں میں اُڑنے کی قابلیت ہوتی ہے مگر وُہ پیدا ہوتے ہی نہیں اُڑتے ہاں کچھ دنوں بعد پر پُرزہ پیدا ہوتے پہ اُڑنے لگتے ہیں۔ اسی طرح تمہارا حال ہے۔ مَیں تمہارے اندر کلام نبوت پھُونکتا ہوں تو اس کا اثر پاک طینت لوگوں پر ہوتا ہے جو کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ آمَنَّا بِاللّٰہِ ... الخ کہہ رہے ہیں اور بدطینت لوگوں کو ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (۱۰۱/۱۰) " (ب م ص ۲۷۲)

مذکورہ آیت کی مندرجہ بالا تشریح کے بعد آپ نے تین الفاظ کی لغوی تشریح بھی فرمائی ہے۔ اور وُہ الفاظ ہیں۔ خلق۔ طین اور طیر۔ (ب م۔ ص ۲۷۴)

مختلف کتب ہائے لغت کی ورق گردانی کے بعد آپ خَلَقَ کے معنیٰ بتلاتے ہیں "کسی چیز کا اندازہ کرنا اور درست کرنا" پھر اس معنیٰ کا بھی آپ نے صرف پہلا حصّہ اپنے مفہوم کے لئے مناسب خیال فرمایا ہے اور دُوسرا حصّہ "درست کرنا" چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ صرف اندازہ کرنے کے لیئے قرآن نے قَدَرَ اور خرص کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اس معنیٰ میں خلق کا لفظ قرآن میں کہیں استعمال نہیں ہُوا۔ مثلاً قرآن میں ہے :۔
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" تو کیا اس کے معنیٰ سمجھے جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کا صرف اندازہ ہی کیا۔ پیدا کر کے وجود میں نہیں لایا؟

دُوسرا لفظ طین ہے جس کے معروف معنیٰ مٹی یا گیلی مٹی ہے لیکن آپ نے ساری بحث طینت پر شروع کر دی ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قبلہ حافظ صاحب طین اور طینت میں تمیز بھی کر سکتے ہوں۔ طینت کے معنیٰ تو واقعی جبلت، سرشت یا فطرت ہے لیکن طین کے ہرگز یہ معنیٰ نہیں۔ ارشاد باری ہے :۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ (۶/۲) | وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا

اس آیت میں طین کا معنیٰ سرشت فٹ کر کے دیکھئے۔ کیا کچھ معنیٰ بنتا ہے ؟

تیسرا لفظ طیر ہے۔ طیر کے معنیٰ آپ نے پرندے، "نیک و بداعمال" اور "ادب و احترام" بتلائے۔ (ب م ص ۲۷۶)
پھر ان میں سے "نیک و بداعمال" والا معنیٰ آپ نے اختیار فرمایا ہے حالانکہ یہ طیر کا معنیٰ ہے ہی نہیں بلکہ طائر کا ہے جو واحد ہے اور طیر جمع ہے۔ طائر تو پرندہ اور نیک و بداعمال دونوں میں آتا ہے لیکن طیر (جمع) نیک و بداعمال کے معنوں میں نہیں آتا۔ صرف "پرندوں" کے معنی میں آتا ہے۔

اب دیکھئے یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی آپ کا بیان کردہ مطلب درست نہیں بیٹھتا۔ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ یُوں ہے کہ "میں مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وُہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔"

اس میں یہ استثنا ہرگز نہیں کہ جس پرندہ کی مٹی میں نے اچھی طرح لگائی وُہ تو پرندہ بن کر اُڑ جاتا ہے اور جن شکلوں کے لئے مٹی اچھی نہیں استعمال کی وُہ نہیں اُڑتا بلکہ میری پھونک کے بعد بھی مٹی کا ڈھیر ہی رہتا ہے۔

(۲) اگر قرآن میں فَأَنفُخُ فِيكُمْ کے الفاظ ہوتے تو پھر تو اس کا مطلب "تم میں" بیان کیا جاسکتا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ فانفخ فیہ۔ یعنی میں اس اپنے مٹی کے بنائے ہوئے پرندے میں پھونک مارتا ہوں۔ تمہارے اندر پھونک نہیں مارتا۔ لیکن اثری صاحب بھلا اس طرف کیوں توجہ فرمائیں؟

(۳) لفظ نفخ کے معنوں کے ساتھ "کلام نبوت" کا اضافہ بھی قابل غور ہے۔ شاید دُوسرے انبیاء تو لوگوں کو کلام نبوت صرف سناتے ہوں اور عیسٰی علیہ السّلام لوگوں کے اندر کلام نبوت پھونکتے ہوں۔ بہرحال حضرت عیسیٰ کی کوئی امتیازی بات ہے ضرور۔ جس سے اثری صاحب فرار چاہ رہے ہیں۔

(۲) مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کرنا:

فرماتے ہیں کہ "میں انہیں بھی درست کرنا چاہتا ہوں جن کی نگاہیں کمزور ہیں اور وُہ اپنے مطلب کا دیکھتے ہیں اور ایسے شب کوروں کو بھی درست کرنا چاہتا ہوں جو کہ کچھ کھا پی کر ایمان و اسلام کا دم بھرتے ہیں اور چلتی گاڑی کے یار و سوار ہیں اور میں برص والوں کو بھی درست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دو رنگی چھوڑ کر ایک رنگ ہوں"۔ (ص ۳،۴)

(۱) اس ترجمہ میں آپ نے ہر مقام پر "چاہتا ہوں" کا جو اضافہ فرمایا ہے۔ قرآن کے کسی لفظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔

(۲) برص جلد کی ایک بیماری ہے جس کو پھلبہری کہتے ہیں جبکہ دورنگی دل کی بیماری ہے۔ جسے منافقت تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کا برص سے کیا تعلق؟ برص جسمانی بیماری ہے اور جلد سے تعلق رکھتی ہے۔ جب کہ دورنگی روحانی بیماری ہے اور اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اخلاقی بیماریوں کا علاج تو تمام انبیاء کرسکتے ہیں اور یہ اُن کی ذمّہ داری ہوتی ہے۔ پھر اس برص کی بیماری کا حضرت عیسیٰ کے ساتھ بالخصوص ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

(۳) شب کوری اور کمزوری نگاہ کے لئے معروف لغت عَشَا یَعْشُوْ ہے۔ عَشْوَۃٌ بمعنی شب کوری اور عَشْوَار شب کور کو کہتے ہیں اور اکمہ کے معروف معنیٰ مادرزاد اندھا ہے۔ آپ نے مختلف لغتوں کا حوالہ دے کر جو اکمہ کے دُور کے معنی شب کوری تلاش کئے ہیں۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی جب کہ آپ کے لئے تاویل کے اور بھی ہزاروں راستے کھلے ہیں۔ جہاں نہ کسی لفظ کی ضرورت پیش آتی ہے نہ اس کی لغت کی۔

(۳) مُردوں کو زندہ کرنا: فرماتے ہیں: "احیاء موتیٰ کا ذکر قرآن مجید میں بکثرت آیا ہے کہ رُوحانی جسمانی دونوں طرح کی موت اور زندگی کا اللہ پاک نے بیان فرمایا ہے لیکن نبیوں کا کام تبلیغ دین اور اشاعت اسلام ہے۔ طبابت اور ڈاکٹری ان کے فرائض اور پروگرام میں نہیں۔ لہٰذا اس سے روحانی زندگی مُراد ہے۔" (ص ۳۷۹)

بجا فرمایا آپ نے بلکہ آپ کے خیال کے مطابق تو مُردوں کو زندہ کرنا اللہ کے پروگرام میں بھی شامل نہیں۔ نبیوں کے پروگرام میں کیونکر شامل ہو سکتا ہے؟" جب ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے اللہ مجھے دکھلاؤ کہ تم مُردوں کو کیونکر زندہ کرتے ہو؟" تو اس وقت بھی تو اثری صاحب روحانی زندگی اور موت ہی مُراد لیتے ہیں۔ آخر کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں آپ نے احیاء موتیٰ سے مراد جسمانی زندگی اور موت بھی لیا ہو؟ جبکہ دعویٰ یہ ہے کہ یہ لفظ قرآن میں دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔

(۲) طبیب اور ڈاکٹر صرف مریضوں کا علاج کرتے ہیں جبکہ عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں طبیب اور ڈاکٹر مریض کا صرف علاج کرتے ہیں شفا نہیں دیتے وہ منجانب اللہ ہی ہوتی ہے، ہو یا نہ ہو۔ جبکہ عیسیٰؑ مُردوں کو اللہ کے اِذن سے زندہ کر دیا کرتے تھے۔ یہاں یہ بات نہ تھی کہ عیسیٰؑ مردہ کو قم باذن اللہ کہیں پھر کوئی مردہ تو جی اُٹھے اور کوئی نہ جئے۔

(۳) یہ بات پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ اگر احیائے موتیٰ سے مُراد روحانی مریضوں کو ہی شفایاب کرنا ہے اور یہ کام سب نبیوں کے پروگرام میں شامل ہے تو آخر عیسیٰؑ کے سوا اور کسی نبی یا رسُول کے لئے احیائے موتیٰ کا ذکر کیوں نہیں آیا؟ یہ کام صرف عیسیٰؑ کے لیے ہی کیوں بالخصوص ذکر کیا گیا؟

(۴) پروگرام اور چیز ہے اور معجزہ اور چیز ہے۔ عیسیٰؑ کی بعثت کا واقعی یہ مقصد نہ تھا کہ وہ صرف مُردوں کو زندہ کرتے پھریں اور دُوسرا کوئی کام نہ کریں بلکہ اعجاز کے طور پر انہیں یہ بات بھی عطا کی گئی تھی جس طرح دُوسرے انبیاء کو بھی معجزات عطا ہوئے ایسے ہی کبھی کبھار، جب اللہ کو منظور ہوتا وہ کسی مُردے کو قم باذن اللہ کہتے تو وہ زندہ ہو جاتا تھا۔

یہ تو اثری صاحب کا ٹھیک مطلب یا مطلب ملا تھا۔ اب دوسرے مطالب بھی تفریح طبع کے لئے ملاحظہ فرمائیے:۔

مطلب نمبر ۲: علاوہ اس کے ان عوارض سے جسمانی عوارض بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کا علاج نبی کے پروگرام میں نہیں۔ حدیث کی تمام کتابوں میں کتاب الطب اور کتاب الدعوات موجود ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اللہ پاک نے عیسیٰؑ کو ایسے بیماروں کے لئے بعض ایسے طبی نسخوں کی اطلاع کر دی ہو اور طریق دُعا بھی

بنا دیا ہو۔ پھر جن کی بابت آپ نے اللہ پاک سے الہام پاکر بطور پیشگی اعلان کر دیا کہ وہ میری دعا اور دوا سے ضرور تندرست ہوں گے تو وہ صحتیاب ہوئے۔ دوسرے نہیں"۔ مگر دریں صورت کہیئۃ الطیر سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو کہ کسی بیماری میں کمزور اور سخت لاغر ہو کر چڑیا کے بوٹ کی طرح ہو گئے ہوں اور چل پھر نہ سکتے ہوں اور نفخ سے مراد دعا پڑھ کر جھاڑ پھونک کرنا اور دوائی پلانا اور پھکانا مراد ہو گا۔ اور احیائے موتیٰ سے وہ لوگ مراد ہوں گے جو کہ قریب المرگ ہوں جیسے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ لَقِّنُوْا مَوْتَاکُمْ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ رواہ مسلم مرفوعاً۔" (ب م ص ۲۸۱ - ۲۸۲)

پیٹنٹ طبی نسخے: اس مطلب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے چند پیٹنٹ طبی نسخے عطا فرمائے تھے مگر ان کے صحیح استعمال کے لئے چند در چند شرائط بھی عائد کر دی تھیں۔ مثلاً:

(۱)۔ ان نسخوں سے صرف وہی بیمار شفایاب ہو سکتے ہیں جو سخت لاغر اور کمزور ہو کر چڑیا کے بوٹ کی طرح ہو گئے ہوں۔ اور چل پھر نہ سکتے ہوں (یہ شرط غالباً لفظ طیر کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے عائد کی گئی ہے)

(۲)۔ پھر مندرجہ بالا شرط کے بعد بھی یہ بات واضح رہے کہ ان نسخوں سے صرف وہی لوگ شفایاب ہوں گے جن کے متعلق بذریعہ الہام پہلے سے اطلاع کر دی گئی ہو۔

(۳)۔ ان نسخوں کے ساتھ ساتھ دعا پڑھ کر جھاڑ پھونک کرنا بھی ضروری ہے (جھاڑ پھونک کرنے کا لفظ غالباً نفخ کی وجہ سے استعمال کیا گیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ نفث کا ترجمہ ہو سکتا ہے نفخ کا نہیں) اور ساتھ ہی دوائی پلانا اور پھکانا بھی ضروری ہے۔

(۴)۔ احیائے موتیٰ میں موتیٰ سے مراد وہ لوگ نہیں جن کی روح پرواز کر چکی ہو بلکہ قریب المرگ لوگ مراد ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ لَقِّنُوْا مَوْتَاکُمْ .... الحدیث۔ رہے مرے ہوئے لوگ۔ تو ان کے زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ یہ ضابطہ الٰہی کے خلاف ہے۔

احیائے موتیٰ کے مختلف مطالب: دیکھا آپ نے کس طرح اثری صاحب حضرت عیسیٰؑ کو ایک عام کاروباری طبیب اور عامل کی سطح پر لے آئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عیسیٰؑ کو یہ پیٹنٹ نسخے اور دم جھاڑ کے طریقے اور ان کا طریق استعمال اللہ نے بذریعہ الہام عطا فرمائے تھے۔ جب کہ دوسرے طبیب اور عامل استادوں سے سیکھتے ہیں۔

اب باقی کے مطالب بلا تبصرہ ہی ملاحظہ فرمایئے:۔

مطلب نمبر ۳: "اکمہ اور ابرص سے جو تم لوگوں نے اتنی بڑی بھاری احتیاط اور نفرت کر رکھی ہے تو وہ

کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ ان کی بیماری کوئی متعدی بیماری نہیں لہٰذا میں انہیں پاک ٹھہراتا اور بری کرتا ہوں۔" (ایضاً ص ۳۸۳)

مطلب نمبر ۴: "اسرائیلیوں میں اندھے اور مبروص کی اقتداء سے احتراز کیا جاتا تھا۔ عیسیٰ نے اس کی تردید فرما دی اور فرمایا کہ میں انہیں قابل امامت ٹھہراتا ہوں۔" (حوالہ ایضاً)

مطلب نمبر ۵: "جن قوموں نے اپنی قرارداد اور رسم و رواج کے مطابق مُردہ بدست زندہ کی طرح قرار دیا ہوا تھا کہ وہ نیچ شودر اور ناقابل ترقی ہیں فرمایا کہ یہ غلط اور بے انصافی ہے۔ میں انہیں ابھارنا چاہتا ہوں اور وہ ہر طرح سے جائز طور پر ترقی کر سکتے ہیں۔" (ایضاً ص ۳۸۴)

مطلب نمبر ۶: "اگر کوئی بڑا مارا جائے تو دھوم مچ جاتی ہے اور آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی چھوٹا مارا جائے تو دھواں تک نہیں نکلتا۔ لہٰذا عیسیٰ نے ان کا قصاص طلب فرمایا تاکہ آئندہ کے قتل اور اہانت کا سدباب ہو جائے اور یہ احیائے موتی ہے۔" (ایضاً ص ۳۸۴)

مطلب نمبر ۷: وہ عورتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جن کی وراثت اور دیگر حقوق قوموں میں مسلوب شدہ ہیں اور یہ کہ وہ جو کہ اپنے مردہ شوہروں کے ساتھ زندہ جلا دی جاتی ہیں وہ معصوم بچیاں جو زندہ دفن کر دی جاتی ہیں۔ عیسیٰ نے ان کے جائز حقوق کی حفاظت فرمائی اور زندہ جلانے اور دفن کرنے سے روک دیا۔" (ص ۳۸۴)

اب سوال یہ ہے کہ آپ نے احیاء موتیٰ کی تفسیر میں یہ جو مطالب تلاش فرمائے ہیں۔ ان کے لئے عربی میں کوئی لغت نہیں کہ ان سب مطالب کو احیاء موتیٰ ہی کے تحت لایا جائے۔ پھر اثری صاحب کی تاریخ دانی کا یہ حال ہے کہ جو رسوم ہندوستان سے مخصوص ہیں مثلاً ذات پات کی تقسیم یا رسم ستی وغیرہ وہ آپ نے شام کے علاقہ اور دورِ عیسوی سے متعلق فرما دی ہیں۔

(۵) گھروں میں چھوڑا ہوا مال: حضرت عیسیٰ کو جو معجزات عطا ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ لوگوں کو یہ بتلا دیتے تھے کہ تم کیا کھا کر آئے ہو اور کیا کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت اس پر دال ہے۔

وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (۳/۴۹)	اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور اپنے گھروں میں جمع رکھتے ہو سب تم کو بتا دیتا ہوں۔

اب اس آیت کا ٹھیک مطلب (ب ص ۳۸۲)۔ اثری صاحب کی زبان سے سنئے اور سر دھنئے:

"اور میں دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ اس پر بحث و مناظرہ کے لئے بھی ہر وقت تیار ہوں اور کہ جس مال

سے تم کوٹھیاں اور بلڈنگیں بنا کر ان پر ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی لکھوا دیتے ہو اور جو مال تم نے اپنے گھر وں میں چھوڑ رکھا ہے اور جو مال کہ دن رات تمہاری خوراک اور لباس ہو رہا ہے۔ میں صاف صاف اس کی بابت کہتا ہوں کہ یہ سُود اور دیگر ناجائز طریقوں سے غریب لوگوں سے بٹورا ہُوا ہے۔ تمہارے لئے شرعاً ھرگز حلال نہیں اور جو چیزیں تم پر شرعاً حلال ہیں ان کو تم نے اور تمہارے بڑوں نے حرام کر رکھا ہے۔ اور چھوڑ رکھا ہے سو میں ان سب مفاسد کی اصلاح کے لئے مبعوث ہُوا ہوں " (ب ص ۳۷۴)

اب دیکھئے کہ اثری صاحب کے اس ٹھیک مطلب کی جب صحابہ کرام بلکہ خود رسُول اللہ کو بھی سمجھ نہ آئی۔ تو یہ ٹھیک کیسے ہُوا ؟ مثل مشہور ہے" اُونٹ رے اُونٹ تیری کونسی کل سیدھی"۔ اب اس ٹھیک مطلب کے ایک ایک فقرہ میں آپ نے جس چابکدستی سے کام لیا ہے۔ اُسے کہاں تک زیر تبصرہ لایا جا سکتا ہے۔

(۶) نزول مائدہ کی اثری تعبیر: حضرت عیسیٰؑ کی استدعا پر آسمان سے دستر خوان اُترا تھا یا نہیں؟ اسمیں بھی علماء نے اختلاف کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ نزول مائدہ کے ساتھ ایمان نہ لانے کی صورت میں جو عذاب شدید کی دھمکی دی گئی تھی اس وجہ سے اس قوم نے نزول مائدہ کا مطالبہ چھوڑ دیا تھا لیکن اکثر علماء کا یہی خیال ہے کہ دستر خوان آسمان سے اُترا۔ پھر جو لوگ ایمان نہ لائے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ پھر یہ بندر اور خنزیر تین دن کے اندر اندر ہلاک ہو گئے اور ان کی نسل آگے نہیں چلی۔ اثری صاحب نزول مائدہ کی حد تک تو اس کے قائل ہیں مگر جو تعبیر بیان فرمائی ہے۔ اس میں وہ منفرد ہیں۔ فرماتے ہیں

"میرے نزدیک بھی راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ (دستر خوان آسمان سے اُترا تھا) مگر ہاں نزول اس کا بسبب استدعا عیسوی تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا جیسے کہ ان کے خلف کے لئے آج تک ہو رہا ہے ویسے ہی ان کے سلف کے لئے بھی ہوتا رہا ہے۔ ایک قوم نے ہندوانہ طریق پر ہی مُوسیٰ سے دال روٹی طلب کی تو انہیں دی گئی جسے وُہ آج تک کھا رہے ہیں اور دُوسری قوم نے باغیانہ روش پر عیسیٰؑ سے گوشت روٹی طلب کی تو اسے بھی دی گئی جسے وہ آج تک کھا رہے ہیں"۔ (ب ص ۳۹۰)

اب دیکھئے اس اقتباس میں اثری صاحب فرما رہے ہیں کہ:۔

۱۔ نزول مائدہ صرف عیسیٰؑ کے وقت ہی نہیں ہُوا۔ بلکہ آج تک نزول مائدہ کا عمل جاری ہے۔

۲۔ ایک قوم یعنی یہودیوں نے ہندوانہ طریق پر دال روٹی طلب کی تو اس پر دال روٹی کے مائدہ کا نزول آج تک ہو رہا ہے۔ حالانکہ دال روٹی مانگنے والی یہودی قوم ہی آج سب سے زیادہ مالدار قوم ہے۔

۳۔ عیسائیوں نے گوشت روٹی مانگی تو آج تک ان پر گوشت روٹی کا نزول ہو رہا ہے۔ یہ بات بھی دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک تو نزول مائدہ کی استدعا میں گوشت روٹی کا کوئی ذکر نہیں۔ دُوسرے عیسائی قوم

پاکستان میں بستی ہے اور لاکھوں کی تعداد میں ہے ۔ یہ لوگ عموماً خاکروب ہیں اور بیت الخلاء کی صفائی کرتے ہیں کیا گوشت روٹی کے نزول کا یہی مفہوم ہے ۔

البتہ ایک بات جو واضح ہے وُہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی اس تعبیر میں خرقِ عادت بات کو بہرحال صاف کر دیا ہے اور یہی کچھ آپ چاہتے تھے ۔

رہا نزول مائدہ کے بعد اسلام نہ لانے والے لوگوں کی شکلوں کا بندر اور خنزیر میں تبدیل ہونے کا معاملہ ۔ تو اس سلسلہ میں ہم ابتدا میں اثری صاحب کا نظریہ پیش کر چکے ہیں ۔

اصحابِ کہف

اصحابِ کہف اور پانچ بے سروپا باتیں:

اصحابِ کہف کے قصہ میں اثری صاحب کو پانچ بے سروپا باتیں نظر آئی ہیں۔ جن کا ذکر ہم انہیں کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"اصحابِ کہف کی بابت کثرت سے بے سروپا باتیں مشہور ہیں جو کہ عقل و فکر کے سراسر خلاف ہیں کہ وہ تین[1] سو سال تک غار میں سوئے رہے۔ پھر[2] اٹھ کر کچھ کھایا پیا۔ پھر جو سوئے[3] تو آج تک نہیں جاگے۔ پھر[4] سال یا چھ ماہ بعد وہ اپنی کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ آنکھیں[5] ان کی کھلی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں مگر دراصل وہ سو رہے ہیں۔" (ص ۴۲۶)

یہ پانچ باتیں جو آپ کو بے سروپا نظر آئی ہیں ان کی بے سروپائی کی وجہ بھی آپ نے بتلا دی ہے کہ یہ عقل پرستوں کی عقل و فکر کے خلاف ہیں۔ ان پانچ باتوں میں سے چار باتیں تو ایسی ہیں جو یا تو قرآن سے ماخوذ ہیں یا آیت کا بعینہٖ ترجمہ ہیں۔ رہی پانچویں بات یعنی ۳ کہ وہ "پھر جو سوئے تو آج تک نہیں جاگے"۔ یہ فی الواقع بے سروپا ہے اگر کسی مفسّر نے درج کر دی ہے تو اس کے جواب کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ باقی چار باتوں میں سے پہلی بے سروپا بات یہ ہے :-

غار میں سالہا سال تک سوئے رہنا:

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸/۲۵)	اور وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں تین سو برس اور زیادہ کیے انہوں نے نو برس۔

اس آیت میں ازدادوا لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ خواہ ازدادوا کا ترجمہ زیادہ ہوئے کیا جائے یا زیادہ کیے، دونوں لحاظ سے ٹھیک ہے اور یہ اختلاف ہے پہلوں کا جو شمسی حساب سے گنتے تھے وہ تو تین سو برس پورے کہتے اور جو قمری حساب سے گنتے تھے وہ تین سو نو برس کہتے۔ چونکہ تقویم کے حساب سے شمسی ۳۰۰ سالوں کے مقابلہ میں ۳۰۹ سال ہی قمری بنتے ہیں لہٰذا دونوں ٹھیک تھے۔ تاہم اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں فرمایا:

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا (۱۸/۲۶)	اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت غار میں ٹھہرے

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں یہ مسئلہ چنداں اہم نہ تھا کہ لوگوں میں جھگڑے کا سبب بنے۔ لہٰذا اللہ نے یہ الفاظ کہہ کر سببِ نزاع کو ختم کر دیا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ .... الآیہ۔ اللہ کا کلام نہیں بلکہ ان لوگوں کا کلام ہے جو مدت کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ کلام بطور حکایت بیان کیا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا قل اللہ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا الآیہ۔

یہ تسلیم کہ تین سو سال والا کلام لوگوں کا ہوگا اور جو اللہ کا کلام ہے اس میں کئی سالوں کا ذکر تو آتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے کہ :-

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا (۱۸/۱۲)	پھر ہم نے اس غار میں کئی سالوں تک ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈالے رکھا۔ پھر ان کو زندہ کیا تاکہ معلوم کریں کہ دونوں جماعتوں میں اس کی مدت کو کس نے خوب یاد رکھا ہے۔

ان آیات میں ضربنا علیٰ آذانہم کی تفسیر امام بخاری نے نامُوا سے کی ہے اور بَعَثْنَاهُمْ کی اَحْيَيْنَاهُمْ سے یعنی ان پر نیند کی غشی اس قدر طاری تھی جیسے موت کی۔ گویا لوگوں کے کلام کے بجائے اگر اللہ کے کلام کا بھی اعتبار کیا جائے تو کیا بات پھر بھی بے سروپا ہی رہتی ہے؟ بھلا یہ کوئی ماننے کی بات ہے کہ ایک شخص سالہا سال تک سویا رہا ہو پھر وہ جاگ اُٹھے یا زندہ ہو جائے۔ انسان تو زیادہ سے زیادہ آٹھ دس گھنٹے سو سکتا ہے، نیند پوری ہو جائے تو از خود طبعی تقاضا کے مطابق جاگ اٹھتا ہے۔ ورنہ بھوک کی بے قراری اسے جگا دیتی ہے وہ صرف دریں صورت ہی جاگ نہیں سکتا کہ وہ نیند یا سوتے میں موت سے دوچار ہو جائے مگر یہ کیسی خلافِ عقل اور بے سروپا بات ہے کہ چند آدمی سالہا سال تک سوئے بھی رہیں پھر جاگ بھی اٹھیں؟

اثری تاویلات :

اثری صاحب نے اس مشکل سے بچنے کے لئے فضربنا علیٰ آذانہم کے دو مزید معنی لغت سے تلاش کئے ہیں کیونکہ امام بخاری کے بیان کردہ معنے آپ کی افتادِ طبع کے موافق نہ تھے پہلا معنی آپ نے یہ بتلایا کہ ضربنا علیٰ آذانہم کے معنی ہیں "سلسلہ سماعت بند کر دیا گیا" (ب ص ۴۵۵) گویا وہ اتنی مدت سوئے نہیں رہے بلکہ حسبِ دستور دن کو جاگتے اور رات کو سوتے تھے۔ البتہ ان کے کان بہرے ہو گئے تھے۔

اور دوسرے معنی میں آپ نے اس بہرے پن کے ساتھ "الٰہی نوشتوں کے خلاف سماعت" کی شرط بھی لگا دی۔ اور یہ معنی فرمائے کہ "ان کے کانوں کو الٰہی نوشتوں کے خلاف سماعت سے روک دیا" (ب ص ۴۳۸) اس معنی کے لحاظ سے اصحابِ کہف بہرے بھی نہیں رہتے۔ کیونکہ وہ صرف الٰہی نوشتوں کے خلاف بات سن نہیں

سکتے۔ محاورہ ہے کہ فلاں شخص اس بات کے خلاف سُن نہیں سکتا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بات اس کے منہ پر کہی جائے تو لڑنے لگتا ہے اگر الٰہی نوشتوں کے خلاف سُن نہ سکنے سے اثری صاحب کا بھی یہی مطلب ہے تو پھر معاملہ اور بھی صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کی سماعت بھی کسی دقت کم نہ ہوئی تھی اور یہ جو لفظ فضربنا علی اذانہم قرآن کریم میں آئے ہیں۔ بالکل زائد ہیں۔ کیونکہ عملی طور پر اصحاب کہف کی سماعت میں چنداں تبدیلی نہیں ہوئی "

اب سوال یہ تھا کہ اگر ضربنا علی اذانہم کا یہی معنیٰ ہو جو حافظ صاحب بیان فرما رہے ہیں تو بعد میں اللہ تعالیٰ نے بعثناھم کیوں فرمایا؟ اس کا حل اثری صاحب نے یہ سوچا کہ اس لفظ کا معنیٰ بھی بدل دو۔ چنانچہ بعث کا معنی "اُبھارا اور سرفراز کیا" (ب ص ۴۳۸) کر دیا۔ یہ ترجمہ بھی لغوی لحاظ سے غلط ہے اور اس کی یوں مثال سمجھئے کہ ایک شخص مثلاً زید یہ کہتا ہے کہ بعث کا معنیٰ سرفراز کرنا نہیں بلکہ بے عزتی کرنا ہے۔ تا یئے کس کی بات قابل ترجیح ہو گی۔ جبکہ لغوی دلیل کسی کے بھی پاس نہیں۔

امام بخاری کی مخالفت: اثری صاحب ایک سوال اُٹھاتے ہیں کہ امام بخاری نے ضربنا علی آذانہم کا ترجمہ "ہم نے انہیں سلا دیا" کیا ہے تو آپ نے اس کے خلاف ترجمہ کیوں کیا ہے؟

اسی طرح امام بخاری نے بعثناھم کا ترجمہ اَحْیَیْنٰھُمْ کیا ہے کہ ہم نے انہیں زندہ کیا۔ کیا وہ سچ مچ مر چکے تھے؟ اللہ پاک نے انہیں دوبارہ زندہ کر لیا۔" (ب ص ۴۵۴، ۴۵۵)

پھر ان سوالوں کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ضرب علی اذان کا ترجمہ نیند کنائی ترجمہ ہے اصلی نہیں (لہٰذا امام بخاری کی بات ناقابل قبول ہے) اور احیینا میں بھی "حیات سے صرف قومی زندگی اور ملی ترقی مراد ہے۔ جیسے کہ میرے ترجمہ سے ظاہر ہے۔ ورنہ ان کی بابت یہ خیال کہ وہ سچ مچ مر کر پھر زندہ ہوئے تھے۔ کسی نے بھی ظاہر نہیں کیا۔" (ب ص ۴۹۵، ۴۹۶)

اس جواب میں اثری صاحب نے (۱) پیچ یہ ڈال دیا ہے کہ ضَرَبَ عَلٰی اُذَان کا ترجمہ تو سونا ہے لیکن آپ نے اس ترجمہ کو از خود "مرنا" میں تبدیل کر لیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اصحاب کہف سالہا سال سونے کے بعد جاگ اُٹھے یا زندہ ہو گئے تھے۔ مرنے کا واقعی کسی نے اظہار نہیں کیا۔ بات تو سونے کی ہو رہی تھی۔ یہ مرنے کا لفظ حافظ صاحب نے اپنی طرف سے کیوں داخل کر دیا۔ اب اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ سالہا سال سونے کے بعد زندہ ہوئے اور حافظ صاحب یوں کہتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد نہیں جاگے۔ یہ جواب "سوال گندم جواب چنا" کے مصداق اثری صاحب کی ہشیاری کی دلیل تو بن سکتا ہے لیکن نفس مسئلہ کا جواب ہرگز نہیں۔

(۲) فرماتے ہیں کہ ضرب علی اذان کا ترجمہ نیند کنائی ترجمہ ہے۔ اصل ترجمہ نہیں۔ کسی زبان میں بھی کنایہ کا استعمال

فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک بہت بڑی خوبی شمار ہوتا ہے بشرطیکہ کنائی معنیٰ کی تعیین کا قرینہ موجود ہو۔ اس مقام پر بَعَثْنٰا کا لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہاں ضرب علیٰ اذان کے معنیٰ سماعت کی بندش نہیں بلکہ نیند ہے اب اگر کوئی شخص قرینہ کی موجودگی کے باوجود کنائی معنیٰ کے بجائے اصل معنیٰ سمجھ بیٹھتا ہے تو یہ یا تو اس کی سادہ لوحی کی دلیل ہے جیسے ایک صحابیؓ نے حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ سے مراد فی الواقع کالا دھاگا اور سفید دھاگا لئے جو کہ ان الفاظ کا لفظی اور اصلی معنیٰ ہے یا پھر حافظ صاحب جیسے مناظر اور پرکار انسان ایسے مقامات پر الفاظ کے لفظی اور اصلی معنیٰ پر اصرار کرنے لگتے ہیں تاکہ فریب دیا جا سکے۔

(۳) فرماتے ہیں کہ "حیات سے مراد قومی زندگی اور ملّی ترقی مراد ہے"۔ اب دیکھئے کہ اس لحاظ سے حیات الدنیا اور حیات الآخرہ سے کیا مراد ہوگا؟ اور نیز آیت

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۳/۱۸۵) اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے

کے کیا معنیٰ ہوں گے؟ اثری صاحب، صاحبِ اختیار ہیں جس لفظ کا جو جی چاہے معنیٰ بتلا سکتے ہیں وہ اگر اسی لفظ حیات کا معنیٰ 'رزق کی فراوانی' کہہ دیں تو انہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ جہاں کہیں حیات یا احیاء کا لفظ آئے۔ تو اثری صاحب کے لئے مشکل بن جاتی ہے اور وہ "اس کی مراد" تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴)۔ اصحاب کہف کا سالہا سال بعد اٹھنے کے بعد کھانا کھانا:

درج ذیل آیت سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے:۔

فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (۱۸/۱۹)	تو اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر بھیجو وہ دیکھے کہ نفیس کھانا کونسا ہے تو اس میں سے کھانا لے آئے۔

اثری صاحب کو اصحاب کہف کے کھانے پینے یا شہر سے کھانا لانے پر کوئی اعتراض نہیں چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:۔

چنانچہ اس طرح پر شہر سے خوردنی اور دیگر ضروری اشیا کی موقع بہ موقع خرید ہوتی رہی۔ اور کام اچھی طرح سے چلتا رہا" (ب ص ۲۴۳)۔ انہیں اگر اعتراض ہے تو صرف اس بات پر کہ وہ اتنی طویل مدت کے بعد زندہ کیسے ہوگئے اور پھر اٹھ کر کھانے پینے بھی لگے۔

(۴،۳) اصحاب کہف کا سوتے میں دائیں بائیں کروٹ بدلنا:

اثری صاحب کے خیال کے مطابق تیسری بے سروپا بات" پھر سال یا چھ ماہ بعد اپنی کروٹ بدلتے رہتے ہیں" ہے اور چوتھی بے سروپا بات یہ ہے: "آنکھیں ان کی کھلی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں مگر دراصل وہ سو رہے ہیں" اب دیکھئے یہ دونوں باتیں قرآنِ کریم کی درج آیت سے واضح طور پر ثابت ہیں:-

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸/۱۸)	اور تم ان کو خیال کرو کہ وہ جاگتے ہیں۔ حالانکہ وہ سوتے ہیں اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے ہے اگر تم ان کو جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور تم پر شدید دہشت طاری ہو جاتی۔

اب اگر اثری صاحب کو اعتراض ہو سکتا ہے تو صرف کروٹیں بدلنے کے درمیانی عرصہ پر ہو سکتا ہے۔ قرآن نے یہ تو فیصلہ کر دیا کہ تمہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاگتے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ سوئے ہیں۔ اب اگر کسی نے ان کے جاگنے کی نسبت سے یہ بھی لکھ دیا کہ ان کی آنکھیں کھلی ہیں جیسے کہ جاگتے آدمی کی کھلی ہوتی ہیں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ پھر اگر کسی کو یہ آنکھیں کھلی ہونے والی بات ناگوار ہو تو نہ مانے۔ ان کے جاگتے ہونے کے گمان کو کوئی غلط قرار نہیں دے سکتا

اصحاب کہف کی معجزانہ زندگی:

دیکھئے قرآنِ کریم نے اصحاب کہف کے واقعہ کا آغاز درج ذیل آیت سے کیا ہے:-

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (۹/۱۸)	کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور کتبہ والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے ہیں۔

یعنی کیا تم اس خدا کی قدرت سے، جس نے اس پوری کائنات کا نظام سنبھال رکھا ہے، اس بات کو بعید سمجھتے ہو کہ وہ چند آدمیوں کو چند صدیاں سلا کر یا موت دے کر دوبارہ زندہ کر دے؟ اس آیت سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اصحاب کہف کا اللہ کی عجیب نشانیوں یا خرقِ عادت امور سے کچھ تعلق ضرور تھا۔

پھر اس واقعہ کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا (۱۸/۲۱)

اور اس طرح ہم نے لوگوں کو اصحاب کہف کے حال سے خبردار کیا تاکہ وہ جان جائیں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کو مردوں کے جی اُٹھنے) میں کوئی شک نہیں

اب دیکھئے کہ عثر کے معنی لغوی طور پر از خود کسی بات کے ظاہر ہونے کے ہیں (مفردات امام راغب) خواہ باتوں باتوں میں کسی حقیقت کا پتہ چل جائے یا کسی واقعہ یا واقعات کی روشنی میں کوئی حقیقت سامنے آجائے تو معلوم ہوا کہ اصحاب کہف کی عجیب نشانی کا تعلق غیر طبعی طور پر ایک طویل مدت سونے یا (مرنے) اور اس کے بعد جاگ اُٹھنے (یا جی اُٹھنے) سے تھا۔ اور اسی سے حافظ صاحب فرار چاہتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس واقعہ کا جو نعم البدل قصہ تراشا ہے اس کے نکات بھی ملاحظہ فرما لیجئے:۔

اثری صاحب کا من گھڑت قصہ اصحاب کہف:

(۱) "چند ذی علم نوجوان اسلام کے خادم تھے جو قوم کو علمی مقابلہ کے لئے للکارتے اور شہر میں ایک علمی درسگاہ کے لئے کوشش کر رہے تھے" (ص ۴۳۹)

(۲) "قوم ان کے خلاف بھڑک اُٹھی اور کہا کہ شہر سے باہر کوئی جگہ تجویز کریں" (ایضاً)

(۳) چنانچہ اس معاہدہ پر انہوں نے مذکورہ غار کو اس کام (یعنی علمی درس گاہ) کے لئے تجویز کیا۔" (ایضاً)

(۴) یہ غار صراحی کی طرح باہر سے تنگ اور اندر جا کر دونوں طرف کشادہ ہو گئی ہے اور شمالاً جنوباً ہونے کی وجہ سے طلوع و غروب کے وقتوں میں سورج کے مقابل نہیں پڑتی اور مناسب مواقع پر روشنی اور ہوا کے منافذ بھی موجود ہیں جو دریچوں اور روشندانوں کے قائمقام ہیں گویا قدرت نے پہلے سے ہی ایک شاندار اور نہایت پختہ بلڈنگ بنائی ہوئی ہے" (ص ۴۴۰)

(۵) چونکہ سامان کی اُٹھائی دھرائی اور غار کی اندرونی صفائی وغیرہ سے تھکے ماندے تھے، سو گئے۔ پھر کچھ تھوڑی دیر بعد جاگے تو خواہ مخواہ سوال پیدا ہو گیا کہ یہاں آ کر کتنا عرصہ سوئے رہے۔ پھر ایک یا آدھ دن بتا کر خود ہی سمجھ گئے کہ یہ بحث فضول ہے" (ایضاً)

(۶) پھر انہوں نے کسی کو کچھ رقم دے کر شہر بھیجا اور کہا کہ حلال ستھرا کھانا لائے اور لہجہ نرم استعمال کرے ورنہ وہ لوگ کشت و خون پر اُتر آئیں گے اور تمہارا مدرسہ توڑ دیں گے۔ لہٰذا روزمرہ کی اٹھائی دھرائی سے معاہدہ کی پابندی میں رہ کر آپ لوگوں کو کام کرنا نہایت بہتر اور مناسب ہے۔

(۷) چنانچہ اس طرح پر شہر سے خوردنی اور دیگر ضروری اشیاء کی موقع بہ موقع خرید ہوتی رہی۔ اور کام

اچھی طرح سے چلتا رہا۔" اور نہایت امن وسکون سے تبلیغ ہوتی رہی۔ کئی لوگ اِدھر اُدھر اطراف سے آکر وعظوں اور درسوں سے مستفید بھی ہوتے رہے اور قیامت کی بابت بھی جو اسلامی دلائل تھے انہیں معلوم کرتے رہے۔ اس طرح کئی بڑے بڑے لوگ اور رفقائے کار پیدا ہو گئے" (ص ۴۴۱)

(۸) "کئی ایک فیاض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں ایک عالیشان مدرسہ کی صورت میں بلڈنگ بنائی جائے پھر جو ان سے بھی زیادہ صاحب اقتدار تھے انہوں نے ایک شاندار مسجد کی تجویز پاس کی۔ ایک تو وہ وقت تھا کہ ان بیچاروں کا وعظ و درس روک دیا گیا اور ایک یہ وقت ہے کہ مسجد اور مدرسہ تعمیر ہو رہا ہے۔" (ص ۴۲۱)

(۹) "یہ تو اسلاف کا حال تھا۔ اخلاف کا حال یہ ہے کہ دین کے کاموں میں سخت سست اور ڈھیلے گویا سو رہے ہیں اور دنیوی کاموں میں دائیں بائیں خوب بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ ان کی دنیادارانہ بلڈنگوں اور کوٹھیوں کو جا کر دیکھو تو رُعب کے سبب ان کے اندر نہیں جا سکو گے کہ باہر کتا رکھا ہے۔ اور یہ بیکار بحث بھی جاری کر رکھی ہے کہ وہ (اصحاب کہف) تین اشخاص تھے۔ اور ایک کتا حفاظت کیلئے ساتھ لے گئے تھے۔ کوئی کہتا ہے نہیں وہ پانچ تھے چھٹا کتا ہے یہ رجماً بالغیب کی باتیں ہیں۔ آج صدیوں بعد ان کی اعداد شماری کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔" (ص ۴۴۲)

(۱۰) "یہ سرگزشت تیرے لئے (یعنی رسول اکرم کے لیئے) آئندہ زندگی کا ایک پروگرام ہے تم بھی مدرسہ بنا کر طالبانِ حق وصداقت کو صبح وشام کتاب کا درس دیا کرو۔ بالآخر تمہارا ہی اقتدار و غلبہ ہو گا۔ یہ اللہ پاک کا وعدہ ہے جسے کوئی توڑ موڑ نہیں سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے تجھے مجبور ہو کر یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔" (ص ۴۴۳)

اس قصہ موضوعہ پر تنقید: یہ ہے قبلہ حافظ صاحب کا بیان کردہ مطلب [1] کا ملخص جسے ہم نے حتی الامکان انہیں کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ اس قصہ میں خرقِ عادت تو واقعی کوئی بات نہیں آئی البتہ خلافِ عقل وفکر کئی باتیں آگئی ہیں جیسے کہ حافظ صاحب نے ابتداءً ڈھنڈورا پیٹا ہے پھر کچھ باتیں قرآن کے بھی خلاف ہیں مثلاً :-

---

[1] یعنی کے بیوی بچے ہوں گے وہ رات گھر آجاتے ہوں گے یا انہوں نے وہاں (غار میں ہی) کوئی انتظام کر لیا ہو گا اور ہجرت کی صورت میں وقتی طور پر انہیں چھوڑ گئے ہونگے کیونکہ دنیا بھر کی قوموں میں ان کی حفاظت کا اصول مسلّم ہے لہٰذا کوئی فکر نہیں مناسب موقع پر انہیں بلا لیا ہو گا۔" (انتہیٰ)

(۱)۔ اگر اصحاب کہف اپنی دشمن قوم سے معاہدہ کے تحت رخصت ہوئے تھے تو یہ تو سمجھوتہ کی شکل ہے۔ ہجرت تو نہ ہوئی گویا وُہ سمجھوتہ کے تحت غار میں جا بسے تھے جبکہ قرآن کہتا ہے فَأْوُا اِلَی الکہف یعنی انہوں نے غار میں پناہ لی۔ اب دیکھئے کہ سمجھوتہ اور معاہدہ کے ساتھ کسی دُوسری جگہ جا بسنے کو "پناہ لینا" کہا جا سکتا ہے؟

(۲)۔ وُہ غار کیا تھی ایک پختہ اور وسیع بلڈنگ تھی جس میں روشنی اور ہوا کا انتظام بھی تھا اور وہ خاصی کھُلی بھی تھی تو اس سے بہتر جگہ اصحاب کہف کو اور کیا چاہیئے تھی۔ ایسے آرام وہ تو شائد ان کے اپنے گھر بھی نہ ہوں۔

(۳)۔ پھر یہ غار شہر سے اتنی قریب تھی کہ روزمرّہ کی اشیائے ضرورت اصحاب کہف شہر سے لے جاتے رہے تو اس غار کا شہر والوں کو پتہ نہ چلنا عقلاً محال ہے۔

(۴)۔ اصحابِ کہف نے دُوسرے ہی دن جو اپنا آدمی کھانا لانے کو بھیجا تو اسے تاکید کی کہ نرم لہجہ اختیار کرے۔ "ایسا نہ ہو کہ وُہ لوگ کشت و خوُن پر اتر آئیں"۔ تو کیا ایسی جان کی لاگو قوم کو روزانہ خرید و فروخت کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لوگ تو ہمارے شہر کے پاس ہی بستے ہیں۔ انہوں نے اس قریبی غار میں ان کی رہائش کو کیونکر برداشت کر لیا۔

(۵)۔ اصحابِ کہف سامان کی اُٹھائی دھرائی سے اور غار کی صفائی سے تھک کر سو گئے۔ پھر جب طبعی نیند کے بعد ایک آدھ دن بعد اُٹھتے ہیں تو سب سے پہلے کھانے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ وہ اپنا آدمی شہر بھیج کر کھانا لانے اور نرم لہجہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر انہیں تمہارا علم ہو گیا تو وُہ "تمہارا مدرسہ توڑ دیں گے"۔ یہ مدرسہ کب قائم ہُوا تھا اور کس نے قائم کیا تھا؟ اصحاب کہف تو آتے ہی تھک ہار کر سو گئے۔ پھر اُٹھے تو آدمی کھانا لانے بھیج دیا۔ یہ مدرسہ ان کے سوتے میں راتوں رات یا ایک آدھ دن میں کیسے قائم ہو گیا تھا؟

(۶)۔ اصحاب کہف اپنی قوم سے معاہدہ کے تحت رخصت ہوئے اور غار جو ایک پختہ اور آرام دہ بلڈنگ تھی اس میں قیام کیا۔ یہ شہر سے قریب تھی شہر والوں کو ان کا علم بھی تھا کہ وہاں انہوں نے مدرسہ قائم کر دیا ہے تو ان سب باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوم میں اور اصحاب کہف میں کوئی مخاصمت نہیں تھی بلکہ ان کے تعاون سے مدرسہ چل رہا تھا اور ان اصحاب کہف کے اہل و عیال شہر میں رہتے تھے۔

(۷)۔ باقی رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اصحاب کہف کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ جاگتے ہیں۔ حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ ان کا کتّا چوکھٹ پہ بازو پھیلائے ہوئے ہے اگر تم اس غار میں جھانکو

دیکھو تو دہشت سے بھر جاؤ۔ تو اس ساری آیت کو آپ نے اصحاب کہف کے واقعہ سے کاٹ کر دُنیا دار اور مالدار طبقہ سے منسلک کر دکھایا ہے۔ان کی خواب غفلت سے مُراد گویا سوئے ہوئے"۔ دنیا دار لوگ ہیں۔جنھوں نے کتا کوٹھی کے باہر بٹھا رکھا ہے اور اگر تم ان عالیشان کوٹھیوں کے اندر جھانکو تو دہشت سے ڈر جاؤ۔ اور اصحاب کہف کی تعداد اور اُن کے کُتّے کی بات بھی آج کل یہی کوٹھیوں اور کُتّوں والے ہی کیا کرتے ہیں"۔ کسی شاعر نے کہا تھا ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا   بات پہنچی تری جوانی تک !

اثری صاحب کے تخیّل کی پرواز بھی اس شاعر سے کسی صُورت کم نہیں۔کہاں بات اصحاب کہف کے کُتّے کی ہو رہی تھی۔اس کُتّے کا رابطہ آپ نے کوٹھیوں کے کُتّوں سے قائم کر کے، ان سب کتّوں اور کتّے والوں کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔

(۸) اب آخری آیت (۱۸/۲۱) "اور اسی طرح ہم نے لوگوں کو اصحاب کہف کے حال سے خبردار کیا تاکہ وُہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے قائم ہونے میں کوئی شک نہیں"۔ اس آیت کو اس واقعہ سے علیحدہ کر کے اس کی تاویل یُوں فرمائی ہے کہ یہ آپ کے لئے پروگرام ہے۔ وعدہ یہ ہے کہ اگر تم تبلیغ کرتے رہو گے تو بالآخر تم کامیاب ہو گے اور ساعۃ سے مراد وُہ گھڑی ہے جب تمہیں ہجرت کرنا پڑے گی"۔

رسُول اللہؐ کے لئے پروگرام: اب دیکھئے کہ اصحاب کہف کی ہجرت صرف یہ تھی کہ انھوں نے گھر سے اُٹھ کر ساتھ ہی ایک قریبی غار میں ڈیرہ لگالیا۔ دُوسرے ہی دن اپنی شہر والوں کے ساتھ خرید و فروخت کا رابطہ قائم ہو گیا۔پھر یہ لوگ شہر والوں سے سمجھوتہ کے تحت غار میں آئے تھے۔بس ایک رات گزرنے کی دیر تھی کہ یہی شہر والے آہستہ آہستہ ان کے اتنے معتقد ہوئے کہ ان کے غار پر ایک مسجد بھی تعمیر کر دی تو کیا یہ ہجرت تھی ؟ اور ایسی ہی ہجرت کو رسول اللہؐ کے لئے ایک نمونہ بنا کر انہیں ایسا پروگرام تبایا جا رہا ہے؟

سو یہ ہے آپ کی وہ بے نظیر اختراع جس میں عقل و فکر یا قرآن کے خلاف کوئی بات آپ کو نظر نہیں آئی یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی آپ کی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔آپ نے اس ایک مطلب کے علاوہ ۹ مطلب اور بھی بیان کر کے دس مطلب پُورے کر دیئے ہیں۔ان کو بھی اس پہلے مطلب پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان پر بحث فضول اور باعث طوالت سمجھتے ہوئے ان باقی مطالب کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

۱۳۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اثری صاحب کی کتاب قول المختار دیکھ کر اس بات سے تعجب ہوا کہ اثری صاحب نے رسول اللہؐ کے چند دُوسرے پہلوؤں پر تو قلم اُٹھایا ہے مگر جہاں تک خرقِ عادت امور یا معجزات کا تعلق ہے۔ ایسے معاملات سے قطعاً تعرض نہیں کیا گیا۔ حالانکہ رسول اللہؐ کے جتنی معجزات کسی دُوسرے نبی سے کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں۔ ان معجزات میں سے تین کا ذکر اور ثبوت تو قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور وُہ یہ ہیں:۔

(۱)۔ انشقاق قمر۔ اس کے متعلق اثری صاحب نے کہیں یہ تذکرہ کیا ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں علیحدہ رسالہ تحریر فرمایا ہے۔

(۲)۔ واقعہ اسرا اور

(۳)۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللهَ رَمٰى

علاوہ ازیں احادیث صحیحہ سے بھی معجزات کا ثبوت ملتا ہے مثلاً آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہونا۔ آپ کی تھوک سے کھانے میں برکت، تھوک لگانے سے آشوبِ چشم کی تکلیف جاتے رہنا۔ ستون حنانہ کی گریہ وزاری۔ اُونٹ کا آپ سے شکایت کرنا اور آپؐ کا اس کی بات سمجھنا اور شکایت کا ازالہ کرنا۔ مٹھی بھر کنکریوں کا کلمہ پڑھنا وغیرہ وغیرہ بے شمار معجزات ہیں جن میں سے اثری صاحب نے کسی ایک کا بھی تذکرہ نہیں کیا۔ شاید یہ سلسلہ بہت طویل نظر آیا ہو۔ لہٰذا اثری صاحب نے اس سلسلہ کو نہ چھیڑنے میں ہی عافیت سمجھی ہو۔

باقی جن امور پر آپ نے قلم اُٹھایا ہے، ان میں سے بھی صرف دو چار باتوں کا ہم یہاں تذکرہ کریں گے۔

۱۔ صغر سنی کا نکاح اور حضرت عائشہ صدیقہؓ: کوئی ساٹھ سال پیشتر متحدہ ہندوستان کے دور میں اسمبلی میں ایک بل پیش ہُوا جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ بلوغت سے پہلے کے نکاح پر قانوناً پابندی عائد کر دی جائے تو علماء اسلام نے اس بل کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ اور گو قرنِ اوّل میں صغر سنی کے نکاح کے سلسلہ میں اور بھی بہت سی مثالیں مل جاتی تھیں تاہم حضرت عائشہؓ کا نکاح بالخصوص زیرِ بحث آیا۔ جو لوگ اس بل کے حامی تھے۔ ان میں محمد علی لاہوری مرزائی کا نام بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ دُوسری طرف سید سلیمان ندوی محمد علی کا پورا دفاع کر رہے تھے۔ اور دُوسرے علماء بھی اس میں حصّہ لے رہے تھے اور یہ سلسلہ کافی مدت تک اخبارات و رسائل میں چلتا رہا۔

صحاح ستہ کی معتبر اور بے شمار روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح ان کی عمر کے چھٹے سال کے آخر یا ساتویں سال کے شروع میں ہُوا اور نویں سال بعد از ہجرت مدینہ جا کر رخصتی ہوئی البتہ ایک دو روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن سے رخصتی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر دس یا گیارہ سال بنتی ہے اور یہ اختلاف محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ سنہ ہجری کا باقاعدہ اجراء تو دورِ فاروقی میں ہُوا۔ اس سے پہلے لوگ اپنی یادداشت اس طرح بیان کرتے تھے کہ فلاں واقعہ ہجرت سے اتنے ماہ پہلے یا اتنے ماہ بعد ہُوا۔ اور دُوسری وجہ یہ بھی تھی کہ سنہ نبویؐ کا پہلا سال صرف چار ماہ پر مشتمل تھا یعنی رمضان سے ذی الحجہ تک پھر ۱۲ سال پورے ۱۲ ماہ اور چودھواں سال صرف دو ماہ کا یعنی محرم اور صفر پر مشتمل تھا گویا شمار میں تو یہ ۱۳ یا ۱۴ سال بھی آجاتے تھے مگر اصل مدت ۱۲ سال چھ ماہ بنتی ہے۔ اسی طرح ہجرت کا پہلا سال پونے دس ماہ کا ہے ۸ ربیع سے آخر تک تو اسطرح شمار میں بعض لوگوں کے بیان سے سال ڈیڑھ سال تک کا فرق پڑجاتا ہے۔ ورنہ حقیقت وُہی ہے جو بخاری کی صحیح روایات میں خود حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ انکی عمر بوقت نکاح چھٹے سال کا آخر یا ساتویں کی ابتداء تھی اور رخصتی نو سال کی عُمر میں ہوئی۔

اور محمد علی گروپ جو آپ کی عمر زیادہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل صاحب مشکوٰۃ علامہ خطیب بغدادی کا ایک قول ہے۔ انہوں نے مشکوٰۃ کے آخر میں ایک رسالہ الاکمال فی اسماء الرجال لکھا اس میں جہاں اسماء بنت ابی بکر کا ذکر کیا تو لکھا کہ "وُہ حضرت عائشہ سے دس سال بڑی تھی اور ان کی وفات سو سال کی عمر میں ۷۳ھ میں واقع ہوئی۔ اس سے یہ حساب لگایا گیا کہ جب ہجرت کے وقت حضرت اسماء کی عمر ۲۷ سال ہوئی تو حضرت عائشہ کی عمر ۱۷ سال ہوئی۔ گویا حضرت عائشہ کا نکاح تو پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں ہُوا اور رخصتی ۱۹ سال کی عمر میں۔

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہی صاحب مشکوٰۃ جب حضرت عائشہ کا ذکر کرتے ہیں تو وہی کچھ بیان کرتے ہیں جو احادیث صحیحہ میں مذکور ہے یعنی حضرت عائشہ کا نکاح چھٹے سال اور رُخصتی نویں سال ہوئی۔ گویا محمد علی گروپ کی تردید خود خطیب کے بیان سے ہو گئی۔ اس کے علاوہ بھی چند باتیں ایسی ہیں جو خطیب کے قول کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں پہلی بات یہ کہ انہوں نے اس قول کو قیل سے شروع کیا ہے اور کوئی حوالہ نہیں دیا۔ دُوسری یہ کہ آپ خود آٹھویں صدی ہجری میں یہ رسالہ ترتیب دیتے ہیں۔ جس کی استنادی حیثیت کچھ نہیں۔ لہٰذا ان کے اس قول کو غلط فہمی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم یہی قول محمد علی گروپ کی بحث کی بنیاد قرار پایا۔ اور اس گروپ نے اس قول کی خوب خوب تشہیر کی۔ علاوہ ازیں اسد الغابہ وغیرہ سے چند اور اسی قسم کے غیر معتبر سے اقوال بھی تلاش کر لئے۔

اثری صاحب کا مؤقف: اب اثری صاحب کا مؤقف یہ ہے کہ ان کی تمام تر ہمدردیاں محمد علی گروپ کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے قول المختار میں "نکاح صغیرہ" کے عنوان کے تحت ایسے دلائل کو اکٹھا کر کے پیش کر دیا ہے جو محمد علی گروپ بڑی محنت پیشتر دے چکا تھا اور اس طرح گڑے مُردے کو اُکھاڑنے کا فریضہ پوری دلچسپی سے سرانجام دیا ہے یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ان کا کمال یہ ہے کہ آخر میں اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

"نابالغ لڑکوں کی شادی اکثر علماء کے نزدیک درست ہے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے اپنے نابالغ لڑکوں کی شادی کی ہے مگر میرے نزدیک وہ آثار خطبہ منگنی پر محمول ہیں۔ ان سے نکاح مُراد نہیں (یہ بھی محض اثری صاحب کا خیال ہی ہے) اور نابالغ لڑکیوں کی شادی بالاتفاق درست ہے۔" (ق ص۶۸)

اب اس طرف جو اثری صاحب کا رُخ پھرا تو اب ایسے دلائل دینے شروع کئے کہ گرم ممالک میں بلوغت کی عمر ہی نو سال ہے۔ فلاں عورت اکیس سال کی عمر میں نانی بن گئی اور فلاں انیس سال کی عمر میں نانی بن گئی اب خواہ مخواہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آخر میں اثری صاحب نے یہی کچھ کرنا تھا تو محمد علی گروپ کے دلائل کو دس بارہ صفحات میں بالوضاحت پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مسئلہ متنازعہ میں آخر ان کا مؤقف کیا ہو سکتا ہے؟

۲۔ نبی اُمّی: قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر رسول اللہؐ کو نبی اُمّی کہا گیا ہے۔ اُمّی سے مُراد وہ شخص ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو لیکن یہ بات صرف لکھا ہوا پڑھنے اور اپنے ہاتھ سے لکھنے تک محدود ہے۔ ورنہ جہاں تک علم کا تعلق ہے نہ صرف یہ کہ آپ سارے جہان سے زیادہ عالم تھے بلکہ صحابہؓ کی پاک جماعت کے معلّم بھی تھے۔ چنانچہ عام مسلمانوں کا اس سلسلہ میں یہی مسلک ہے مگر اب کچھ عرصہ سے ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے جس نے سمجھا کہ اگر ہمارا نبی اُمّی ہو تو یہ بڑی اہانت کی بات ہے لہٰذا ہو نہ ہو آپ کو پڑھا لکھا ثابت کرنا چاہیئے۔ اس طبقہ کی بنیادی دلیل یہ آیت ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۹/۴۸)	اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔ ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔

اس آیت کا صاف اور سیدھا مطلب تو یہی ہے کہ آپ کے اُمّی ہونے میں یہ حکمت تھی کہ اہل باطل کے لئے یہ گنجائش نہ رہ گئی کہ وہ یوں کہہ سکیں کہ شاید محمدؐ کوئی سابقہ کتاب پڑھ کر یا کسی دُوسرے شخص سے پڑھ لکھ کر اور سیکھ کر قرآن اور وحی کی بات بنا کر ہمارے سامنے لے آتا ہے لیکن ان دوستوں نے مِنْ قَبْلِهٖ

سے یہ نتیجہ نکالا کہ لکھنے پڑھنے کی نفی صرف نزولِ قرآن سے پہلے کی گئی ہے بعد کی نہیں اگرچہ یہ بنیاد بھی کمزور ہے کیونکہ مِنْ قَبْلِہٖ کی قید کے باوجود زمانہ مابعد میں نفی اور اثبات دونوں کا امکان موجود ہے۔ پھر اس کمزور بنیاد کو اصل بنیاد قرار دیکر اس کے گرد اور بھی کئی کمزور اور خود ساختہ دلائل اکٹھے کر لیئے۔

اب اثری صاحب کا حال یہ ہے کہ آپ نے قولُ المختار میں یہ بحث شروع کر کے پہلے تو اس نظریہ کی بھرپور تائید کی ہے کہ آپ زندگی بھر اُمّی ہی رہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"ہاں بعض ذی علموں کا ایسا ہی خیال ہے کہ جیسے بلوغت کے بعد آپ کا یتیم دور ہُوا ویسے ہی نبوت کے بعد آپ کا اُمّی ہونا بھی ختم ہُوا۔ مگر میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے کیونکہ یتیم محل مدح میں واقع نہیں ہوا جیسے کہ عائل محل مدح میں واقع نہیں۔ اور آپ کا اُمّی ہونا محلِ مدح میں واقع ہُوا ہے اسلیئے اس کا زوال ممکن نہیں"
(ق ص ۱۵۱)

پھر آپ اس اُمیّت کی تین صورتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"بہرحال ہر سہ صورتوں میں دوام ہے۔ لہٰذا یہ وصف لاینفک ہے کبھی زائل نہیں ہو؟ جیسے کہ بیان سے ظاہر ہے۔" (ق ص ۱۵۳)

پھر جب آپ دوسری طرف آتے ہیں یعنی آپ کا لکھا پڑھا ہونا ثابت کرنے پر آتے ہیں تو اس فن میں جو کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ دُوسرے تو اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ آپ نے مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ کرتے وقت ان الفاظ کا اضافہ اپنی طرف سے ہی فرما دیا ہے:۔
"مگر ہاں اب اس کے نزول کے بعد ہمارے فضل وکرم سے تم پڑھنے بھی لگے ہو اور لکھتے بھی لگے ہو۔"
(ق ص ۱۵۵)

۲۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا میں اِکْتَتَبَ کے معنی لکھتے ہیں۔ اِکْتَتَبَ افتعال ہے۔" جس سے خود اپنے ہاتھ سے لکھنا مُراد ہے"۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے جسے اثری صاحب ہضم نہیں کر سکتے۔ اِکْتَتَبَ کے معنی لکھنا، لکھوانا۔ اِملا کروانا۔ لکھنے کی درخواست کرنا (منجد مفردات) ہے۔ گویا یہ لفظ زیادہ تر لکھوانے کے لیئے استعمال ہوتا ہے اگرچہ لکھنے کے معنی میں آسکتا ہے۔ تاہم "اپنے ہاتھ سے لکھنے" کی وضاحت کہاں سے آگئی؟

اب ایک روایت بھی معہ اثری ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ ولا یکتب۔	رسول اللہؐ نے (نبوت سے پیشتر) نہ تو کبھی کچھ لکھا اور نہ لکھا ہُوا کبھی پڑھا۔

دیکھئے اس ترجمہ میں آپ نے "نبوت سے پیشتر" کا اپنی طرف سے اضافہ کر کے مخالف دلیل کو اپنے لیئے دلیل بنا لیا۔

مگر آپ کا یہ سارا مضمون ہی اسی قسم کی گوناگوں تحریفات سے معمور ہے لہٰذا ہم سر دست ان سارے دلائل کو زیر بحث لا کر ان پر تبصرہ تضیع اوقات سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔

۳۔ بلغمی تھوک اور تطہیر و تزکیہ

عروہ بن مسعود ثقفی صلح حدیبیہ کے موقعہ پر قریش کی طرف سے سفیر بن کر آئے اور جب سفارتیات کے اصل مقصد صلح سے ناکام واپس مکہ گئے تو اہل مکہ کے سامنے مسلمانوں کا نقشہ (بروائت بخاری) اس انداز میں پیش کیا:۔

واللہ ما تنخم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخامۃً الا وقعت فی کف رجلٍ منہم فدلک بھا وجھہ وجلدہ واذا امرھم ابتدروا امرہٗ و اذا توضأ کادوا یقتتلون علی وضوءہٖ فاذا تکلم خفضوا اصواتھم عندہٗ وما یحدون الیہ النظر تعظیماً لہٗ۔

اللہ کی قسم جب بھی رسول اللہ علیہ وسلم نے کھنگار پھینکا تو کسی نہ کسی صحابی نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا۔ پھر اسے اپنے منہ اور بدن پر مل لیا۔ اور جب رسول اللہ نے انہیں کوئی حکم دیا تو انہوں نے فوراً تعمیل کی۔ اور جب وہ وضو کرتے تو صحابہ وضو کا پانی حاصل کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتے اور جب وہ بات کرتے تو صحابہ خاموش ہو جاتے اور وہ صحابی تعظیم کی وجہ سے رسول اللہ کی طرف نظریں بھر کر نہ دیکھتے تھے۔

اب اس حدیث سے کھنگار کو بدن پر ملنے والی بات آپ کو بہت ناگوار سی لگی۔ اور اس پر نقد و نظر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

(۱)۔ رسول کا کام تو لوگوں کو پاک کرنا ہوتا ہے اس طرح کھنگار کا ملنا ملوانا یہ کیسی تطہیر ہے۔

(۲)۔ یہ عروہ کا بیان ہے جو اس وقت کافر تھا۔ گویا اس بات میں اس نے مسلمانوں کی خوبی بیان نہیں کی بلکہ ایک قباحت کا ذکر کیا ہے۔

ان دونوں باتوں کے باوجود آپ روایت کو قابل وثوق سمجھتے ہیں۔ انہیں اگر اختلاف ہے تو یہ کہ جو مطلب اس حدیث سے سمجھا گیا ہے وہ غلط ہے۔ آپ نے اس روایت کے دو صحیح مطالب فرمائے جو درج ذیل ہیں:۔

پہلا مطلب: یہ ہے کہ نخاعۃ ازروئے لغت "ہر وہ چیز ہے جو کہ انسان کے حلق بلکہ صدر سے برآمد ہوتی ہے۔ اب خواہ تو وہ لیس دار گاڑھا کھنگار ہے جو کہ کلفت سے باہر آتا ہے یا وہ بہترین کلام ہے جو دل میں پیدا ہو کر زبان سے نکلتا ہے اور مسموع ہوتا ہے"۔ (ب ص۷۹)۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہؐ کے قلبِ مبارک پر جو کچھ ایسی تحریک سے مضمون پیدا ہو کر آپ کی زبان مبارک سے سُنا گیا۔ اسے صحابہ کرام نے اپنے سر آنکھوں پر رکھ کر اس پر فوراً عمل کیا" (ق ص۸۱)

آپ کا بیان کردہ یہ مطلب اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ ہمیں منجد اور منتھی الارب دونوں کتب لغت میں آپ کا بیان کردہ دوسرا معنی "وہ بہترین کلام جو دل میں پیدا ہو کر زبان سے نکلتا ہے" نہیں ملا۔ نخامۃ اور نخاعۃ دونوں الفاظ واقعی ہم معنیٰ ہیں لیکن دونوں کا معنی بلغم یا بلغمی تھوک ناک یا رینٹ ہے جو سینہ یا ناک سے نکلے۔ اسی طرح تنخم یا تنخع کا معنیٰ رینٹ تھوکنا یا ناک جھاڑنا ہے۔ بہترین کلام جو زبان سے ادا ہو کر مسموع ہو کسی لفظ کا معنیٰ نہیں ہے۔ (منجد۔ منتھی الارب)

دوسرا مطلب: اور دوسرا مطلب آپ نے ضمائر کے مرجع کی تبدیلی سے پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ: عام مشہور ترجمہ میں بھا کا مرجع نخامۃ ہے اور وجھہ وجلدہ کا مرجع رجل ہے مگر میرے نزدیک بھا کا مرجع کف ہے اور وجھہ اور جلدہ کا مرجع خود رسول اللہؐ کی ذات گرامی ہے۔ لہٰذا ترجمہ یوں ہوا کہ جو شخص آپ کے قریب ہوتا خادمانہ رنگ میں اپنے رومال میں آپ کی تھوک پکڑ لیتا۔ پھر اس رومال کے دوسرے سرے سے آپ کے ہونٹوں کو بھی صاف کر دیتا"۔ (ق ص۸۰)

یہ ترجمہ اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ اس حدیث میں رومال یا اس طریقہ کے کسی کپڑے کا ذکر تو در کنار اشارہ تک نہیں۔ پھر کف سے مراد ہاتھ میں پکڑا ہوا رومال یا کپڑا لینا درست نہیں اور وجھہ اور جلدہ میں کی ضمیر کا مرجع رجل کے بجائے رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی لینا فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے کیونکہ قریب میں ذکر رجل کا ہے رسول اللہؐ کا نہیں۔ لہٰذا اس کا درست ترجمہ وہی ہے جو عام طور پر مشہور ہے نیز طرزِ بیان سے بھی ظاہری طور پر یہی ترجمہ درست لگتا ہے۔

رسول اللہؐ کا تھوک: اب رہی یہ بات کہ جب تھوک کا جسم پر ملنا بظاہر طہارت کے خلاف ہے تو صحابہ ایسا کام کیوں کرتے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات بھی خصائص انبیاء سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک نبی اور ایک عام آدمی کی بدنی اور طبعی کیفیات میں بھی فرق ہوتا ہے مثلاً:

ایک نبی کا جسم وفات کے بعد مٹی پر حرام ہے۔ وہ اس کے بدن کو کھا نہیں سکتی جبکہ دوسرے کسی آدمی کے جسم کے متعلق یہ ضمانت نہیں۔ اسی طرح نبی جب سوتا ہے تو اس وقت بھی اس کا دل جاگتا رہتا ہے۔ نبی کو

جو خواب آتا ہے وُہ وحی ہوتا ہے۔ نبی کو اگر کبھی احتلام ہو تو وُہ بھی غیر عورت کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ نبی پر صدقہ کی چیز کھانا حرام ہے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جن میں سے اکثر جسم اور اس کی ساخت سے متعلق ہیں لیکن نبی ان میں منفرد ہوتا ہے۔

اب تھوک کے مسئلہ کی طرف آیئے۔ یہ رسول اللہؐ ہی کی تھوک تھی جس کے لگانے سے حضرت علیؓ کی آشوبِ چشم کی شکایت فوراً دُور ہو گئی۔ یہ آپ ہی کی تھوک تھی جس کے لگانے سے زخم اچھے ہو جاتے تھے۔ یہ آپ کی تھوک تھی جس کو سالن کی ہنڈیا میں آپ نے ڈالا تو اس میں اس قدر برکت ہو گئی کہ ہزاروں آدمیوں نے سیر ہو کر کھانا کھا لیا۔ مگر ہنڈیا میں سالن پھر بھی بچ رہا۔ بتایئے اور کسی آدمی کی تھوک میں یہ خصائص ممکن ہیں؟ پھر اس بات کو تو اثری صاحب نے بھی تسلیم فرمایا ہے کہ تھوک پلید نہیں ہوتی۔ پھر اگر حصولِ برکت کی غرض سے صحابہ اس تھوک کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتے تھے۔ تو ہمارے خیال میں صحابہ کا یہ فعل درست ہی نہیں بلکہ مستحسن تھا۔ رہی یہ بات کہ اصل احترام تو رسول اللہ کے احکام کی اطاعت ہے تو اس لحاظ سے بھی صحابہ پیش پیش تھے۔ جیسا کہ حدیث مذکورہ سے بھی واضح ہوتا ہے اور صحابہ کے تھوک ملنے کا عمل اس لحاظ سے جائز یا مستحسن ہے کہ رسول اللہ نے صحابہ کرام کو اس کام سے منع نہیں فرمایا۔

اثری صاحب کا تھوک کے معجزہ سے صاف انکار:

اثری صاحب نے خود قول المختار کے ص۸۵ پر بخاری مسلم کے حوالہ سے یہ حدیث درج کی ہے کہ "رسول اللہ نے گوندھے ہوئے آٹا اور پکتی ہوئی ہنڈیا میں تھوک دیا" پھر ساتھ ہی یہ لکھ دیا کہ "حالانکہ نبیؐ نے اپنے برتن میں پھونک کر پینے بلکہ اس میں سانس لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اور یہاں تھوکا جا رہا ہے"

پھر اس واقعہ کے متعلق آٹے میں اور ہنڈیا میں تھوکنے سے صاف انکار کر دیا فرماتے ہیں کہ:۔

پکتے ہوئے برتن میں اور گوندھے ہُوئے آٹے میں تھوکا نہیں گیا بلکہ اللہ پاک سے استدعا کی گئی ہے کہ وُہ اس تھوڑے کھانے میں برکت عطا فرمائے جیسا کہ بخاری مسلم میں مروی ہے کہ:

"ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ ماشاء اللہ ان یقول الحدیث. رسول اللہؐ نے یہ محسوس فرما کر کھانا تھوڑا ہے۔ اللہ پاک کی جناب میں استدعا کی تو اللہ پاک نے برکت فرما کر اسے پُورا کر دیا۔" (ق ص۸۵)

اس سوال و جواب میں اثری صاحب نے:۔

(۱) پہلے کھانے میں تھوکنے کا اقرار کیا۔ بعد میں انکار کر دیا ہے۔ ایک ہی واقعہ کا ایک ہی وقت میں اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔

(۲) انکار کی وجہ حدیث میں کسی قسم کا نقص نہیں بلکہ اس عام حکم کے تحت انکار کیا ہے کہ مسلمانوں کو کھانے میں

یا مشروب میں پھونک مارنے سے بھی منع کیا گیا ہے اور یہاں تو تھوکا جا رہا ہے گویا ایک عام حکم کو سامنے رکھ کر معجزانہ حیثیت کا انکار کر رہے ہیں جیسا کہ ان کی عادت ہے ۔

(۳) ۔ آپ نے برکت کی وجہ صرف اللہ پاک سے دُعا بتلائی ہے ۔حالانکہ حدیث کے الفاظ ثُمّ قَالَ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آپؐ نے پہلے تھوکا تھا پھر دُعا فرمائی تھی ۔

عُروہ بن مسعود ثقفی : اثری صاحب کا دُوسرا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ اس وقت عروہ بن مسعود ثقفی کافر تھا اسلیئے یہ صحابہ کے اپنے جسم پر تھوک ملنے کی بات بیان کر کے مسلمانوں کی تعریف نہیں کی بلکہ ان کے مذموم پہلو کو سامنے لایا ہے تو یہ اعتراض اس لحاظ سے غلط ہے کہ باقی باتیں جو عروہ نے مسلمانوں اور رسُول اللہؐ کے درمیان تعلق کے بارے میں بیان کی ہیں ۔ وُہ سب صحابہ کی جاں نثاری اور صحابہؓ کے رسُول اللہؐ پر فدا ہونے سے متعلق ہیں ۔ تو آخر یہ پہلی بات ، جس نے عروہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا ، کیونکر بُرے پہلو پر محمول کی جاسکتی ہے ۔

(۴) **رسُول اللہؐ پر جادو کا اثر :** بخاری باب السحر اور اسی طرح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) لبید بن الاعصم یہودی نے (مشرکین مکہ کی انگیخت پر) رسولُ اللہ پر جادو کیا ۔ کنگھی سے سر کے جھڑے ہوئے بالوں پر (جو اس نے اپنی لڑکیوں کی معرفت حاصل کئے تھے) منتر پڑھا ، منتر پڑھتا جاتا اور ساتھ ساتھ بالوں میں گانٹھیں لگاتا جاتا ۔ بعدازاں ان بالوں کو کھجور کے خوشے کے غلاف میں لپیٹ کر ذروان نامی کنوئیں میں رکھ دیا ۔ اس کا آپ پر یہ اثر ہُوا کہ آپ کو بعض دفعہ یہ خیال آتا تھا کہ مَیں فلاں کام کر چکا ہوں حالانکہ کیا نہیں ہوتا تھا ۔ تقریباً چھ ماہ یہی کیفیت رہی ۔ آپ نے اللہ پاک سے دُعا کی ۔ چنانچہ ایک دفعہ خواب میں دو فرشتے آئے اور وہ اسی معاملہ سحر کے متعلق آپس میں سوال جواب کرتے لگے ۔ جس سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ فلاں یہودی نے جادُو کیا ہے اور بالوں پہ منتر پڑھ کر اور انہیں کھجور کے خوشے کے غلاف میں لپیٹ کر ذروان نامی کنوئیں میں رکھ دیا ہے ۔ چنانچہ آپؐ نے چند صحابہ کو وُہ جادو کنوئیں سے نکالنے کے لئے بھیجا ۔ انہوں نے وہاں جا کر دیکھا کہ وہاں کی فضا بڑی دہشت ناک بن گئی تھی ۔ کنوئیں کا پانی مہندی کے رنگ کا سرخ ہو گیا تھا اور کھجوروں کے خوشے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے سانپوں کے پھن ہیں ۔ چنانچہ صحابہؓ نے وُہ جادو کنوئیں سے نکالا جس سے آپ کی تکلیف دُور ہو گئی ۔ آپ نے اس برآمد کردہ جادو کو کسی دوسری جگہ دفن کروا دیا ۔"

اثری صاحب کے اعتراضات : اس حدیث پہ اثری صاحب کو اور اسی طرح ان سے پہلے کے عقل پرستوں کو کئی اعتراض ہیں مثلاً :

پہلا اعتراض یہ ہے۔ کہ جادو چونکہ کفر و شرک کا کام ہے۔ لہذا نبی پر جادو نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر کوئی کرے بھی تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نبی پر جادو کا اثر ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ فرعون کے جادوگروں نے جب ہزارہا لوگوں کے مجمع میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو اس کا اثر مجمع پر یہ ہوا کہ:۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝ (۷/۱۱۶)

جب جادوگروں نے (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں) ڈال دیں تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا (یعنی ان کی نظربندی کر دی) اور انہیں دہشت زدہ کر دیا اور بہت بڑا جادو لائے۔

اس دہشت کا اثر موسیٰ علیہ السلام کے دل پر بھی ہو گیا تھا۔ ارشاد باری ہے:۔

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۲۰/۶۷، ۶۸)

موسیٰ اپنے دل میں ڈر گئے تو ہم نے بذریعہ وحی کہا اے موسیٰ ڈرو مت تم ہی غالب رہو گے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر نبی پر جادو کا اثر تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شریعت ساری کی ساری ناقابل اعتماد ٹھہرتی ہے۔ کیا معلوم کہ نبی کا فلاں کام وحی کے تحت ہوا تھا یا جادو کے زیر اثر؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس جادو کا اثر شریعت کے احکام پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اثر محض آپ کی ذاتی حیثیت تک محدود رہا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ اس وقت تک آدھے سے زیادہ قرآن نازل ہو چکا تھا۔ عرب کے لوگ اس وقت دو متوازی فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ جن میں ایک فرقہ یا تو مسلمان تھا یا مسلمانوں کا حلیف اور دوسرا فرقہ ان کے مخالف۔ اگر اس دوران آپؐ پر جادو کا اثر شریعت میں اثر انداز ہوتا۔ یعنی کبھی آپ نمازہی نہ پڑھاتے یا ایک کے بجائے دو پڑھا دیتے، یا قرآن کی آیات غلط ملط کر کے یا غلط سلط پڑھتے یا کوئی اور کام شریعت منزل من اللہ کے خلاف سرزد ہوتا تو دوست و دشمن سب میں یعنی پورے عرب میں اس کی دھوم مچ جاتی۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کہیں ایک بھی ایسی روایت نہیں ملتی جس میں یہ اشارہ تک بھی پایا جاتا ہو کہ اس اثر سے آپ کے شرعی اعمال و افعال میں کبھی حرج واقع ہوا ہو۔

اور تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کفار کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے۔ کہ وہ انبیاء کو یا تو جادوگر کہتے تھے اور یا جادو زدہ (مسحور) کہتے تھے۔ اگر ہم خود ہی آپ پر جادو اور اس کی

اثر پذیری تسلیم کرلیں تو گویا ہم بھی کفار کے ہمنوا بن گئے۔

یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ کفار کا یہ الزام ہوتا تھا کہ نبی نے اپنی نبوت کے دعویٰ کا آغاز ہی جادو کے اثر کے تحت کیا ہے۔ اور جو کچھ یہ آخرت، قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے افسانے سناتا ہے۔ یہ سب کچھ جادو کا اثر یا پاگل پن کی باتیں ہیں۔ گویا نبوت اور شریعت کی تمام تر عمارت کی بنیاد جادو قرار دیتے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ واقعہ آپ کی نبوت کے بیس سال بعد پیش آتا ہے جبکہ آدھا عرب آپ کی نبوت اور احکام شریعت کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان رکھتا تھا۔ پھر یہ واقعہ احکام شریعت پر بھی چنداں اثر انداز نہیں ہوا۔ البتہ اس واقعہ سے اس کے برعکس یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ آپ ہرگز جادوگر نہ تھے۔ کیونکہ جادوگر پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔

اثری صاحب کی تاویل: اثری صاحب نے دوسرے عقل پرستوں کی طرح اس حدیث کا انکار تو نہیں کیا البتہ حسب عادت ضمائر کے مرجع بدل کر نئی تاویل پیش کر دی ہے۔

حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

سحر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلٌ من بنی زریق یقال لہ لبید بن الاعصم حتی کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخیل الیہ انّہٗ یفعلُ الشیٔ وما فعلہٗ (بخاری باب السحر)	بنی زریق کے ایک آدمی مسمّی لبید بن الاعصم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا حتیٰ کہ آپ کی یہ حالت ہوگئی کہ آپ خیال کرتے تھے کہ آپ نے کوئی کام کیا ہے اور کیا نہیں ہوتا تھا۔

اس حدیث میں اثری صاحب یخیل الیہ میں ہ کی ضمیر کا مرجع لبید بن الاعصم کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ نکالتے ہیں کہ لبید کا خیال تھا کہ وہ جادو کے ذریعہ کوئی کارنامہ سرانجام دے گا مگر اس کے اس جادو کا خاک بھی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے مشن میں ناکام رہا۔

یہ تاویل اگرچہ بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ حدیث کی عبارت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ ایک تو فصاحت کے لحاظ سے ضمیر کے قریب کا مرجع بعید سے بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ کو چھوڑ کر لبید بن الاعصم کو مرجع قرار دینا درست نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ پر جادو کا کوئی اثر نہ ہوا اور نہ ہی انہیں کسی طرح سے معلوم ہوا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے۔ تو وہ لبید کے متعلق یہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ یہ شخص کچھ نقصان پہنچا دے گا؟

باب ۱۲

خصوصیات کلام

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہلے سے ایک عقیدہ یا نظریہ ذہن میں قائم کر کے قرآن کو اس کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں پھر جب قرآن اس سانچے میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اسے مشقِ ستم بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ قرآن اُمت کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور یہ رہتی دُنیا تک امام الھُدیٰ ہے لہٰذا کسی ملحد کا الحاد یا زندیق کی زندیقیت اور تحریفِ معنوی قرآن پر کوئی دیرپا نقش نہیں چھوڑ سکتی۔ ایسا ملحد و زندیق ہمیشہ خاسر و ناکام رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ و فکر کے بطلان کے لئے ناطق ہوں گے بلکہ مصداق 'دروغ گو را حافظہ نباشد' وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیوں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افتراء پر مہر لگا دیتا ہے۔

اس مقام پر ہم اثری صاحب کی تاویلات و تحریفات کی چند خصوصیات کا تذکرہ کریں گے جو اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) یہ بھی — اور — وہ بھی

اثری صاحب بعض دفعہ اس طرح کے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ پہلے تو کسی ایک نظریہ کی پُرزور تائید کرتے چلے جاتے ہیں پھر خود ہی اس کی تردید بھی شروع کر دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اپنے کئے کرائے پر خود ہی پانی پھیرنے لگے ہیں۔ اب اس کی چند ایک مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱) تخلیقِ آدم: تخلیقِ آدم کے متعلق دو نظریئے زیادہ تر رائج ہیں۔ ایک نظریہ مادیئین۔ فلاسفروں اور عقل پرستوں کا ہے جو انسان کو ارتقاء کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ یعنی زندگی مختلف قسم کے جانداروں سے ہوتی ہوئی حیوانات میں آئی اور حیوانات سے ترقی کر کے بندر اور چمپنزی کے ذریعے انسان میں داخل ہوئی۔ بالفاظِ دیگر انسان بندر کی اولاد ہے۔ آدم کسی مخصوص انسان کا نام نہیں ہے بلکہ آدم سے مُراد ہی نوعِ انسان کا نمائندہ ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا پھر اس میں رُوح پھونکی تو یہ جیتا جاگتا

انسان اوّل یا آدم بن گیا۔ پھر اسی آدم سے حوّا کو پیدا کیا گیا۔ پھر اس جوڑے سے انسان کی نسل چلی۔ تمام مذہبی حلقے اسی نظریئے کے قائل ہیں۔

اس مسئلہ میں اثری صاحب سخت ذہنی انتشار میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ سرسیّد سے سخت متاثر ہیں اور سرسیّد انسان کی ارتقائی تخلیق کے قائل تھے۔ چنانچہ آدمؑ کے بیان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ وُہ لکھتے ہیں "پھر جو تم میں آدم نامی بزرگ تھے ......" (ب ص۱۷)

علاوہ ازیں اس بات کا حوالہ پیش کرتے ہیں کہ جب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس وقت لاکھوں انسان موجود تھے۔ آدمؑ کو وہ ابوالبشر اس لئے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ وُہ حوّا کے باپ نہیں حالانکہ حوّا بھی بشر ہے ..... وغیرہ وغیرہ۔ غرض آپ نے سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ وہ آدم کو ایک خاص تخلیق کے زمرہ سے خارج کر دیں۔

یہ سب دلائل تو آپ نے عقل پرستوں کی ہمنوائی میں دے دیئے لیکن تعجب ہے کہ ان دلائل سے پہلے آپ خود ہی یہ بیان بھی دے رہے ہیں کہ:۔

"آدمؑ کی پیدائش کا ذکر قرآن میں مفصّل طور پر موجود ہے آپ سے پیشتر کوئی انسان دُنیا میں پیدا نہیں ہُوا۔ آپ کی پیدائش سب انسانوں سے پہلے ہوئی" (ب ص۱۶-۱۷)

پھر آپ عیون زمزم کے ص۸۹ پر جو بیان دیتے ہیں اس میں پھر ذہنی انتشار کی جھلک واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"آدم (پہلا پیدا شدہ انسان) کے لئے اتنا بلکہ کچھ بھی بیان نہ ہوتا تو وُہ بے مادر و پدر تسلیم ہوتا۔ نہ صرف وُہ بلکہ وہ تمام انسان جو ابتدا میں پیدا ہوئے۔ بلکہ تمام حیوانات، چرند، پرند اور درند اور سب حشرات الارض ابتدا میں بے مادر و پدر پیدا ہُوئے ہیں۔ اس کی تسلیم مجمل ہو یا کہ مفصّل بیان پر موقوف نہیں کہ سلسلہ کی ابتداء اس کے سوا ممکن ہی نہیں" (ع ص۸۹-۹۰)

اس اقتباس کو پڑھ کر آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ:۔

۱۔ آدم پہلے انسان تھے یا نہیں؟

۲۔ صرف آدم ہی بے مادر و پدر پیدا نہیں ہُوئے بلکہ اور بھی بہت سے انسان جو ابتدا میں پیدا ہوئے سب بے مادر و پدر ہی پیدا ہوئے۔

۳۔ پھر یہ بات انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ سب چرند پرند اور حشرات الارض جو ابتدا میں ہُوئے بے مادر و پدر پیدا ہوئے۔ پھر آدمؑ کی کیا تخصیص ہے۔

(۴)۔ آدم (اور اسی طرح دُوسرے انسانوں اور حیوانات کو جو ابتدا میں پیدا ہوئے) کو بے مادر و پدر ماننا اس لئے ضروری نہیں کہ قرآن و حدیث میں ایسا ذکر ہے بلکہ اس لئے ضروری ہے کہ عقلی لحاظ سے سلسلہ کی ابتداء اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اثری صاحب آدمؑ کو فی الواقع ابوالبشر سمجھتے ہی نہیں۔ تو ہم تو یہ بات سمجھنے سے قاصر ہی رہے شاید آپ کچھ سمجھ سکیں۔

تخلیقِ آدم کے متعلق ایک حدیث اور اس کا جواب: آپ بطرز سوال ترمذی کی ایک مرفوع حدیث پیش کرتے ہیں کہ "النّاسُ کُلُّھم بنو آدمَ وآدمُ مِنْ تُرابٍ (یعنی تمام لوگ آدمؑ کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے) اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب انسان آدمؑ کی اولاد ہیں"! (ب ص ۱۹)

پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"مذکورہ حوالہ میں اولاد کا ذکر نہیں اور نہ ہی بنات کا ذکر ہے۔ پس جس طرح وہ تغلیباً اسی میں شامل ہیں۔ اسی طرح یہ تمام انسان اس میں شامل ہیں کیونکہ جنس ایک ہے"! (حوالہ ایضاً)

یہ جواب بار بار پڑھیے اور بتلائیے کہ آدمؑ ابوالبشر تھے یا نہیں؟ آپ اس جواب سے کیا سمجھے؟

۲۔ تکلّم فی المھد: قرآن میں حضرت عیسٰیؑ کے تکلّم فی المھد کا ذکر آیا ہے۔ اور حدیث (متفق علیہ مرفوع) میں عیسٰیؑ کے علاوہ دو اور بچوں کے گھوارے میں کلام کرنے کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے صاحب جریج کا ذکر اثری صاحب نے عیون زمزم میں دو مقامات پر کیا ہے اور ہر جگہ ہر بچہ کا گھوارہ میں بولنے کا پورے شد ومد سے انکار کیا ہے۔ یہی وہ مشکل تھی جو سر سیّد کے آڑے بھی آئی اور امام الدین گجراتی کے بھی اور اثری صاحب یہی فرماتے رہے کہ جو مشکل سر سیّد اور امام الدین گجراتی کو درپیش ہے۔ وہ میری راہ میں حائل نہیں۔ چنانچہ اثری صاحب نے اس مشکل کا حل یہ سوچا تھا کہ فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ میں ہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسٰیؑ کو قرار دینے کے بجائے حضرت زکریا علیہ السلام کو قرار دیا اور اس طرح حضرت عیسٰیؑ کو گھوارے میں کلام کرنے سے بچا لیا پھر تکلّم فی المھد کے آٹھ دس بے سر و پا مطالب بیان کر دیئے جن میں سے بعض کا ذکر عیون زمزم میں ہے اور بعض کا بیان المختار میں۔ اب حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد آپ بیان المختار کے سب سے آخری مطلب ۶ (ص ۳۸۶) میں یہ بیان بھی دے دیتے ہیں کہ:۔

"آپ (عیسٰیؑ) نے خود بھی اپنی ماں کی گود اور گھوارہ میں لوگوں سے کلام کیا ہے جسکی ازالہ اتہام کیلئے

ضرورت پڑی تھی. اسی طرح پر بعض دیگر بچوں نے بھی کلام کیا ہے جیسے کہ حدیثوں میں مذکور ہے۔ اگرچہ یہ کلام کا وقت نہیں مگر بچہ محل کلام ضرور ہے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں" (ب ص ۳۸۶)

اب سوال یہ ہے کہ اگر آپ نے بالآخر یہ بات تسلیم کر لینا تھی تو اتنے لمبے چوڑے مناقشہ کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا یہ جتلانا مقصود ہے کہ آپ تاویل اور مختلف مطالب بیان کرنے کے فن میں کس قدر ید طولیٰ رکھتے ہیں؟

(۳) صغر سنی کا نکاح اور حضرت عائشہؓ: اس سلسلہ میں لوگ دو قسم کے نظریات رکھتے ہیں۔ ایک وُہ جو حضرت عائشہ کی عمر روایات صحیحہ کے مطابق بوقتِ نکاح چھ یا سات سال اور بوقتِ رخصتی ۹ سال تسلیم کرتے ہیں اور دُوسرے وُہ جو ادھر ادھر کی کچھ کمزور سی روایات کا سہارا لے کر حضرت عائشہ کی عمر بوقتِ رخصتی ۱۹ سال یا اس کے لگ بھگ ثابت کرتے ہیں۔ اثری صاحب ان دونوں گروہوں کو خوش رکھنا چاہتے ہیں اور دونوں کے لیئے اپنی طرف سے دلائل مہیا کرتے جاتے ہیں اور غالباً وُہ خود بھی کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے کہ انہیں کس فریق کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس قصہ کو ہم نے پچھلے باب میں ذرا تفصیل سے پیش کر دیا ہے.

(۴) نبی اُمّی: اسی طرح کا ایک دُوسرا مسئلہ رسول اللہ کے اُمّی ہونے کا ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو قرآن میں متعدد بار اُمّی کے لفظ سے پکارا ہے۔ اُمّی کا معنیٰ جاہل نہیں بلکہ ایسا شخص ہے جو لکھا ہُوا پڑھ نہ سکے یا خود اپنے ہاتھ سے لکھ نہ سکے۔ تاہم کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہمارے نبی کا اُمّی ہونا ہمارے سلئے باعثِ اہانت ہے لہٰذا انہوں نے ایسے دلائل تلاش کرنا شروع کر دیئے جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ رسول اللہ نبوت عطا ہونے کے بعد لکھنے پڑھنے لگ گئے تھے۔

۲۔ اس معاملہ میں بھی اثری صاحب دونوں گروہوں کی تائید کرتے جاتے ہیں جیسا کہ پچھلے باب میں ہم قدرے تفصیل پیش کر چکے ہیں۔ آپ کے ایسے بیانات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اثری صاحب کو محض دلائل مہیا کرنے کی لگن ہے، طرف خواہ کوئی بھی ::

(۲)- دقیق اور اُلجھے ہُوئے جوابات

اگر قرآن میں کسی خرقِ عادت امر یا معجزہ کا ذکر ہو اور بالخصوص اس صُورت میں کہ حدیث اس امر کی مزید وضاحت پیش کر رہی ہو تو اس وقت اثری صاحب کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے کیونکہ آپ کی ذہنی افتاد قرآن وحدیث کے عین مخالف سمت میں ہوتی ہے۔ اس وقت آپ مصلحت اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ مشکل سے مشکل اندازِ بیان اختیار کر کے قاری کو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر آگے چلتے بنیں۔ اندریں صُورت کبھی آپ ضمیروں کو کبھی اِدھر مروڑتے ہیں، کبھی اُدھر۔ کبھی کوئی فلسفہ بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ نہیں تو الفاظ ہی ایسے مغلق استعمال کرتے ہیں کہ قاری کے پلّے کچھ پڑے نہ پڑے وہ کم ازکم یہ سمجھنے لگے کہ حافظ صاحب نے سوال کا جواب کچھ نہ کچھ دے ضرور دیا ہے۔ اب انکی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ اور آگ: حضرت ابراہیمؑ کو کفار نے آگ میں ڈال دیا تو اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ "ابراہیمؑ کے لیئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا" اب یہ بات تو عقل پرست کبھی تسلیم کر ہی نہیں سکتے کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں داخل بھی ہو جائیں۔ پھر آگ جلانے کا کام نہ کرے۔ لہٰذا سرسیّد نے تو صاف کہہ دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کے مشورے ضرور ہوتے رہے مگر ڈالے نہیں گئے۔ اثری صاحب نے بھی کئی پینترے بدلے۔ کبھی کہتے ہیں ممکن ہے کہ یہ اصل آگ ہی نہ ہو بلکہ کفار کے فتنہ و فساد کی آگ ہو۔ کبھی کہتے ہیں کہ شاید آگ میں پڑے نہ ہوں۔ لیکن بخاری کی مرفوع حدیث میں وضاحت سے حین اُلقی فِی النَّار کے الفاظ موجود ہیں تو حافظ صاحب کے لیئے سرسیّد سے زیادہ دقت پیدا ہو گئی اور اثری صاحب نے اس بات کا جواب یُوں دیا کہ:

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سچ مچ انہوں (کافروں) نے آگ میں جلانے کا ارادہ کر لیا۔ اور اُلقی فی النّار.... الحدیث سے بھی پیدا شدہ خطرناک حالات کے مصاوفت مُراد ہے کہ کام بالکل تیار تھا مگر اللہ پاک نے آپ کو بال بال بچا لیا" (ب ص ۱۱۵)

اب دیکھئے اثری صاحب نے حدیث کا لحاظ بھی فرمایا ہے اور مصاوفت (یعنی ایک دوسرے سے پڑے رہنا) بیان کر کے حضرت ابراہیمؑ کو بال بال بچا بھی لیا ہے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ آگ کی خصوصیت میں اللہ کے حکم سے تبدیلی کی وجہ سے آگ سے نہ بچ سکتے تھے بلکہ حافظ صاحب قبلہ کی اس بے دلیل مصاوفت کی وجہ سے بال بال بچے تھے۔

۲۔ ذبحِ عظیم: اثری صاحب اس بات کے قائل نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب آیا کہ میں اپنے فرزند کو ذبح کر رہا ہُوں اور یہ کہ خواب گویا اللہ کا حُکم تھا حالانکہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے اور قدیم و جدید مفسرین سب کی تفسیروں سے بھی یہی کچھ معلوم ہوتا ہے مگر اثری صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ خواب میں صرف حلق پر چھُری رکھنا دکھلایا گیا تھا۔ لہٰذا اتنا ہی کام ظاہری طور پر کرنے کا حضرت ابراہیمؑ کو اشارہ ہُوا اور نہ ہی اس میں حضرت ابراہیمؑ یا اسمٰعیلؑ کی آزمائش کی کوئی بات تھی۔ کیونکہ اللہ نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا ہُوا تھا کہ بس ایک دفعہ حلق پر چھُری رکھ دینی ہے۔ آگے کچھ نہیں کرنا۔ آگے میں جانوں میرا کام۔ چنانچہ اثری صاحب حضرت ابراہیمؑ کے خواب والی آیت کا ٹھیک مطلب پیش کرتے وقت اپنے مافی الضمیر کا اظہار یُوں فرماتے ہیں:۔

"جب وُہ اپنے باپ کے ہمراہ بھاگ دوڑ اور کام کاج کرنے لگا تو باپ نے ایک روز اس سے بیان کیا کہ میرے چھوٹے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہُوں تو بھی سوچ کر بتا کہ اس کی تعبیر کیا ہے اور اس میں تیری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے فی البدیہہ عرض کی کہ "ابا جان! جو کچھ آپ کو خواب میں اشارہ ہُوا اس کی ظاہری طور پر تو ابھی تعمیل کر دیں۔ پھر جب اللہ پاک اس کا صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر سمجھائے گا تو اگر اس میں میری جان کی بھی ضرورت ہوئی تو میں اس کے لیئے ہر طرح سے تیار ہوں۔۔ مجھے پھر بھی کوئی انکار نہیں۔" (ب صفحہ ۱۲۷)

اس مطلب کو بار بار پڑھ کر بتلایئے کہ خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہُوا تھا یا نہیں؟ یا اس حکم سے ان دونوں نے کیا سمجھا؟

۳۔ ستاروں کا سجدہ: سورۂ یُوسفؑ کے ابتداء میں ذکر ہے کہ حضرت یُوسفؑ کو خواب آیا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ اب اس میں دو مشکل امر ہیں ایک تو سجدہ کرنے والے ستارے ہیں جو بے جان بھی ہیں اور بہت بلند بھی دُوسرے یہ کہ وہ سجدہ اللہ کو نہیں بلکہ حضرت یُوسفؑ کو کر رہے ہیں۔ تو اس مقام پر آیت متعلقہ کا جو مطلب اثری صاحب نے بیان فرمایا وہ قابلِ دید بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ آپ ایک سوال اُٹھاتے ہیں کہ ستارے تو بلند ہوتے ہیں ان کا سجدہ کیسے معلوم ہوا؟ پھر جواباً فرماتے ہیں:۔

"گویا آپ کنوئیں میں پڑے (واضح رہے اس خواب دیکھنے کے بہت مدت بعد کنوئیں میں پڑے تھے) اُوپر کو اور بھائی اُوپر ہوکر نیچے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کنوئیں میں دیکھا جاتا ہے اور ماں باپ بھی سطح زمین پر تھے اور یہ ابتدائی کیفیت ہے جو کہ دکھائی گئی مگر اس میں سجدہ کا ذکر نہیں۔ پھر ضمیر پھیر کر سجدہ کا ذکر

فرمایا جو کہ آخری کیف ہے کہ وُہ تشکر کے طور پر جناب الٰہی میں سربسجود ہو رہے ہیں؟ (ب ص ۱۴۸)

آپ اس اقتباس کو بار بار پڑھ کر بتایئے کہ "ستارے تو بلند ہوتے ہیں ان کا سجدہ کیسے معلوم ہوا؟" اس سوال کا کچھ آپ کو جواب ملا؟ پھر اس خواب کی تعبیر میں ابتدائی کیف' اور ضمیر پھیرنے سے آپ کیا سمجھے؟ نیز یہ بھی بتلایئے کہ سجدہ ستاروں نے کیا تھا یا بھائیوں نے اور یوسف کو کیا تھا یا خدا کو؟ اور کیوں؟ اس سوال کے جواب کے لیئے آپ کو اثری صاحب کے بیان سے کیا رہنمائی ملی؟

(۴) یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں: حضرت یونسؑ کے متعلق بوضاحت قرآن کریم میں ہے کہ مچھلی نے انہیں نگل لیا۔ پھر کچھ مدت بعد ساحل پر آپ کو اُگل دیا۔ پھر ایک صحیح حدیث میں یونسؑ کے متعلق یہ الفاظ "اِذْ هُوَ فِیْ بَطْنِ الْحُوْتِ" اس معجزہ کی تائید مزید کرتے ہیں۔ لیکن اثری صاحب اپنے قائم کردہ عقیدہ کے مقابلہ میں قرآن و حدیث کو کیا سمجھتے ہیں۔ وہ کیونکر تسلیم کریں کہ یونسؑ فی الواقع مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ قرآنی آیات پر تاویلات کے ذریعہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اگر حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا (گویا اذھو فی بطن الحوت سے بھی آپ کو صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا) تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس سے مچھلی کے پیٹ میں چلے جانا ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ فی بطن الحوت جار مجرور مل کر ساقط کے متعلق ہے جو کہ ھُوَ مبتدا کی خبر محذوف ہے کہ وُہ مچھلیوں کے پیٹ میں گرنے کو تھے کہ اس مضمون پر تقریر فرمائی تو اللہ پاک نے ان کے لئے آسانی پیدا کر دی جیسے کہ میں بیان کر آیا ہوں۔" (ب صـ ۲۴۷)

اس اقتباس کو پڑھ کر بتایئے کہ اثری صاحب حوت کا معنیٰ ہر جگہ "مچھلیاں" کیوں کرتے ہیں اور نیز جو جار مجرور کو ملا کر ساقط محذوف تلاش کیا ہے۔ ان کے ذہن کے سوا اس کی کوئی دلیل بھی ہے؟ اگر ہم مچھلی کے پیٹ میں جانے کا مفہوم عربی میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے کیا الفاظ ہونے چاہئیں؟

(۵) گہوارے میں کلام: حضرت عیسیٰؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'ویکلم النّاس فی المهد وکھلاً'۔ یعنی وہ گہوارے میں بھی ایسے ہی لوگوں سے باتیں کریں گے۔ جیسے بڑی عمر کے ہو کر کریں گے۔ اب اثری صاحب بھلا یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ کوئی بچہ گہوارے میں باتیں کرے۔ لہٰذا اس آیت کی جو تشریح فرمائی وہ لاجواب ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"مہد میں کہل ہو سکتا ہے تو اس کے برعکس کہل میں بھی مہد ہو سکتا ہے جیسے کہ میری تفسیر سے ظاہر ہے کہ یکلم النّاس کَهْلاً ویَعِظُهُمْ فی احکام المَهْدِ" (ع صـ ۱۲۸)

اب آپ بتائیے کہ مہد میں کہل یا پنگھوڑے میں بڑھاپا ہو سکتا ہے یا اس کے برعکس کہل میں مہد یا بڑھاپے میں پنگھوڑا ہو سکتا ہے ؟ یا جو شخص ایسی باتیں کرتا ہو اُسے آپ بقائمی ہوش و حواس سمجھ سکتے ہیں ؟ پھر جب یہ مفروضے ہی غیر مسلّم اور مجنونانہ باتیں ہیں تو ان سے اخذ کردہ نتیجہ کیسے درست ہو سکتا ہے ؟ بہرحال آپ نے اس منطق سے یہ ثابت کر دیا کہ عیسیٰ نے گہوارے میں گفتگو نہیں کی تھی۔

(۶) مثیلِ آدم: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ ۔ اس آیت سے نیز دُوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ اور آدم میں یہ مثلیت یا وجہ مماثلت یا ان دونوں میں قدرِ مشترک، ان دونوں کی بن باپ پیدائش ہے۔ لیکن یہی بات اثری صاحب کے لیئے زندگی موت کا سوال ہے لہٰذا انہوں نے یہ اصل وجہ مماثلت چھوڑ کر کچھ دُوسری وجوہ تلاش فرمائی ہیں چنانچہ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں :۔

"اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱ (آدمؑ و عیسیٰؑ) ترابی خاکی مخلوق ہے۔ ناری یا نوری نہیں ۱ کثیف ہے ۲ لطیف ہے اور ۳ بہت ہی لطیف ہے اور اللہ اس سے بھی کہیں زیادہ لطیف و بلاکیف ہے تو جب ۳ بھی اس کی مثل نہیں تو ۱ کیسے اس کی مثل ہو" (ع صہ ۹۱)

یہ اقتباس بار بار پڑھ کر بتلائیے کہ اللہ پاک نے عیسیٰؑ کو آدم کا مثیل کس لحاظ سے قرار دیا ہے ؟ کیا اس بات کا کہیں جواب آیا ہے ؟ اس اقتباس سے زیادہ سے زیادہ وجہ مماثلت یہی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے آدم ترابی خاکی مخلوق ہے۔ ویسے ہی عیسیٰؑ بھی ہیں مگر یہ مماثلت تو آدم اور تمام بنی آدم میں پائی جاتی ہے اس میں صرف عیسیٰؑ کی کیا تخصیص ہوئی۔

(۷) تخلیقِ آدم: ترمذی کی ایک حدیث الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب (یعنی سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھے) کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مذکورہ حوالہ میں اولاد کا ذکر نہیں اور نہ ہی بنات کا ذکر ہے۔ پس جس طرح وہ تغلیباً (؟) اس میں (کس میں ؟) شامل ہیں۔ اسی طرح یہ تمام انسان اس میں (کس میں؟) شامل ہیں کہ جنس ایک ہے۔" (ب صہ ۱۹)

بتلائیے اس سوال و جواب سے کیا سمجھے آپ ؟ بریکٹوں میں جہاں جہاں سوالیہ نشانات ہیں۔ ان کا اصل مفہوم تلاش کیجئے ؛ بتلائیے کہ کیا آدم ابُوالبشر تھے یا نہیں ؟

ضرورت تھی؟ راشن کارڈ بننے کے بعد تو ایک آدمی بھی سب کا غلہ لا سکتا ہے اور باربرداری کے لئے (بقول اثری صاحب) شتربان ہر وقت موجود ہوتے تھے۔

پھر اثری صاحب کے اس ڈپوسسٹم کی تردید خود ان کے اپنے بیان سے بھی ہو جاتی ہے جب وہ پیمانہ گم کرتے ہیں تو کسی غلہ منڈی کا منظر پیش کرکے پیمانہ وہاں منڈی سے گم کرتے ہیں کسی راشن ڈپو سے نہیں کرتے۔

(۳) مصر کی عدالتیں: مصر میں جس طرح جنگل کا قانون رائج تھا۔ اس کی کچھ تفصیل ہم اس کے اصل مقام پر پیش کر چکے ہیں کہ وہاں امرائے مصر کو ظالمانہ قسم کے اختیارات حاصل تھے جس امیر نے جس کسی بیگناہ کو چاہا قید میں ڈال دیا۔ کوئی مقدمہ نہیں سماعت نہیں۔ فردجرم کی بات نہیں۔ قید کی مدت کی تعیین نہیں اور قیدیوں کو اپیل اور مقدمہ کی پیروی کا کوئی حق نہیں۔ یہ سب باتیں قرآن سے ثابت ہیں۔ لیکن اثری صاحب وہاں موجودہ دَور کی طرح چھوٹی عدالتیں اور عدالتِ عالیہ قائم کرتے، وکالت کا حق دیتے، فوجداری مقدمہ میں اصالتاً پیش ہونے کا قانون بتلاتے اور بنیامین پر ان کے اپنے قائم کردہ مقدمہ کو انہی عدالتوں سے بے جان بنواتے ہیں۔ اس دَور کے مصری قانون سے متعلق آپ کا ایسا تبصرہ تاریخی لاعلمی کی دلیل ہے۔

(۴) حضرت سلیمان اور ہوائی اڈے: اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا۔ اور یہ ان کا معجزہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے دَور کے سب آدمیوں کے لیئے ہوا کو مسخر نہیں کیا تھا کہ حضرت سلیمان کی کوئی خصوصیت ظاہر نہ ہو۔ لیکن اثری صاحب کچھ ایسا ہی چاہتے ہیں فرماتے ہیں:۔

"ہم نے ایسے تیز رفتار ہوائی جہازوں کا اضافہ بھی کر دیا جو کہ دو مہینوں کے سفر کی پیدل آمدورفت کی مقدار تک کسی طرف پہلے پہر روانہ ہوتے اور پچھلے پہر واپس بھی اپنے ہوائی اڈہ پر اترتے تھے۔" (ب ص۲۹۳)

گویا اس زمانہ میں ہوائی جہاز بکثرت تھے اور چونکہ ان کے ہوائی اڈے بھی تعمیر ہو چکے تھے۔ لہٰذا عام لوگ بھی ضرور ہوائی سفر اختیار کرتے ہوں گے۔ اس سے حضرت سلیمان کے لیئے ہوا کے مسخر ہونے کی اعجازی حیثیت تو ختم ہو گئی مگر مشکل یہ ہے کہ ہوائی جہاز ۱۹۰۳ء میں ایجاد ہوتا ہے۔ اس کا موجد ولبرائٹ اور اس کا ساتھی ہے۔ اس سے پہلے ہمیں دُنیا کی تاریخ میں نہ کوئی ہوائی جہاز اُڑتا نظر آتا ہے اور نہ ہی کوئی ہوائی اڈا دکھائی دیتا ہے۔ سوائے حضرت سلیمان کے اس تخت یا ان بحری بیڑوں جن کیلئے ہوا کو مسخر کر دیا گیا تھا۔ حضرت سلیمان کا زمانہ خلافت ۹۶۵ تا ۹۲۶ ق م ہے۔ گویا اثری صاحب نے ہوائی جہاز

کی ایجاد سے ۲۹۰۰ سال پہلے ہوائی جہاز بھی اُڑائے اور ہوائی اڈے بھی تعمیر کر دیئے۔

(۵) عہدِ سلیمانی (۹۶۵ ق م تا ۹۲۶ ق م) میں جمہوریت کی بہاریں:

اثری صاحب وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا کی ٹھیک تعبیر کرتے ہُوئے فرماتے ہیں:

"اگرچہ سُلیمانؑ نے اپنے عہد میں حکومت کو مستحکم کیا ہُوا تھا۔ تاہم مخفی بغاوت اندر ہی اندر جاری رہی ایک بے دین چالاک سیاسی لیڈر اس کوشش میں تھا کہ ایک آزاد جمہوری حکومت قائم ہو۔ جس سے اسلامیات خارج ہوں۔ یہ شخص قانون شکنی کی صُورت میں نہیں بلکہ حق طلبی کی صورت میں خناس بن کر اپنا مطلب بیان کرتا تھا۔ اس لئے کئی ایک اس کے ہمخیال ہو گئے اور جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کی ٹھان لی۔ اب سلیمانؑ شش و پنج میں پڑ گئے کہ اگر گرفتاری شروع کردں تو رعایا میں ہیجان پیدا ہوگا اور اگر خاموش رہوں تو تحریک پھیل کر ملک تباہ ہوگا۔" (ب ص ۲۸۱)

اور حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد جو الیکشن ہوئے ان کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:۔

"جب ہم نے سلیمانؑ کو وفات دے دی تو کچھ دنوں تک ملک کا انتظام و انصرام ان کے طریقہ پر بدستور چلتا رہا۔ پھر جب نیا قانون بنا کر نافذ کیا گیا اور جدید انتظامات شروع ہو گئے تو ملک چونک پڑا کہ یہ کیا ہُوا۔ ہم تو موجودہ حکومت کے ظالمانہ رویہ سے مصیبت میں پڑ گئے۔ اگر ہمیں انتخابات کے وقت ہی معلوم ہو جاتا تو اس کے لیئے بھاگ دوڑ کر ووٹ پیدا نہ کرتے بلکہ تمام محکموں اور کارخانوں میں ہڑتال اور جلسوں جلوسوں اور قرار دادوں کے ذریعہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے کہ ہمیں ایسی حکومت منظور نہیں۔" (ب ص ۲۹۰)

اثری صاحب کے دَور میں جس قسم کی جمہوریت اور اس کے دھندے تھے۔ یعنی ہڑتالیں، جلسے، جلوس، ووٹ، ان کی بھاگ دَوڑ وغیرہ۔ اثری صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ سب کچھ بھی آدمؑ سے بدستور چلا آ رہا ہے۔ انہیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس جمہوریت کا آغاز کب ہوا اور جو کچھ میں بیان دے رہا ہوں۔ یہ کہیں مضحکہ تو نہیں جائے گا۔ شاید لَوْمَۃَ لَائِم سے بے نیاز ہونے کا وُہ یہی مطلب سمجھتے ہوں۔

۴۔ اصل مبحث سے گریز

جب آپ قرآن کے الفاظ کی کوئی تاویل پیش نہ کر سکیں تو بمصداق "سوال گندم جواب چنا" دینا شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے اصل مسئلہ پر تو کچھ روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ قاری کو کسی دوسرے غیر متعلق پہلو میں الجھائے چلے جاتے ہیں۔ اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) قربانی سے مراد صدقہ و خیرات: ابتدائی زمانہ میں قربانی کی قبولیت کی یہ شکل ہوتی تھی کہ آسمان سے آگ آتی جو اُسے کھا جاتی (۳/۱۸۳) حضرت آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) نے بھی قربانی دی۔ اور اس قربانی کی قبولیت کی بھی یہی صورت تھی۔ مگر یہ بات خرق عادت ہے۔ لہٰذا اثری صاحب کو کسی طور گوارا نہیں۔ اس کا حل آپ نے یہ سوچا کہ قَرَّبَا قُرْبَانًا کا ترجمہ کرتے وقت لفظ قربانی کے آگے بریکٹوں میں (صدقہ و خیرات) لکھ کر آئندہ سب احکام صدقہ و خیرات کی قبولیت کے بیان فرما دیئے کہ صدقہ وصول کرنے والے عامل یا نبی ہوتے ہیں۔ ان کو صدقہ میں اچھی چیز دینی چاہیے ورنہ وُہ رُد کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ بات قربانی کی چل رہی تھی لیکن آپ نے ایسا پینترا بدلا کہ دوبارہ قربانی کا نام تک نہیں لیا۔

(۲) نفخ رُوح سے شوہر تک: حضرت مریمؑ سے متعلق نفخ رُوح کی بات کے ضمن میں آپ فرماتے ہیں:۔

"چنانچہ اللہ پاک نے سُورۂ انبیاء میں فنفخنا فیھا من روحنا (۲۱/۹۱) فرما کر عورت میں نفخہ کا ذکر فرمایا ہے اور سُورۂ تحریم میں فنفخنا فیہ من روحنا (۶۶/۱۲) فرما کر فرج میں نفخہ کا ذکر فرمایا ہے جو کہ ٹھیک ہے اور مطابق واقعہ ہے کہ محل دخول وخروج ہے اور یہ کام جو شخص بھی جائز طور پر کرتا ہے۔ اسی کا نام شوہر ہے" (ع صٓ)

اب دیکھئے کہ اصل سوال یہ ہے کہ نفخنا فیھا من روحنا کا مطلب کیا ہے اور بتا آپ نے یہ دیا ہے کہ شوہر کی کیا تعریف ہوتی ہے۔ بھلا شوہر کی تعریف آپ سے کس نے پوچھی تھی؟ سوال تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو فرماتے ہیں کہ "ہم نے مریم کے فرج میں پھونکا" تو کیا یہ نفخہ شوہر کے نطفہ کا قائم مقام تھا یا نہیں؟ اور اگر نہیں تھا تو اس اضافی نفخہ کا فائدہ کیا تھا؟ لیکن آپ بتا رہے ہیں کہ فرج محل دخول و خروج ہے اور جو شخص یہ کام جائز طور پر کرے وہ شوہر ہوتا ہے۔

(۳) مثیلِ آدم: "سوال۔ اللہ پاک نے عیسیٰؑ کو آدمؑ کا مثیل ٹھہرایا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ جیسے وہ بے پدر ہے ویسے ہی یہ بھی بلا باپ پیدا ہُوا ہے"۔ (ع۔ ص۸)

اُوپر کی عبارت کو اثری صاحب نے سوال کی شکل دی ہے پھر اس کا جواب جو لکھا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"آیت کریمہ میں کوئی ذکر نہیں کہ تمثیل بے پدری میں دی گئی ہے اور یہ مناسب بھی نہیں کہ آدم کسی کا ولد نہیں جبکہ عیسیٰؑ کو اعتراف ہے کہ وہ ولد ہیں۔"۔۔۔

لہ کی بابت اللہ پاک نے فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (۶۶/۱۲) اور ۲ کی بابت نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (۱۵/۲۹) اگر لہ خدا ہے تو ۲ بھی خدا ٹھہرا۔ اگر ۲ خدا نہیں تو لہ بھی خدا نہیں بلکہ عام انسانوں کے متعلق ارشاد ہے کہ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ تو کیا سب ہی خدا نظر آرہے ہیں۔ کیا خوب ہے"۔ (ع ص۹)

اب دیکھئے بات یہ چلی تھی کہ عیسیٰؑ اور آدم میں مماثلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خَلَقَهٗ کا لفظ لاکر بتلا دیا کہ یہ مماثلت پیدائش میں ہے لیکن اثری صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں یہ مماثلت پیدائش میں نہیں ہے۔ اب انہوں نے جو وجہ مماثلت بتلائی ہے۔ آپ ان کے جواب کو بار بار پڑھیے اور پھر بتلائیے کہ وہ وجہ مماثلت کیا دریافت فرمائی گئی ہے۔ اور نفخ رُوح سے کوئی خدا بنتا ہے تو پھر آدمؑ، عیسیٰؑ بلکہ تمام انسان خدا ہیں یہ بات بھی غلط ہے پھر ٹھیک وجہ مماثلت کیا ہوئی؟

(۴) اٰیَةً لِّلنَّاسِ اور بڑا گھرانہ: عیون زمزم کے ص۲۱۱ پر آیۃ للناس کی تشریح کرتے ہوئے اثری صاحب فرماتے ہیں:۔

(بوقت پیدائش عیسیٰؑ یہود کو) کہ اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ بال بچوں میں گھریلو زندگی شروع کرکے عہد نذر کو توڑا گیا ہے اور خطرہ پڑ گیا ہے کہ اس بُرے اثر سے ہیکل کا کام درہم برہم ہو جائیگا۔ اور وہ خطرہ جسے انہوں نے محسوس کیا ہے۔ دُوسری طرف اصل مقصود کے طور پر تھا کہ اس بدرسم درواج کو ہٹا کر ضرورت مند مجردوں کی شادی کرائی جائے اور یہ کام کسی بڑے گھرانے سے شروع کیا جائے۔ جس کے لئے مریم صدیقہ نے اپنی جان کو پیش کیا۔ جس کا ثمرہ بھی اللہ پاک نے اسے اچھا دیا۔ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا (مریم) وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰیَةً (مومنون) وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء)۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر مساوات کے سلسلہ میں رسول اللہ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا نکاح اپنے متبنّٰی آزاد کردہ غلام زید سے کر دیا، پھر جب ان کی آپس میں بدسلوکی ہو کر طلاق ہوگئی تو آپ نے اس کی دلجوئی کے پیشِ نظر اس سے خود نکاح فرما کر اس بدرسم ورواج

کو مٹایا کہ متبنیٰ کی مطلقہ سے شادی درست نہیں..... ان دونوں مواقع پر آپ نے اپنے آپ کو پیش کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑے گھرانے سے اصلاحی کاموں کی ابتدا، بہتر ہوتی ہے تاکہ چھوٹے لوگوں کی راہ میں مشکلات پیش نہ ہوں۔" (رع ص ۱۱۴)

اب دیکھئے کہ اگر سوال یہ ہوتا کہ" اصلاحی کاموں کی ابتداء کہاں سے ہونی چاہیئے"؟ تو اس کے جواب میں یہ دونوں واقعات پیش کرکے ثابت کیا جاسکتا تھا کہ یہ کسی بڑے گھر سے ہی ہونی چاہیئے لیکن مشکل یہ ہے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ آیۃ" اور آیۃٌ للناس کا معنیٰ کیا ہے۔ اس اصل مسئلہ کے متعلق دیکھئے کہ آپ کو اس طویل اقتباس میں کوئی جواب ملا ہے ؟ اور حافظ صاحب نے کس طرح اس مسئلہ سے رُخ دوسری طرف موڑ دیا ہے۔

۵۔ معروف معنوں سے گریز

قصۂ یونس علیہ السلام: اثری صاحب بھی اس عقل پرست طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کسی آیت کے صاف اور سیدھے مطلب کو دیکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہاں تو اللہ میاں سے بڑی بے احتیاطی ہو گئی اور اثری صاحب کے خیال کے مطابق کسی نبی کی عصمت خراب ہو گئی لہٰذا لاؤ میں ان کی بات اس طرح بنا دوں کہ ان کی غلطی کا پردہ ڈھک جائے اور لوگوں کو اس پر ہنسنے کا موقع نہ ملے۔

اس غرض کے لیئے یہ حضرات لغت کی کتابوں میں سے وہ مختلف مفہومات تلاش کرتے ہیں جو مختلف محاوروں میں اس سے مُراد لیئے جا سکتے ہوں اور ان میں سے کسی مفہوم کو لاکر ایک ایسی عبارت میں چسپاں کر دیا جہاں ایک عام عرب اس لفظ کو ہرگز اس مفہوم میں استعمال نہ کریگا زباں دانی تو نہیں ہوسکتا۔ البتہ سخن سازی کا کرتب ضرور مانا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے کرتب اگر کوئی دُوسرا شخص لغت کی کتاب ہاتھ میں لے کر ان کی تحریریں پر دکھانے شروع کردے تو شاید اپنے کلام کی دوچار ہی تاویلیں سُن کر یہ حضرات چیخ اُٹھیں۔

اثری صاحب نے اس میدان میں بہت سے کارہائے نمایاں دکھلائے ہیں۔ جن کا تذکرہ اس کتاب میں جابجا موجود ہے۔ تاہم ان میں سے ہی ایک دو مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

(۱)۔ حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں جانے اور پھر زندہ، صحیح و سالم اس مچھلی کے بر لب ساحل اُگلنے سے بچانے کے لیئے بالفاظِ دیگر حضرت یونسؑ کو ان اتہامات سے بچانے اور ان کی عصمت بیان کرنے کی خاطر اثری صاحب نے سخن سازی کے جو کرتب دکھائے وُہ کچھ اس طرح ہیں:۔

الفاظ	معروف معانی	اثری معانی	کیفیت
(۱) اَبَقَ	غلام کا آقا سے بھاگ جانا	آقا سے غلام کے بھاگنے کی کوئی قید نہیں صرف بھاگنا بھی درست ہے	اس سے یہ جتلانا مقصود ہے کہ آپ نے بحکم الٰہی ہجرت کی جو جمہور کے خلاف ہے
(۲) ساھم (القوم)	قرعہ اندازی کرنا	شامل ہونا (لغوی لحاظ سے غلط ہے)	
(۳) من المدحضین	قرعہ اندازی میں ناکام ہونا	دھکیل دیا گیا (" ")	
(۴) التقمہ	نگل لیا	بوسہ دیا (پاؤں کو)	
(۵) حوت	ایک مچھلی	بہت سی مچھلیاں	
(۶) فنادیٰ	یونسؑ نے پکارا (اللہ کو)	تقریر شروع کی (کشتی والوں کو)	
(۷) فی الظلمٰت	(مچھلی کے پیٹ کے) اندھیروں میں	کشتی والوں کے قلبی اندھیروں کیلئے	
(۸) للبث فی بطنہٖ الی یوم یبعثون	یونسؑ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے	مچھلیوں کے پیٹ کی خوراک نہ ہوں الی یوم یبعثون	اس کا کچھ معنی نہیں۔
(۹) سقیم	بیمار	حیران پریشان اور آزردہ خاطر	

اتنے الفاظ کے معنوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے بعد بھی جب آپ کے مخترعہ قصے کا پلان درست نہ ہوا تو بالآخر ترتیب ذکری کو بدل کر آیات میں تقدیم و تاخیر سے بھی باز نہ آئے۔ مثلاً قرآن یہ کہتا ہے کہ جب مچھلی نے آپ کو ساحل دریا پر اُگل کر پھینکا تو اللہ تعالیٰ نے وہاں ایک درخت (کدو) کا اُگا دیا۔ پھر جب آپ تندرست ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قوم کی طرف بھیجا جس کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زائد تھی۔ لیکن اثری صاحب اس قوم کی طرف بھیجنے سے متعلق آیات کا پہلے ذکر کرتے ہیں۔ یعنی جب یونسؑ کشتی سے اُترے تو اللہ نے انہیں اس قوم کی طرف بھیجا جو ایک لاکھ سے زائد تھی۔ وہاں جا کر یونسؑ نے دیکھا کہ وہاں بہت سے یقطین کی قسم کے درخت اُگے ہوئے تھے۔

یہ سب کچھ اثری صاحب نے اس لیے گوارا کر لیا ہے کہ بزعم خود یونسؑ کی عصمت بیان فرما رہے ہیں اور دراصل اپنے اس فطرت پرست ذہن کو مطمئن کر رہے ہیں جو اللہ کی قدرت کاملہ کے اظہار کا منکر اور اسے ناممکن الوقوع سمجھتا ہے۔

(۲) **قصہ ہابیل و قابیل کا:** اسی طرح ہابیل و قابیل کے سابقہ معروف قصہ کو غلط قرار دینے اور اپنے موضوعہ قصہ کو تسلیم کروانے کے لیے اثری صاحب نے

۱۔ آدم سے مراد بنی اسرائیل کا کوئی آدم نامی انسان مراد لیا۔

۲ ۔ ابنی آدم کے متعلق فرمایا کہ اس سے مُراد صلبی بیٹے نہیں بلکہ بنو آدم ہیں۔

۳ ۔ اخیہ اور اخی سے بھی برادرِ حقیقی مُراد نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔

۴ ۔ قربانا سے مُراد قربانی نہیں بلکہ صدقہ و خیرات ہے۔

۵ ۔ قُرّبا کے معنیٰ قربانی پیش کرنا نہیں صدقہ و خیرات کی ادائیگی ہے۔

۶ ۔ سواۃ سے مُراد لاش نہیں بلکہ محض عیب اور بُرائی اس کا معنیٰ ہے۔

۷ ۔ وُاری یواری صرف مادی چیزیں چھپانے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ غیر مادی چیزوں کے چھپانے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اتنا کچھ کرنے کے بعد آپ نے جو قصہ بنا سنوار کر پیش کیا ۔اس پر جو عقلی اعتراض وارد ہوتے ہیں ان کی تفصیل تو اصل مقام پر ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ایک مرفوع حدیث میں علی ابن آدم الاوّل کے الفاظ آتے ہیں جن کی وجہ سے اثری صاحب کا تراشیدہ قصہ ہی غلط ہو جاتا ہے۔ اس کا حل اثری صاحب نے یہ سوچا کہ ان الفاظ کا ترجمہ ہی چھوڑ دو ا ۔ حدیث کا مطلب یُوں بیان فرمایا کہ "اس قوم یا اس علاقہ میں اس کے بعد ... جس قدر قتل ہوئے ہیں ان سب کا وبال اس آدم زادے پر بھی ہُوا ہے کہ اس نے اپنے پچھلوں کے لئے بدتر نمونہ چھوڑا ہے"۔

(ب ص ۶۱)

غرض معروف معنوں سے گریز کا حربہ آپ نے تقریباً اپنی ساری ہی تاویلات میں استعمال فرمایا ہے مثلاً قصہ ایوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یوسفؑ اور اصحاب کہف وغیرہ کوئی قصہ ایسا نہیں جسے آپ نے مجازی اور کنائی معنوں کے استعمال سے بگاڑ کے نہ رکھ دیا ہو۔ ہم بخوف طوالت ان سب کا اعادہ یہاں پیش نہیں کر سکتے۔

۶ ۔ قرآن کے ربط کو اوجھل کرنا

قاری کے ذہن میں اپنا ذہن منتقل کرنے کے لیئے یہ طریقہ بھی خاصا مؤثر ہے۔ اور اثری صاحب عیون زمزم میں اس طریقہ کو خصوصاً بروئے کار لائے ہیں۔ یعنی قرآن کریم میں مستعملہ الفاظ پر پہلے لغوی بحث پیش کر دی جائے۔ اور اس بحث میں کسی ترتیب کو ملحوظ رکھنا بھی چونکہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے لہٰذا اثری صاحب نے اگر احصان کی بحث کی ہے۔ جو کسی ایک مقام پر نہیں بلکہ تین جُدا جُدا مقامات پر یہ بحث پھیلی ہوئی

ہے۔ اسی طرح عذرا بتول کی بحث ہے پھر تثلیث عیسیٰ کی بحث بہت سے مقامات پر پھیلا دی گئی ہے۔ کچھ سوال وجواب سے قاری کے ذہن کو پریشان کیا گیا ہے پھر جس طرح حنفی مدارس پہلے فقہ کی مکمل تعلیم دے لیتے ہیں اور بعد میں حدیث پڑھاتے ہیں تاکہ طالب علم حدیث کو بھی فقہ کی عینک سے ہی دیکھے۔ بعینہٖ یہی طریقہ اثری صاحب اختیار کرتے ہیں۔ پہلے اپنی تشریحات اور اپنی لغات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ بعد میں اپنی تفسیر پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کی تفسیر کو قاری کا ذہن قبول کرنے کے لئے کسی حد تک آمادہ ہو جائے۔ اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

۱۔ یُوسفؑ کے خواب کی عملی تعبیر: جب یُوسفؑ نے اپنے والدین اور بھائیوں کو مصر بلایا تو یہ وقت تھا جب حضرت یُوسف کے خواب نے عملی شکل اختیار کی۔ اس موقعہ پر اثری صاحب فرماتے ہیں :-

"پھر جب وُہ تشریف لائے تو آپ (یوسفؑ) نے شہر سے باہر نکل کر اسلامی طریق پر محبت بھرا ان کا استقبال کیا آوٰی اِلَیۡہِ اَبَوَیۡہِ (۱۲: ۹۹)۔ پھر شہر میں لاکر انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ اپنی بلند مسند اور تکرمہ پر بٹھایا اور خوب خاطر تواضع فرمائی ورفع ابویہ علی العرش (۱۲: ۱۰۰)۔ اور ماں باپ اور سب بھائیوں نے بجناب باری عزّ اسمہ سجدہ شکر ادا کیا۔ وَخَرُّوۡا لَہٗ سُجَّدًا (۱۲: ۱۰۰) جس پر آپ نے فرمایا کہ اے ابّاجان یہ میرے اس خواب کی عملی تعبیر ہے جس کی علمی تعبیر آپ نے اس وقت ارشاد فرماکر اب تک ان کی انتظار فرمائی ہے" (ب ص۱۸۰)

اب دیکھئے کہ آیت کا تسلسل یُوں ہے :

ورفع ابویہ علی العرش وخرّوا لہٗ سجدًا (۱۲/۱۰۰) اور حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب اس کے لئے سجدہ میں گر پڑے۔

چونکہ اس آیت میں اللہ کا ذکر قریب چھوڑ دُور بھی موجود نہیں لہٗ کی ضمیر اللہ کی طرف پھیرنے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اب اثری صاحب چونکہ اپنی حسب خواہش مطالب نکالنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس آیت کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے مطلب پیش کیا ہے تاکہ یہ سقم کسی نہ کسی حد تک قاری کے ذہن سے اوجھل رہے۔

۲۔ قرآن کی ترتیب ذکری میں تقدیم تاخیر: اثری صاحب کو قصص القرآن میں سے بیشتر واقعات کو از سرِ نو اس لیے ترتیب دینا پڑا کہ ان میں سے خرق عادت اُمور کو خارج کرسکیں۔ اس جدوجہد میں انہیں بعض دفعہ قرآنی آیات کی ذکری ترتیب میں تقدیم وتاخیر کرنے کا ناگوار فریضہ بھی سرانجام دینا پڑا۔ کیونکہ اس کے بغیر آپ کے قصہ مخترعہ کی ترتیب

درست نہیں رہتی تھی۔ مثلاً

حضرت یونسؑ کا قصہ قرآن میں یوں مذکور ہے کہ جب مچھلی نے آپ کو بر لبِ ساحل اُگل دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک بیل اُگا دی۔ پھر جب طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک قوم کی طرف مبعوث فرمایا جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔

اب اثری صاحب یونسؑ کے مچھلی کے پیٹ میں جانے اور مچھلی کے بر لبِ ساحل اُگلنے کے تو منکر ہیں لہٰذا انہیں بر لبِ ساحل کسی درخت کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ لہٰذا آپ یونسؑ کو کشتی سے اُتارنے کے بعد اس قوم کی طرف روانہ فرماتے ہیں جو ایک لاکھ سے زائد تھی۔ اور یہ بات سورۂ صافات کی آیت نمبر ۱۴۷ میں مذکور ہے۔ پھر اس کے بعد اثری صاحب آیت ۱۴۶ کا ذکر لاتے ہیں۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (۳۷/۱۴۶) اور ہم نے یونسؑ کے اوپر کدو کا درخت اُگایا۔

اور اس آیت کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ:

"اس خطہ میں ترکاری اور پھل پھول و میوہ جات کی بکثرت پیداوار تھی" (ب ۲۴۰)

۴۔ آیت کا کچھ حصہ چھوڑ دینا: آیت کا جو حصہ آپ کے مزعومہ اور مخترعہ قصہ کو باطل قرار دے رہا ہو۔ اس حصہ کو آپ درج نہیں فرماتے اور درج کر بھی دیں تو اس کا ترجمہ یا حاصل مطلب یا ٹھیک مطلب چھوڑ جاتے ہیں مثلاً:۔

قصہ ابراہیم و اسمٰعیل میں آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی انہوں نے ایسا سمجھا تھا۔ نہ ہی حضرت اسمٰعیل نے یہ سمجھا کہ میں فی الواقع ذبح ہو جاؤں گا اور نہ ہی خدا نے کوئی ایسا حکم دیا تھا۔ لہٰذا ایک تو آپ نے خواب کی تعبیر کو نیا رنگ عطا کیا۔ دوسرے حضرت اسماعیل کا یہ قول کہ:۔

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۳۷/۱۰۲) انشاء اللہ (اے باپ) آپ مجھے صبر کرنیوالوں سے پائیں گے۔

جو کہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل فی الواقع یہی سمجھتے تھے کہ میں ذبح ہو جاؤں گا۔ آپ آیت کا یہ حصہ اپنے بیان کردہ قصہ سے یکسر چھوڑ گئے (دیکھئے بیان المختار صفحہ ۱۲۷-۱۲۸) تیسرا کام یہ کیا کہ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ کا ترجمہ کر دیا " یہ ایک بڑی نعمت ہے"۔ ان تمام حربوں کو بروئے کار لا کر حضرت اسمٰعیل کے ذبیح اللہ ہونے کا انکار کر دیا۔

یہ اور ایسے اور بھی بہت سے مقامات ہیں جہاں اثری صاحب نے ایسے ہی حربوں سے کام لیا جنہیں ہم طوالت سے بچنے کی خاطر نظر انداز کر رہے ہیں۔

۷. بے لگام ترجمہ یا حاصل مطلب یعنی ٹھیک مطلب

اثری صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وُہ ترجمہ یا مطلب پیش کرتے وقت یہ بات قطعاً نہیں سوچتے کہ جو ترجمہ یا مطلب میں پیش کر رہا ہوں اس کا قرآن کے الفاظ سے کچھ تعلق بھی ہے یا نہیں؟ نہ انہیں اس بات کی پرواہ ہوتی ہے کہ اصل عبارت میں کونسا فعل یا صیغہ استعمال ہوا ہے اور اس کا معنیٰ کیا ہونا چاہیئے۔ وُہ اس بات میں پُورے آزاد ہیں کہ جس لفظ کا یا آیت کے حصّے کا ترجمہ ان کے نظریہ کے خلاف ہو اسے چھوڑ دیں اور اس بات میں بھی وُہ اپنی ضرورت کے مطابق جن الفاظ کا اضافہ اپنے حق میں مفید سمجھیں بلا دریغ ترجمہ میں شامل کر دیں۔ گو اس کتاب میں ایسی بے شمار مثالیں آپ دیکھ چکے ہوں گے۔ تاہم چند ایک درج ذیل ہیں:۔

نمبر شمار	آیت یا اس کا ترجمہ	ترجمہ	اثری ترجمہ یا مطلب	حوالہ	کیفیت
(۱)	إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ	بیشک یہ ایک صریح آزمائش تھی	ویسے ہی تیرا یہ بچہ بہت بڑا نیک اور تیرے سلئے ایک بہت بڑی نعمت ہے	ص ۱۲۸ ب	
(۲)	وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ	اور ہم نے ایک بڑی قربانی بدلہ میں دیکر اسمٰعیل کو چھڑا لیا	اور ٹھیک تفسیر اس کی یہ ہے کہ (اے ابراہیمؑ) تو کوئی بہتر سے بہتر منحیہ لیکر ذبح کر دے۔	"	
(۳)	كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ	اسطرح ہم نے یُوسفؑ کے لئے خفیہ تدبیر کی	اسلئے ہم نے یُوسف کیلئے اسکے بھائی کے مقدمہ کو اپنی قدرتِ کاملہ سے بے جان بنا دیا	ص ۱۶۹ ب	
(۴)	فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا	جب خوشخبری دینے والا آپہنچا تو کرتہ یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور وُہ بینا ہو گئے	اور ان کے ہاتھ والد صاحب کیلئے ایک کُرتہ بھی سلوا کر اپنی طرف سے بطور تحفہ بھیج دیا تاکہ وہ اسے پہن کر خوش ہوں اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں	ص ۱۸۰ ب	
(۵)	اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا	جب مریم اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر مشرق کی طرف چلی گئیں	جبکہ وہ اپنے شوہر کے گھر سے جو کہ غربی جانب واقع تھا۔ ناراض ہو کر اپنے میکے گھر چلی گئی جو کہ مشرقی جانب واقع تھا	ع ص ۱۴۳	

اور اگر صرف مکاناً شرقیاً کا معنی کرنا ہو تو وہ یہ ہوگا: حیث طلعت وانتت منکوحۃ۔ یعنی جہاں سے وہ نمودار ہوئی اور منکوحہ ہو کر آئی۔ (ع ص۱۳۶)

آیت	ترجمہ	تفسیر
(۶) فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا	تو مریم نے اپنے گھر والوں سے پردہ کر لیا	اور مریم وہاں جا کر رک گئی (یعنی میکے گھر) کہ واپسی کا نام تک نہیں لیا۔ (ع ص۱۴۳)
(۷) قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا	فرشتہ نے کہا میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔	اس (شوہر) نے اپنی صحت کا حال بھی (مریم کو) سنایا اور اللہ پاک کا الہام بھی سنایا۔ اس پر کچھ بات چیت کرنے کے بعد اس (شوہر) نے کہا کہ الہام میں یہ تصریح ہے کہ نکاح مبارک ثابت ہوگا اور اللہ پاک اپنے الہام کے مطابق پاکیزہ لڑکا عطا فرمائے گا۔ ع ص۱۴۳
(۸) وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا	اور مجھے کسی بشر نے چھوا نہیں اور نہ ہی میں بدکار رہوں۔	(مریم نے کہا اے میرے شوہر) تیری طرف سے مس تو ہوا نہیں تو لڑکا کیسے؟ (اور لم اک بغیا کا کچھ معنی نہیں یہ زائد ہے)
(۹) وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا	اور تاکہ ہم اس (عیسیٰ) کو لوگوں کیلئے نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ یہ بات طے شدہ ہے۔	اور تاکہ (واقعہ) تیرے جیسے معذوروں کیلئے اسوہ حسنہ ٹھہرے اور کہ تیرے مربی نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے کہ تجھے الہام سناؤں اور اپنے گھر لے چلوں۔ (شاید الہام سنانا اور اپنے گھر لے چلنا امراً مقضیا کا ترجمہ ہو؟)
(۱۰) قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا	بیشک تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ بنا دیا ہے	اور یہ نیچے چشمہ بہہ رہا ہے (ع ص۱۴۵)
(۱۱) وَهُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا	اور کھجور کے تنا کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ تم پر تر و تازہ کھجوریں گرائے گا۔	جہاں سے چاہے، جب چاہے اور جتنی چاہے اس سے اتار کر تازہ بتازہ (مریم) اپنے کام میں لائے (ایضاً)
(۱۲) قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا	کہنے لگے اے مریم! یہ تو تو نے برا کام کیا۔	قوم نے سوال کیا کہ پدری مادری عہد کو توڑ کر اس طرح گھر بلیو زندگی بسر کرنا شریعت کے خلاف ہے۔ (ب ص۱۴۶)

آیت	ترجمہ	ترجمہ
(۱۳) مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا	نہ تو تیرا باپ بداطوار آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی۔	تمہارا باپ تو عہد شکن نہیں اور تمہاری ماں نے بھی ایسے کاموں کو پسند نہیں کیا۔ (ب صـ۱۶۶)
(۱۴) وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ	جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! خدا تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے۔	اچھا تو فرشتوں نے یوں بھی پکارا کہ اے مریم! اللہ پاک تجھے اپنے کلام اور الہام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے۔ (ب صـ۱۶۹)
(۱۵) اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	جب اللہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو ارشاد فرماتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے	جب اللہ پاک کا ارادہ ہوتا ہے تو تمام موانع دور ہو کر سب حالات موافق ہو جاتے ہیں (ب صـ۱۷۱)
قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ	اسمٰعیل نے کہا ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم ہوا وہی کیجئے خدا نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنیوالوں میں سے پائیں گے۔	بیٹے نے فی البدیہہ عرض کی۔ ابا جان! جو کچھ آپ کو خواب میں اشارہ ہوا اسکی ظاہر طور پر تعمیل تو ابھی کریں۔ پھر جب اللہ پاک اس کا صحیح مطلب اور ٹھیک تعبیر سمجھائیگا تو اگر اس میں میری جان کا بھی مطالبہ ہوا تو میں اس کیلئے بھی تیار ہوں مجھے پھر بھی کوئی انکار نہیں۔ (ب صـ۱۲۷) ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ پورے جملہ کا ترجمہ اثری صاحب گول کر گئے ہیں کیونکہ آپ اس ذبح کے واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ یا اسمٰعیلؑ کیلئے آزمائش سمجھتے ہی نہیں۔
(۱۶) فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا	پھر ان کیلئے دریا پر لاٹھی مار کر خشک راستہ بنا دے۔	ساحل بحر پر یہاں سے وہاں تک اپنی لاٹھی مار کر نشان لگا دے کہ ان دونوں نشانوں کے اندر اندر اسرائیلی دریا میں داخل ہو کر پار ہوں۔ (ب صـ۲۱۴)
(۱۷) وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (پ۱)	اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنا عصا پتھر پر مار تو اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔	اور پانی کی بابت موسیٰؑ کو الہام ہوا کہ فلاں فلاں مقام پر لاٹھی مار کر نشان لگا دو کہ وہاں پر چشمے بند پڑے ہیں جو کہ کھودنے پر برآمد ہوں گے (ب صـ۲۳۰)
(۱۸) فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ	پھر مچھلی نے انہیں نگل لیا اور وہ قابل ملامت کام کرنیوالے تھے پھر اگر وہ	اگر میں یہاں سے گر بھی پڑوں تو سیدھے مچھلیوں کے پیٹ میں جا پڑوں جہاں سے قیامت سے پہلے نکلنا ہی نہیں

الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۳۷/۱۴۲ تا ۱۴۴)	خدا کی پاکی بیان نہ کرتے تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے	(دوسرا ترجمہ) ورنہ اگر وہ وہاں پر بیٹھے رہتے تو انہیں خطرہ تھا کہ کہیں گر کر مچھلیوں کی خوراک نہ ہوں۔ الی یوم یبعثون کا کچھ ترجمہ نہیں (پ ص ۳۳۹)
(۱۹) وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَاۤ اَرَى الْهُدْهُدَ	اور جب سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا تو کہنے لگے کیا سبب ہے کہ ہُدہُد نظر نہیں آرہا؟	آپ نے طیاروں کا جائزہ فرمایا تو دیکھا کہ ہُدہُد نامی طیارہ غائب ہے (پ ص ۳۰۳)
(۲۰) قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ	ایک قوی ہیکل جن نے کہا میں اس تخت کو آپکے دربار برخاست کرنے سے پہلے لا سکتا ہوں	ایک ٹھیکیدار نے کہا کہ میں اتنی جلدی تیار کر سکتا ہوں کہ اسکے آنے پر جب آپ استقبال کیلئے کھڑے ہوں تو بیشک پہلے) سے اپنی جگہ پر بچھا سجا ہوا ملاحظہ فرمالیں (پ ص ۳۰۵)
(۲۱) قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ	اب اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہا کہ میں اسے آپ کی پلک جھپکنے سے پیشتر لا سکتا ہوں۔	دوسرا بولا میں اس سے بھی جلدی تیار کر سکتا ہوں۔ (حوالہ ایضاً)
(۲۲) فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ	اور اپنی جانوں کو قتل کرو	اور اپنی جانوں کو ملامت کرو" (پ ص ۲۲۷)
(۲۳) فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (۷/۱۶۶)	پھر جب انہوں نے منع کردہ کاموں سے سرکشی کی تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔	"وہ اپنی بدکاریوں کی وجہ سے بندر اور خنزیر کہلائے (پ ص ۳۹۲)
(۲۴) وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ (۵/۶۰)	اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنا دیا جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی	"اور بندر اور خنزیر اور طاغوت پرست کہلائے" (حوالہ ایضاً)

۸۔ قرآن وحدیث کے مقابلہ میں انجیل کو حجت سمجھنا

آپ مفسرین کو اکثر کوستے رہتے ہیں کہ وہ اسرائیلیات سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کی کوئی بات خواہ وہ قرآن وحدیث کے منافی نہ بھی ہو، ماننے سے انکار کر دیتے ہیں مثلاً آپ بطور سوال بائیبل میں مندرج ایک پیشگوئی درج کرتے ہیں :-

"دیکھو! کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھے گی"

پھر جو انہا لکھتے ہیں نہ یہ کوئی قرآن وحدیث نہیں جس کا جواب میرے ذمہ لازم ہو کہ میں اہل حدیث ہوں (ص ۱۵۵)

مگر جب اپنا ؟ نو سیدھا ہوتا نظر آئے تو نہ صرف یہ کہ بائبل کی عبارت بلا جھجک پیش کرتے ہیں بلکہ اُسے قابلِ حجت سمجھتے ہیں مثلاً دیکھئے : آپ لکھتے ہیں :

"لُوقا باب ۲ میں ہے کہ اس کی ماں (مریم) نے اس (عیسیٰ) سے کہا بیٹا تونے ہم سے کیوں ایسا کیا۔ دیکھ تیرا باپ اور میں کڑھتے ہوئے تجھے ڈھونڈتے تھے"...... عیسیٰؑ اور اس کی والدہ کو اپنا شوہر اور اس کا باپ بتا رہی ہے۔ اور باپ بیٹا بھی دونوں اسے تسلیم فرما رہے ہیں۔ مگر صدیوں بعد لوگوں نے انہیں بے پدر بتایا اور آپ کی والدہ کو بے شوہر بتایا۔ کیا خوب ہے ؟" (ص ۴۰)

آگے چل کر پھر فرماتے ہیں :

"یوحنا باب ۶ میں یہودیوں کا بیان یوں ہے کہ "کیا یہ یسوع یوسف کا بیٹا نہیں ہے"۔ اور یوحنا باب ا میں ہے کہ "وہ یوسف کا بیٹا مسیح ناصری ہے"۔ ... اور متی باب ۱۳ میں ہے کہ کیا یہ بڑھئی نہیں"؟......... اس وقت تو عیسیٰؑ کی بے پدری کا کسی کو بھی کوئی خیال نہیں۔ یہ خیال تو صدیوں بعد پیدا ہوا ہے۔ جو موصوف کی شان ارفع واعلیٰ کے خلاف ہے"۔ (ص ۴۱)

دیکھئے اثری صاحب کس طرح اسرائیلیات کو اپنے نظریہ کی تائید میں بطور شہادت اور حجت پیش فرما رہے ہیں۔

(۲)۔ اسی کتاب عیون زمزم کے ص ۱۷ پر آپ بدیں الفاظ ایک سوال اُٹھاتے ہیں: "حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے موقعہ پر حضرت مریم پر اعتراضات کی وہ بوچھاڑ ہوئی کہ الامان والحفیظ۔ اس سے ظاہر ہے کہ شادی نہیں ہوئی۔ اور بچہ پیدا ہو گیا۔ تو پھر یہود نامسعود نے شور مچایا کہ یہ بچہ ناجائز پیدا ہوا ہے جیسے کہ سورہ مریم میں تفصیل ہے"۔

اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"یہود اب بھی دُنیا میں موجود ہیں اور ان کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ ان سے دریافت کر لیا جائے کہ انہوں نے کیا اعتراض کیا تھا؟ آیا یہ اعتراض تھا کہ اس نے شادی نہیں کی اور بچہ پیدا ہو گیا یا یہ اعتراض تھا کہ اس نے موجودہ شریعت کے خلاف شادی کی ہے۔ جس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے؟" (ص ۱۷)

اس جواب سے واضح ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں میں کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو جائے تو ہمیں یہود اور ان کی کتابوں کی طرف رجوع کر کے' ان سے جو کچھ ثابت ہو قبول کر لینا چاہیئے اور قابلِ حجت سمجھنا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر ہم مسلمانوں کے اپنے پاس اس اصولی قسم کے نزاع کو ختم کرنے کے لیئے کوئی واضح ہدایت

موجود نہیں۔ اب اگر ایسی واضح ہدایت حافظ صاحب جیسے ہٹ دھرم شخص کو نظر نہ آسکے تو ہم کہہ نہیں سکتے۔ ورنہ وہ قاطع نزاع ہدایت ہر مسلمان کو نظر آجاتی ہے۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا (۴/۱۵۶) اور یہود کے کفر کے سبب اور مریم پر بہتان عظیم باندھنے کے سبب (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی)۔

پھر یہی "بہتان عظیم" کے الفاظ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں واقعہ افک کے موقعہ پہ زنا کی تہمت کے لئے استعمال فرمائے ہیں۔ ارشاد باری ہے :-

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ (۲۴/۱۶)

اور جب تم نے یہ (زنا کا الزام) سنا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں شایاں نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں۔ اے اللہ تو پاک ہے یہ تو بہتانِ عظیم ہے۔

اب یہ بھی قرآن سے ثابت ہوگیا کہ یہودیوں نے حضرت مریم پر بہتان عظیم باندھا تھا اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ بہتانِ عظیم کو قرآن نے زنا کی تہمت کیلئے استعمال فرمایا ہے تو پھر کسی مسلمان کے لئے تو کم ازکم یہ گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ یہود اور ان کی کتابوں کو قابلِ حجت سمجھ کر ان کی طرف رجوع کرے کہ اعتراضات کی بوچھاڑ کا اصل سبب کیا تھا۔ لیکن اثری صاحب یہی ہدایت فرما رہے ہیں۔

۹۔ بنائے فاسد علی الفاسد

اثری صاحب عام مروّجہ مفہوم سے ہٹ کر اپنی طرف سے جو مفہوم پیش کرتے ہیں تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ جو کچھ مطلب میں نے بیان فرمایا ہے یہ اب ہر فریق میں مسلّم ہوچکا ہے لہٰذا اگلا سوال اس مفروضہ مفہوم کو اصل بنیاد سمجھ کر اٹھا دیتے ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ قصۂ یوسفؑ اور صواع کا مفہوم: جملہ اہلِ لغت اور مفسّرین اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ صواع کے معنی پیالہ ہے۔ یعنی وہ پانی پینے کا برتن جو چاندی یا سونے کا ہو (تفصیل کے لئے دیکھئے صواع کی بحث) لیکن اثری صاحب مصر ہیں کہ صواع کے معنی پیالہ نہیں بلکہ پیمانہ ہیں۔ انہیں غلطی یہ لگی کہ وہ اسے غالباً صاع (ٹوپہ۔ ایک پیمانہ) سے مشتق یا اس کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ

"امیر پیغام (محمد علی لاہوری) اور خلیفہ قادیان کا بیان ہے کہ یہ برتن سونے چاندی کا تھا کہ اس پر اتنی تحقیق ہوئی اور حمل بعیر انعام رکھا گیا؟"

یہ سوال تھا اب اس سوال کا اثری جواب ملاحظہ فرمائیے:۔

"کسی سابق کی کورانہ تقلید کی بنا پر انہوں نے ایسا بیان کیا ہوگا۔ پیری مریدی کے سلسلے میں صرف خوش اعتقادی ضروری ہے، علم وعقل کی کوئی ضرورت نہیں۔ چاندی سونے کے پیمانوں سے غلہ ناپ کر دینا کوئی عقلمندی نہیں کہ یہ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کا مصداق ہے۔" (ب ص ۱۷۰)

گویا اثری صاحب کے نزدیک نزاع کی بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ پیمانہ چاندی سونے کا نہ تھا، بلکہ عام قسم کا تھا۔ گویا صواع کے معنی پیمانہ ہونے میں اثری صاحب کو شک پڑ ہی نہیں سکتا۔

اور یہی اثری صاحب کی غلط فہمی ہے۔ باعث نزاع یہ بات نہیں کہ وہ پیمانہ سونے چاندی کا تھا یا نہ تھا بلکہ باعث نزاع یہ بات ہے کہ وہ برتن پیالہ تھا یا پیمانہ؟

۲۔ حضرت زکریا اور اعتکاف: حضرت زکریا کو جب فرشتوں نے حضرت یحییٰ کی بشارت دی تو آپ نے تعجب اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے اللہ سے درخواست کی کہ اس موقعہ کی کوئی نشانی بتلائی جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم تین دن تک لوگوں سے کلام نہ کر سکو گے اس مطلب پر اثری صاحب کو جو اعتراض ہیں ان کا جائزہ ہم اپنے مقام پر پیش کر چکے ہیں۔ قصہ مختصر اثری صاحب اس کے تین دن نہ بولنے اور اشارہ سے باتیں کرنے کا مطلب 'اعتکاف' بتلاتے ہیں۔ پھر یہ مطلب بتلانے کے بعد ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ:

"اعتکاف میں فاضل بات چیت کی روک اتنی سخت نہیں جتنی کہ مباشرت سے سخت روک ہے۔ اللہ پاک نے زکریا کو بات چیت سے تو روک دیا ہے اور مباشرت سے نہیں روکا جو کہ ضروری تھا؟" (ب ص ۲۶۱)

یہ سوال ہے اب اس کا جواب ملاحظہ ہو:۔

"حیض ونفاس کا حکم شرعاً ایک ہے۔ ان دنوں میں میل ملاپ قطعاً حرام اور منع ہے یہاں پر چونکہ اس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں۔ اسلئے اس کی ممانعت کی ضرورت نہیں پڑی" (حوالہ ایضاً)

یہ سوال اور اس کا جواب جیسا کچھ ہے وہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اصل نزاع یا اختلاف تو یہ تھا کہ آیا زکریا کو یہ نشانی بتلائی گئی تھی کہ آپ تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا کلام نہ کر سکیں گے یا تین دن کے اعتکاف کا حکم ملا تھا اور یہ تو واضح ہے کہ اثری صاحب کا یہ اجتہاد عقل و نقل کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے لیکن اس کے باوجود آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو نکات میں نے بیان فرمائے ہیں ان کو ہر شخص قبول کرنے کے لیئے تو پہلے ہی مضطرب ہے۔ اب سمجھنے کی بات

صرف یہ باقی رہ گئی کہ اعتکاف میں بات چیت سے روک اتنی سخت نہ ہونے کے باوجود روکا گیا ہے مگر مباشرت سے نہیں روکا گیا؟ حالانکہ آپ کے اس سوال سے ہی جو ٹھیک نتیجہ نکل سکتا ہے وُہ یہ ہے کہ آپ کا یہ اجتہاد غلط ہے۔

(۳) **دُوسرے انبیاء کرام کی حضرت یونسؑ پر تفضیل:** پہلی غلط بنیاد آپ نے یہ قائم کی کہ حضرت یونسؑ نے بحکم الٰہی ہجرت فرمائی۔ دُوسری غلط بنیاد یہ بنائی کہ "حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں اللہ کی تسبیح بیان نہیں فرماتے تھے بلکہ اپنے وعظ کے ذریعہ کشتی والوں کے قلبی اندھیرے دُور کرتے اور تبلیغ کرتے رہے۔ اب انہی دو قائم کردہ غلط بنیادوں کو اصل مسلّمہ امر قرار دے کر رسول اللہؐ کے اس قول کہ "کسی کو یہ لائق نہیں کہ مجھے یونس بن متیٰ پر فضیلت دے" کی توجیہہ یہ بیان فرمائی کہ چونکہ دورانِ ہجرت اور کسی نبی کو تبلیغ کا موقعہ نہیں ملا۔ اور یہ موقعہ صرف حضرت یُونس کو ملا ہے۔ اسلیئے فی الواقع اس لحاظ سے آپ سب سے افضل ہیں۔ اور رسول اللہ کا یہ قول ازراہ انکساری اور حضرت یونس کے اس خفت کے پہلو پر چشم پوشی کے لیئے نہیں بلکہ فی الحقیقت اصلیت پر مبنی ہے۔

(۴) **حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش:** اس قصہ کی بنیاد آپ نے یہ بنائی کہ حضرت مریم کا یوسف نجار سے نکاح پہلے ہی ہو چکا ہُوا تھا۔ اور یہ نکاح خود حضرت زکریا نے پڑھا تھا۔ اب اس غلط بنیاد پر قصہ پُورے مخترعہ قصے کی عمارت کھڑی کر دی جس کو ہم مفصل طور پر پہلے پیش کر چکے ہیں۔

۱۰۔ رسُول اللہؐ کیلئے پروگرام

اثری صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انبیائے کرام کی زندگی سے معجزات اور خرقِ عادت امور کو خارج کرنے کے لیئے ان کے حالات زندگی کا نقشہ ہی بدل دیتے اور قصہ ہی نیا وضع کر لیتے ہیں اور ہر طرح کی تحریف و تاویل کے بعد اُس کے آخر میں لکھ دیتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ کے لیئے آئندہ زندگی کا پروگرام دیا گیا ہے تاکہ اپنے موضوعہ کارنامہ کو تقدس کا جامہ پہنایا جا سکے۔ پھر جس نسبت سے آپ نے کسی نبی کے حالات زندگی میں تبدیلی کی ہوتی ہے۔ اسی نسبت سے رسول اللہ کے لیئے اس پروگرام کو مؤکد بنانے کی کوشش فرماتے ہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ چُونکہ سب انبیاء کا مشن ایک ہوتا ہے۔ لہٰذا مماثلت کے لیئے کوئی سے دو نبیوں میں کوئی نہ کوئی پہلو مل ہی جاتا ہے۔ اب اس کی چند ایک مثالیں ملاحظہ فرما لیجئے۔

۱۔ حضرت یُونس کی داستان زندگی: اثری صاحب کی ترتیب موضوعہ کے مطابق حضرت یُونسؑ کی داستان یہ ہے کہ آپ نے کچھ مدت اپنی قوم کو تبلیغ کی۔ وہ ایمان نہ لائے تو آپ نے بحکم الٰہی ہجرت کی اور ایک کشتی پر سوار ہُوئے کشتی کے سفر کے دَوران آپ کشتی والوں کو وعظ تبلیغ بھی کرتے رہے۔ کس بندرگاہ پر سے سوار ہوئے اور کس بندرگاہ پر اُترے، یہ کوئی پتہ نہیں۔ البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ دورانِ سفر کشتی میں ایسی جگہ بیٹھے تھے۔ جہاں مچھلیاں آ کر آپ کے پاؤں کو بوسہ دیا کرتی تھیں گو آبی جانور اور بھی بہت ہوتے ہیں مگر بوسہ صرف مچھلیاں ہی دیتی تھیں۔ شاید آپ پاؤں پانی میں لٹکائے رکھتے تھے جس کی وجہ سے مچھلیوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ پھر آپ کشتی سے اُترے تو حیران تھے کہ اب جاؤں کدھر تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ بتلایا کہ اس قوم کے پاس جاؤ جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ چنانچہ یونسؑ وہاں آ کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں بہت سی ترکاریاں، پھل پھول اور درخت اُگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہاں آ کر حضرت یونسؑ نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔

اب اس داستان میں جو رسول اللہ کے لیئے پیغام اور پروگرام ہے وُہ بھی سُنیئے اور سر دُھنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا" یونس کی طرح آپ غمزدہ نہ ہوں۔ اس بیچارے نے دعوتِ اسلام اور اس کی منادی پر اپنی قوم سے جو تکلیف پائی اسے اندر ہی اندر پی گئے۔ دھواں تک نہیں نکالا۔ آخر ہجرت تک نوبت پہنچی جس کی تجھے بھی اسی طرح ضرورت پڑے گی کہ سُورۂ قلم مکّی ہے۔ بلکہ موصوف کی بابت یہ سارا بیان ہی مکّی سورتوں میں ہُوا ہے جو رسول اللہ کی آئندہ زندگی کے لئے گویا ایک الٰہی پروگرام ہے"۔ (ب ص ۲۵۰۳)

اب سوال یہ ہے کہ "اس بیچارے" (حضرت یونسؑ) کو تبلیغ اسلام پر قوم کی طرف سے وُہ کونسی علیحدہ تکلیف پہنچی تھی جو کسی دُوسرے نبی کو نہ پہنچی ہو۔ کفّار کی ایذارسانی ہیں اور اس کو برداشت کرنے میں تو سب انبیاء برابر ہیں۔ سوائے یونس علیہ السلام کے جنہوں نے اس ایذارسانی پر صبر نہ کیا کہ ہجرت کیلئے حکم الٰہی کا انتظار کیئے بغیر نکل کھڑے ہوئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہؐ کو فرمایا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (۶۸/۵۰) اپنے رب کے حکم (ہجرت) تک کفار کی ایذارسانی پر صبر کیجیے اور یُونسؑ کی طرح مت ہو جائیے۔

گویا جس نبی کے عمل کے اتباع سے رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ روک رہے ہیں۔ اثری صاحب اسی نبی کے عمل میں رسُول اللہ کی زندگی کا آئندہ الٰہی پروگرام بتا رہے ہیں۔

پھر حضرت یُونس کو دُوسرے انبیاء سے کچھ علیحدہ تکلیف پہنچی بھی تھی تو وُہ یہ تھی کہ آپ کو قرعہ اندازی کی ناکامی کے بعد دریا میں پھینک دیا گیا۔ پھر آپ کو مچھلی نے نگل لیا۔ پھر کچھ مدّت بعد ساحل پر اُگل دیا۔ مگر یہ

تکلیف تو اثری صاحب تسلیم ہی نہیں فرماتے ۔ پھر" اس بیچارے" پر اثری صاحب کو اتنا رحم کس بات پہ آرہا ہے ۔

تیسری بات آپ نے یہ بیان فرمائی کہ حضرت یُونس کا بیان چونکہ مکّی سُورتوں میں ہے ۔ لہٰذا رسول اللہ کی زندگی کا اس میں پروگرام ہے ۔ اب دیکھئے کہ اگر سارے ہی انبیاء کا بیان مکّی سورتوں میں ہی مذکور ہو تو پھر حضرت یُونسؑ کی کیا تخصیص رہ گئی ؟ کہ ان کی زندگی میں ہی رسول اللہ کے لئے آئندہ پروگرام ہو ۔

البتہ ایک بات اثری صاحب نے بڑے پتے کی بتائی اور وُہ یہ کہ " جس قوم کی طرف حضرت یونسؑ نے ہجرت کے بعد قیام فرمایا وہ ایک لاکھ تقریباً بیس ہزار تھی ۔ ایسے ہی رسول اللہ کے خادموں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ چکی جو کہ تقریباً الٰہی نبیوں کی تعداد ہے ۔" (ب ص ۲۵۴)

اب اس عددی مناسبت میں کھینچ تان پیدا کر کے اثری صاحب نے جو یکسانی پیدا کرنے کی تکلیف فرمائی اس کی ہم داد دیتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ عددی مناسبت کسی پروگرام کے اتباع کی کوئی معقول وجہ بن سکتی ہے ؟ یہ تو سب اتفاقات ہیں ۔ اور زندگی کے پروگرام اتفاقات کی بنیادوں پر استوار نہیں ہوتے ۔

(۲) **حضرت ایوبؑ کی داستانِ زندگی:** اثری ترتیب کے مطابق حضرت ایوب کی داستانِ حیات یہ ہے کہ " آپ کفار کی ایذا رسانی سے ایک طویل مدّت تک پریشان رہے اور ان کے دُکھ سہتے رہے ۔ اس طویل مدّت کا اندازہ یہ ہے کہ مختلف روائتوں پر جرح و نقد کرنے کے بعد ۱۳ سال والی روایت کو پسند فرمایا ہے ۔ ۱۳ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کی کہ ہجرت کر کے فلاں مقام پر چلے جاؤ کہ وہاں کا موسم بہت اچھا ۔ آب وہوا خوشگوار، پانی میٹھا اور ٹھنڈا ہے ۔ ایوب علیہ السّلام کی بیوی کہیں باہر گئی ہوئی تھی آپ نے اس کی بھی انتظار نہ کی اور گھوڑے کو ایڑ لگائی تو سیدھے اس مقام پر جا پہنچے کیونکہ وہ قریب ہی تھا ۔ اس مقام کی خوشگوار آب وہوا اور فضا میں آپ کی تبلیغ کا کام خوب پھیلا اور چمکا ۔ اور وُہ دکھ بھی دُور ہُوا جو ہجرت سے پہلے آپ کو کفار سے پہنچتا رہتا تھا ۔

اب آپ نے اپنی بیوی کو بھی وہاں بلا لیا ۔ جس نے از راہِ تفنّن و ظرافت حضرت ایوبؑ سے پُوچھا کہ میرا خاوند لیا ویسا بیمار تھا تم نے تو نہیں دیکھا اور اس بیوی نے سلام بھی نہ کیا البتہ یہ دل لگی کی بات پوچھنا شروع کر دی ۔ حضرت ایوبؑ نے کہا کہ وہ میں ہی تو ہوں ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جس خوشگوار مقام پر آپ کو بہت سا رزق دیا ۔ کہ آپ کے گندم اور جَو کے کھلیان بھر گئے ۔" (ملخص ب ص ۳۴۹)

اس داستان میں اب جو رسُول اللہ کے لئے پروگرام ہے وہ بھی سنیئے :۔

" یہ سارا بیان رسُول اللہ کے لئے ایک پروگرام ہے اور نقشہ ہے جو کہ بطور اشارہ قصّہ کی صُورت میں بیان کیا گیا ہے ۔ کہ ۱۳ سال آپکی مشکلات کا زمانہ ہے ۔ پھر ہجرت کے بعد مدینہ پہنچ کر آپ کو ہر طرح سے خوشحال کر دیا جائیگا اور اہل وعیال و دیگر خدام بھی وہاں پہنچ جائیں گے ۔" (ب ص ۲۴۹)

اب غالباً آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اثری صاحب نے حضرت ایوبؑ کے دورِ ابتلا سے متعلق ۱۸ سال والی پانچ روائتوں کو چھوڑ کر ۱۳ سال والی روایت کو کیوں پسند فرمایا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر ۱۸ سال والی روایات کو قبول فرماتے تو رسول اللہؐ کے آئندہ پروگرام کی ذیل میں جو عددی توافق ہے وہ خراب ہو جاتی تھی۔ لہٰذا ۱۳ سال والی روایت آپکے مناسب حال معلوم ہوئی اور نقلی لحاظ سے اثری صاحب کا بنایا ہوا یہ پروگرام اسلیئے غلط ہے کہ رسول اللہ مدینہ جانے کے بعد بھی ۵ھ تک یعنی جنگ احزاب تک کفار و یہود کی ایذا رسانی سے سخت پریشان رہے۔ آپؐ پر وہ وقت بھی آیا جب آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کوئی ہے جو پہرہ دے تاکہ میں رات آرام سے سو سکوں"۔ گویا حضرت ایوب کا دورِ ابتلاء تو چشمہ میں نہانے پر ختم ہو گیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب انبیاء سے زیادہ کفار کی مخالفت و مصائب کا دور آیا جو ہجرت سے پانچ چھ سال بعد ختم ہوا جبکہ حضرت ایوبؑ کی ہجرت کے بعد فوراً آپ کی ابتلاء کا دور بھی ختم ہو گیا۔ اور تبلیغ کا کاروبار بھی خوب چمکا۔

اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ اثری صاحب نے اُرکُض برِجلک کا معنیٰ بدل کر حضرت ایوبؑ کو ہجرت کرائی ہے ورنہ حقیقتاً انہوں نے ہجرت کی ہی کب تھی۔ لیکن اثری صاحب اس ایوبی ہجرت کو اصل قرار دے کر رسول اللہؐ کی ہجرت کے بعد حالات اس پر فٹ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں اور اسے رسول اللہؐ کے لئے ایک پروگرام اور نقشہ بتا رہے ہیں۔ ہجرت کے بعد بھی حضرت ایوبؑ اور رسول اللہؐ کے پروگرام میں چنداں توافق نظر نہیں آتا۔ ہجرت کے بعد حضرت ایوبؑ کو جو مقام ملا وہ بڑا خوشگوار تھا۔ آب و ہوا اچھی پینے کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی۔ پھر موسم کے مطابق سرد گرم پانی بھی موجود تھا۔ لہٰذا حضرت ایوب کی ابتلاء کا دور بھی ختم ہو گیا اور تبلیغ بھی خوب ہوئی۔ مگر رسول اللہ کو ہجرت کے بعد مدینہ جانا پڑا۔ جہاں کا پانی کڑوا تھا۔ آب و ہوا مکہ کے مہاجرین کو راس نہ آئی تھی۔ وہ وہاں جا کر بیمار ہو گئے۔ پھر ہجرت کے بعد ابتلاء کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ یہود اور مشرکین مسلمانوں کی جان کے لاگو بن گئے لہٰذا حضرت ایوبؑ کے مطابق اثری صاحب کا یہ سارا بیان رسول اللہ کے لیے گویا ایک پروگرام اور نقشہ کیسے ہو گیا؟

(۳) اصحابِ کہف کی داستانِ زندگی: اثری ترتیب کے مطابق اصحاب کہف کی داستان کا ملخص یہ ہے کہ چند موحد نوجوان ایک شہر میں رہتے اور وہاں تبلیغ و تدریس کا کام کرتے تھے۔ لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور کہا کہ کہیں شہر سے باہر جا کر یہ کام کرو۔ ہم شہر میں نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ ان نوجوانوں نے شہر سے نکل کر قریب ہی واقع ایک غار میں جا ڈیرہ لگایا۔ غار کیا تھا وہ ایک آرام دہ بلڈنگ ثابت ہوئی۔ اس کا دہانہ تو تنگ تھا مگر اندر سے خاصی کھلی اور صراحی کی طرح دوسرا راستہ جنوب کو کھلتا تھا۔ پھر اس میں ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کے لیے کئی منافذ بھی تھے یہ نوجوان تھکے ہوئے تھے۔ سو گئے تو پھر دوسرے دن جاگے اور بھوک محسوس کرنے لگے۔ اپنے میں سے ایک آدمی کو کچھ رقم دے کر اسی شہر کھانا لانے کے لیے بھیجا اور تاکید کی کہ بات نرمی سے کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ اہل شہر پھر انتقام پر اتر آئیں۔ چنانچہ اس شخص نے نرمی ہی اختیار کی۔ اس طرح یہ نوجوان اپنی روزمرہ کی ضروریات کی خرید و فروخت اسی شہر

سے کرتے رہے اور اس غار میں مدرسہ قائم کرلیا۔ یہاں غار میں آکر ان کی تبلیغ کا کاروبار خوب چمک اٹھا۔ اور لوگ ان کی تبلیغ وتدریس سے متاثر ہو کر جوق در جوق غار تک آنے لگے۔ پھر عقیدۃً اس غار کے دہانے کے قریب ایک مسجد بھی بنا دی یہ واضح رہے کہ جب وہ تبلیغ وتدریس کرتے تھے تو اس میں قیامت کے متعلق اسلامی عقیدہ اور اس کے متعلق اللہ کے وعدہ کی بات ضرور بتلاتے تھے۔ (ب صفحہ ۴۳۹، ۴۴۱) قرآن میں آتا ہے کہ اصحاب کہف کا ایک کتا بھی تھا۔ لیکن اثری صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ کتا ان کا نہیں تھا۔ بلکہ کتا تو دنیا دار قسم کے لوگوں، کوٹھیوں اور بنگلوں والوں کا ہوتا ہے جو اسے باہر بٹھا رکھتے ہیں اور پھر باتیں ایسی کرتے ہیں کہ اصحاب کہف تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ کوئی کہتا ہے نہیں بلکہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا آخر کتا رکھنے والوں کو ہی ایسی باتوں سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ دوسرے لوگوں کا ایسی باتوں سے کیا کام "(ب ص ۴۴۲)

اب اس داستان سے رسول اللہؐ کے لیے پیغام بھی سنیئے۔ اثری صاحب فرماتے ہیں۔

"اصل بات یہ ہے کہ یہ سرگزشت گویا تیرے رسول اللہ کے لیے آئندہ زندگی کا ایک پروگرام ہے کہ تم بھی مدرسہ بنا کر طالبان حق وصداقت کو صبح وشام کتاب اللہ کا درس دیا کرو۔ اور انہیں پڑھایا سکھایا کرو اور توحید کی تائید اور شرک کی تردید کیا کرو۔۔۔۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ لوگ تیری تبلیغ واشاعت میں بھی سدِّ راہ ہوں گے جس کی وجہ سے تجھے مجبور ہو کر یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔ لیکن واضح رہے کہ کسی سے اس بات کا ذکر تک نہ ہو کہ میں کل پرسوں یا ترسوں کہیں چلا جاؤں گا" (ص ۴۴۳)

اب دیکھیئے کہ اثری صاحب اصحاب کہف کے اس صبح وشام کے کتاب اللہ کے درس اور سکھانے پڑھانے کے کام کو خود بھی ثابت نہیں کر سکتے محض ان کی زبان یا تحریر تو کوئی حجت نہیں۔ پھر جس چیز کا وجود وہ ثابت نہیں کر سکتے اسے دوسروں اور خصوصًا رسول اللہ کے زندگی کا پروگرام بنا کر کیسے پیش کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ کی زندگی کا اصل پروگرام ہجرت اور جہاد ہے۔ درس وتدریس کا کام تو مسجد کے خطیب حضرات بھی کرتے رہتے ہیں۔ انبیاء کا کام وعظ وتبلیغ سے شروع ہوتا ہے۔ پھر درس وتدریس بھی شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن انبیاء کے پروگرام کی سطح اس سے بہت بلند ہوتی ہے۔ وہ محض واعظ اور خطیب نہیں ہوتے بلکہ مہاجر اور مجاہد بھی ہوتے ہیں۔ خلافت الٰہیہ کا قیام بھی ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے اور اصحاب کہف نے ہجرت تک نہ کی بلکہ ایک کھوہ کے ذریعہ پاس ہی ایک غار میں جا ڈیرا لگایا۔ تو کیا ان کی ایسی زندگی میں رسول اللہ کے لیے کوئی پروگرام ہو سکتا ہے؟

کتابیات

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱	قرآن کریم	کلام اللہ تعالےٰ	
۲	صحیح بخاری	محمد بن اسمٰعیل	نور محمد - کراچی
۳	صحیح مسلم مع نووی	مسلم بن الحجاج	مکتبہ سعودیہ - کراچی
۴	مشکوٰۃ (مترجم غزنویہ)	خطیب تبغدادی	مکتبہ اثریہ فیصل آباد
۵	تفسیر ابن عباس	ابن عباس رض	دار المعرفۃ - بیروت
۶	" در منثور	جلال الدین سیوطی	" "
۷	" ابن کثیر	حافظ ابن کثیر	نور محمد کراچی
۸	" الجمال والکمال (سورہ یوسف)	قاضی سلیمان منصور پوری	مکتبۃ الدعوۃ الاسلامیہ فیصل آباد
۹	" تفہیم القرآن	ابو الاعلیٰ مودودی	ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور
۱۰	تفسیر القرآن	سر سید احمد خاں	
۱۱	بائیبل مقدس	(اردو ترجمہ)	بائیبل سوسائٹی لاہور
۱۲	مفردات القرآن	امام راغب اصفہانی	شیخ محمد اشرف - لاہور
۱۳	محیط المحیط	(عربی - عربی)	بیروت - لبنان
۱۴	فقہ اللغۃ	(عربی - عربی)	مطبعۃ الاستقامۃ - قاہرہ
۱۵	منتہی الارب	(عربی - فارسی)	شیخ الٰہی بخش کشمیری بازار لاہور
۱۶	منجد	(عربی - اردو)	دار الاشاعت - کراچی
۱۷	مراۃ القرآن	حافظ عبد الحی (عربی اردو)	مکتبۃ السلام - لاہور
۱۸	اردو ترجمہ قرآن کریم	فتح محمد جالندھری	تاج کمپنی - کراچی
۱۹	قصص القرآن	حفظ الرحمٰن سیوہاروی	ندوۃ المصنفین - دہلی
۲۰	عالمی معلومات	زاہد حسین انجم	فیروز سنز کراچی
۲۱	حدیث دل گداز پمفلٹ	محمد علی طلوع بی اے	کرشن نگر - لاہور
۲۲	پاکستان کا معمار اول سر سید		ادارہ طلوع اسلام کراچی
۲۳	تذہیب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال	محمود عبد الوہاب	مطبعۃ الفجالۃ الجدیدۃ
۲۴	عیون زمزم	حافظ عنایت اللہ اثری گجراتی	المکتبۃ الاثریہ گجرات، جناح سٹریٹ گجرات
۲۵	القول المختار، البیان المختار		

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی دیگر تصانیف

آئینہ پرویزیت

نبی اکرم ﷺ پیکر صبر و ثبات (زیر طبع)

مترادفات القرآن

روح عذاب قبر اور سماع موتیٰ

خلافت و جمہوریت

اسلام میں فاضلہ دولت کا مقام

الشمس والقمر بحسبان

احکام ستر و حجاب

شریعت و طریقت

نبی اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار

تجارت اور لین دین کے مسائل

تفسیر تیسیر القرآن ۳ جلد (بڑا سائز) (زیر طبع)